صوفیائے سندھ

اور

اُردو

تصنیف

پروفیسر محمد معین الدین دردائی

(بی۔ اے (آنرز) ایم۔ اے اُردو (علیگ) ایم۔ اے فارسی (پٹنہ)

سابق صدر شعبۂ اُردو۔ ایڈورڈ کالج پبنا (مشرقی پاکستان)

مُقدمہ

از جناب پیر سیّد حسام الدین راشدی

(نشانِ سپاس، ستارۂ امتیاز)

صوفیائے سندھ
اور
اُردو

تصنیف

پروفیسر محمد مُعین الدین دردائی

بی۔ اے (آنرز) ایم۔ اے اُردو (علیگ) ایم۔ اے فارسی (پٹنہ)

سابق صدر شعبۂ اُردو۔ ایڈورڈ کالج پبنا (مشرقی پاکستان)

مُقدّمہ

از جناب پیر سید حسام الدّین راشدی

(نشانِ سپاس، ستارۂ امتیاز)

ناشر

سیّد الطاف علی بریلوی

بی اے (علیگ)

ڈائریکٹر

اِکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

نزد سرسیّد گورنمنٹ گرلز کالج

بی۔ روڈ۔ ناظم آباد۔ کراچی نمبر ۱۸

طبع اول

تعداد ایک ہزار قیمت چودہ روپے

۱۹۷۳ء

انتساب

اُن مُحبِّ وطن پاکستانیوں کے نام، جو ملک کی آزادی اور سالمیت کے پیشِ نظر علاقائی زبانوں کے ساتھ ہی ساتھ اردو کو قومی اور سرکاری زبان بنانے کے لئے کوشاں ہیں نیز

ایک مِلت، ایک زبان

کے نظریے پر یقین رکھتے ہیں:

محمد مُعین الدّین دردائی

فہرست

حصہ دوم

صوفی نثر نگار

مُقدّمہ

از جناب پیر سیّد حسام الدین راشدی

اُردو کی، پہلے پہل کہاں داغ بیل پڑی؟ — اِس سلسلے میں گزشتہ نِصف صدی سے اُردو کے محققین نے بہت کچھ تلاش اور تحقیق سے کام لیکر مختلف نتائج پیش کئے ہیں۔ اُن بزرگوں میں سے، مرحوم حافظ محمود خان شیرانی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولوی عبدالحق مرحوم کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

خیال یہ ہے کہ چونکہ مُسلمانوں کی سب سے پہلے وادی سندھ میں آمد ہوئی اور یہیں ان کو مقامی زبانوں سے واسطہ پڑا اس لئے ایک ملی جُلی زبان کا ہیولا یہیں تشکیل پایا ہوگا۔ بہرحال پنجابی سے اردو کو اشتراک ہے یا ملتان میں اس کی ابتدا

ہوئی یا سندھ میں (بشمولیتِ ملتان) اس کا خمیر تیار ہوا یہ مسئلہ
پھر بھی قطعی طور پر طے نہیں ہو سکا اور یہ معاملہ جوں کا توں
ابھی تک جواب طلب ہے۔

اِس تحقیقات میں تشنگی کا سب سے بڑا سبب اور وجہ
یہ ہے کہ وادیٔ سندھ کا قدیم تاریخی ریکارڈ یا نوشتے مختلف خارجی
حملوں کی وجہ سے بوجہ امتدادِ زمانہ قطعی ضائع ہو چکے ہیں۔ اسلئے
جو کچھ تحقیقات ہوئی ہیں اس کا انحصار فقط قرائن اور اندازوں
پر رکھا گیا ہے اور قیاسی نتائج پر قناعت کی گئی ہے، ظاہر
ہے کہ اس دور میں اس کو سائنٹیفک اپروچ نہیں کہا
جا سکتا۔ اس لئے ابھی یہ عنوان مزید تلاش اور تجسس کا محتاج ہے

اس وقت تک، وادی سندھ کی تاریخ سے جو
فقرے بطور دلیل کے پیش کئے جاتے رہے ہیں اور جن کے متعلق
ابتدا میں میرا اپنا بھی خیال تھا کہ ان کی اردو سے مماثلت
ہے اور یہ کہ اردو کی ساخت کی پہلی صورت ہو سکتی ہے، وہ
زیادہ غور و فکر، تحقیق (۱) ٹھٹھ کا فقرہ (فیروز شاہی)

شاہ عالم کے فقرے (مرآت احمدی) اور تقابل کے بعد
معلوم ہوا کہ درحقیقت یہ فقرے یا کلمات سندھی اور سرائیکی
(ملتانی) زبان کے ہیں۔ فارسی مصنفین نے جب فارسی جامہ
پہنایا تو اصلی صورت بدل گئی اور پھر مختلف کاتبوں نے اپنے
اپنے مزاج اور فہم کے مطابق جب نوک پلک بنائے تو
ان کی صورت کہاں سے کہاں پہنچ گئی، یہی سبب ہوا
کہ تحقیق کے دوران ان فقروں پر اردو کا گمان ہونے
لگا، یہ بزرگوار دراصل مقامی زبانوں سے بھی آشنا نہیں
تھے۔ اس لئے بھی یہ مشکل پیش آئی۔

یہ بات بالکل برحق ہے کہ اس برصغیر میں مسلمانوں
کا قافلہ سب سے پہلے سندھ اور ملتان میں پہنچا اور
یہیں سب سے پہلے مقامی زبانیں اور ان کی مادری
زبانیں متصادم ہوئیں۔ اس ٹکراؤ سے کوئی نئی زبان
مکمل طور پر تشکیل پائی یا نہیں یہ تو کہنا مشکل
ہے۔ لیکن اتنا ہوا کہ سندھی اور ملتانی الفاظ

نے ہندوستان کی طرف ضرور سفر کیا، اور یہی وجہ ہوئی کہ ملتانی، سندھی، گجراتی اور دکھنی زبانوں میں بھی مشترک الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملتانی اور سندھی کے الفاظ یہاں سے گجرات اور وہاں سے دکھن پہونچے اور اب اپنی اصلی صورت میں یا بگڑی ہوئی حالت میں برابر موجود ہیں۔

میرا خیال ہے کہ دکھن میں اردو نے بحیثیت زبان کے ابتدائی صورت پائی اور دکھنی کے شعراء نے ملا جلا کر اس میں شعر کہنا شروع کئے۔ چنانچہ دکھنی زبان کے قدیم شعراء کے کلام میں ایسے اشعار ملتے ہیں جو اردو سے مماثلت رکھتے ہیں اور اسی عمل کا نتیجہ ولی دکھنی کا ظہور تھا۔ جس نے صاف ستھری اردو میں دیوان مکمل کرکے اردو کو مکمل زبان کی حیثیت سے سے عالم وجود میں لایا۔

عالمگیر نے زندگی کی آخری چوتھائی دکن کی

مسلمان ریاستوں کو تہ و بالا کرنے میں گزار دی۔ مغل لشکر وسطِ ہندوستان اور خاص طرح دہلی سے لایا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس لشکری بود و باش اور آمد و رفت کا اثر زبان پر بھی پڑا اور جب ولی کا دیوان دلی میں پہنچا تو وہاں کے فارسی گو شعراء نے، جو فارسی میں کہتے کہتے تھک چکے تھے اور اس میں ان کا قافیہ بھی تنگ ہو گیا تھا۔ اس نئی زبان کی طرف توجہ کی اور شاہ حاتم اور آبرو جیسے شعراء نے ولی دکھنی کی زبان کو "ذائقہ بدل" کے طور پر اپنے شعر میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔

ویسے بھی عالمگیر کے آخری ایام میں اور خاص طور پر ان کی وفات کے بعد جب مغل سلطنت ڈانوا ڈول ہونے لگی تو ایرانی اور تورانی امراء اور علماء کی آمد و رفت یکسر بند ہو گئی اور اس "پشت پناہی" کے نکل جانے کے بعد پہلے کے آئے ہوئے امراء اپنی "بالاتری" سے نیچے اتر آئے اور مقامی بود و باش

اور ہندی روش اختیار کر کے انھوں نے اپنے آپ کو
مقامی باشندوں میں جذب کر لیا۔ اس وقت فارسی
زبان کا سکہ جو کم و بیش آٹھ سو برس سے رائج تھا۔
معاشرے اور علم و ادب کے بازار سے غائب ہونا
شروع ہوا اور رفتہ رفتہ اس کا نام و نشان بھی
مٹ گیا۔

محمد شاہ بادشاہ (۱۱۳۱ھ) سے لے کر بہادر شاہ
(۱۲۷۴ھ) تک نہ فقط عام طور پر اردو میں دلچسپی لی جانے لگی
بلکہ قلعہ معلیٰ کی سرپرستی سے ادبی زبان کی حیثیت سے
بھی اُردو نہایت مستحکم اور تن آور ہوگئی۔ یہی سبب ہوا کہ
جب فارسی یکسر خارج ہو کر اپنی اصل کی طرف لوٹ گئی تو
کوئی خلاء محسوس نہ ہوا، نہ کوئی مشکل درپیش آئی۔ اُردو
نے معاشرے اور نوشتوں میں اس کی جگہ بڑی آسانی
کے ساتھ لے لی۔

*

سندھ کے حدود میں اُردو زبان اس وقت
متعارف ہوئی جب عالمگیر کی وفات کے بعد شاہی
دربار میں اردو کا چرچا بہت بڑھا اور وہاں سے مغل
صوبیدار اور دیگر حکام اپنے ساتھ، جو پڑھے لکھے اہل کار
لائے، اُن میں کئی ایک اردو میں شعر کہنے والے بھی تھے
جب یہاں مقامی ادیبوں سے ان کا میل جول ہوا تو
سندھی اور فارسی شعراء نے تنوع پسندی کے طور پر
ان کے تتبع میں اُردو میں طبع آزمائی کرنا شروع
کی۔ چنانچہ اس دور کے چند ایک اُردو گو شعراء
کا کلام ہمیں ملتا ہے جو شاہ حاتم اور آبرو وغیرہ
کی روش اور تتبع کا ہے۔ سندھ میں اردو، زبان یا اُردو
شاعری کا نقطۂ آغاز یہیں سے ہوا۔

"سندھ میں اُردو" کے موضوع پر یہاں سب سے پہلے
میرے دوست جناب افسر امروہوی نے کچھ مواد فراہم
کر کے ایک مضمون شائع کیا، اس کے بعد میں نے اِس

مواد کو نئے اضافوں کے ساتھ کامل تر کر کے ایک
مقالہ خیرپور اُردو کانفرنس میں پڑھا۔ یہ دونوں
مقالے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد بھی جو نیا
مواد دستیاب ہوتا گیا اس کو حفظِ تاریخ کے نقطۂ نظر
سے میں اپنی مختلف کتابوں میں شامل کرتا گیا، چنانچہ اس
سلسلے میں تذکرۂ امیر خانی، اور تکملۂ مقالات الشعراء
یا چند اور مقالے دیکھے جا سکتے ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد گزشتہ چند سالوں کے
اندر مختلف حضرات نے، اس موضوع پر متعدد مقالے
اور کتابیں شائع کی ہیں لیکن بنیادی مواد وہی ہے
جو مذکورۂ بالا مقالوں یا کتابوں میں آچکا ہے۔
مندرجۂ ذیل کتابیں پچھلے چند سالوں میں لکھی گئی ہیں

اُردو سندھی کے لسانی روابط۔ شرف الدین اصلاحی

سندھ میں اُردو شاعری ۔۔۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

۳۔ سندھ کے جدید اُردو شعراء (مشتاق علی جعفری)

۴۔ پاکستان میں اُردو (مقالے سندھی اور اردو)
ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی

ان چار کتابوں میں ڈاکٹر بلوچ کی کتاب زیادہ وقیع
اور ٹھوس ہے۔ کیونکہ اس میں بہت سا اضافہ اور نیا
مواد ہے۔

جناب پروفیسر محمد معین الدین دردائی صاحب کی
یہ کتاب، جس پر ان سطور کے لکھنے کا شرف مجھے بخشا
گیا ہے، اِس سلسلے کی تازہ ترین کڑی ہے۔ دردائی صاحب
اہلِ زبان ہیں اور اپنی مادری زبان کے والہ وشیدا بھی،
اور ساتھ ہی خود صاحبِ علم اور صاحبِ قلم بھی ہیں
وہ یہ ضرور جاننا چاہیں گے کہ سندھ میں اُردو کا کیا
حال رہا؟ اور کس کس نے اس میں لکھنے اور کہنے کی کوشش
کی۔! یہ ایک فطری امر اور علمی تقاضا ہے۔ چنانچہ

یہ کتاب اسی خواہش اور جستجو کا نتیجہ ہے۔

دردائی صاحب کا موضوع اگرچہ پرانا ہے لیکن اس کتاب میں ایک تنوع اور ایک نیاپن ضرور موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنی مقصد براری کے لئے اپنے طبعی میلان کی بنا پر، انھوں نے سندھی صوفیا کی بزم میں جھانکا ہے۔ اور جو کچھ کشف ہوا یا ہاتھ آیا اسکو نہایت محبت اور بڑی خوش اسلوبی اور سلیقے سے قلمبند کر دیا ہے۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ بعض لوگوں کو انھوں نے اپنی علمی فضیلت اور ادبی رواداری کی بنا پر اس صوفیانہ مجلس میں چور دروازے سے داخل کر دیا ہے۔ چنانچہ اس حقیر پر تقصیر اور بھائی علی محمد راشدی کی اس مجلس حال و قال میں موجودگی کیا معنی رکھتی ہے؟ آیا یہ بات ہم پیشگی کی بنا پر اقربا پروری کے تحت نہیں آتی۔

دردائی صاحب نے بلاشک وشبہ کتاب بڑی محبت سے لکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ محبت کا پیغام اور

محبت کی زبان سیاسی اور اخباری زبان سے بالکل جدا ہوتی ہے اس لئے موثر بھی ہوتی ہے۔

یہ کتاب یقیناً ہمارے تاریخی آثار کے ذخیرے میں ایک قیمتی سرمایہ اور اضافہ ہے۔

یہ کتاب میرے بزرگ دوست اور ایجوکیشنل کانفرنس کے حقیقی روح رواں اور ایک طرح سے اس کے بانی، **سید الطاف علی بریلوی** اپنے ادارے کی طرف سے شائع کر رہے ہیں۔ سید صاحب نے اس ادارے کے ذریعے بہت سی کارآمد اور مفید علمی کتابیں شائع کی ہیں۔ میں خوش ہوں کہ انھوں نے سندھ کی تاریخ کو بھی بالآخر اپنی مطبوعات میں جگہ دے ہی دی، اور یہ اس سلسلے کی پہلی اور بہت ہی بھلی کڑی ہے۔

عہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے قبل ازیں ایک اور کتاب "مسلمانان کراچی و سندھ کی تعلیم" نامی بھی شائع کی ہے۔ نیز اس کے سہ ماہی رسالہ "العلم" میں بکثرت مقالات چھپ چکے ہیں۔ (بریلوی)

میں دعا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ سید صاحب سندھ کے سلسلے میں آئندہ بھی کتابیں شائع کرتے رہیں گے جس کی شدید ضرورت ہے، کیونکہ سید صاحب کی "دنیا" جس دنیا میں رہ رہی ہے، اس کی تاریخ اور اس کے طبیعی حالات اور تہذیبی ورثے سے ناآشنا اور بے خبر ہے — یہ اجنبیت اور کھنچے کھنچے سے دور دور رہنا یا دامن جھٹک جھٹک کے ایام زندگی بسر کرنا! آخر کہاں تک؟

حسام الدین راشدی
جمشید روڈ۔ کراچی
۱۴ر جون ۱۹۷۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

۱۹۴۷ء تک بلکہ کچھ عرصہ بعد تک دکن میں اُردو، پنجاب میں اُردو، گجرات میں اُردو، کے مصنفین کی طرح میرا بھی یہی خیال تھا کہ اُردو نے کسی مخصوص خطّے میں جنم لیا ہے۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری بہاری، اور دوسرے صوفیائے بہار کے اُردو ملفوظات اشعار، دوہے اور فالنامے دل کو دیکھکر، جو آٹھویں صدی ہجری سے ملنے لگتے ہیں میں نے بہار اور اردو شاعری لکھکر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اُردو کی جائے پیدائش ہونے کا فخر صوبۂ بہار کو حاصل ہے۔ لیکن اس کے بعد برسوں کے مطالعے اور لسانی تحقیق و تجسس کے نتیجے میں مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اُردو زبان نہ برج میں پیدا ہوئی، نہ دکن، پنجاب، گجرات اور بہار میں بلکہ اس کی پیدائش صوفیا کے وسیع قلب اور مقدس زبان سے ہوئی ہے، اور اس کے خالق صوفیا اور صرف صوفیا ہیں، جنھوں نے خدا کی بھٹکی ہوئی مخلوق تک پیغام ربانی پہنچانے کے لئے ہمیشہ علاقائی بولیوں کو واسطہ بنایا۔ اور برصغیر کے ہر علاقے کے عوام سے

کچھ ان کی اور کچھ اپنی زبان میں باتیں اور تبلیغ اسلام کرتے رہے۔ ان
بزرگان دین کی اسی کوشش نے اُردو کے سیال مادے کو سانچوں میں
ڈھالا۔ پھر وہ انھیں اپنے ملفوظات، دوہے اور اشعار سے سنوارتے اور
نکھارتے رہے۔ بعد میں شعرا اور اُدبا نے اُس کو اپنے خونِ جگر سے توانائی
اور تاب و تب بخشی۔ اور بادشاہوں نے اس کی پرورش و پرداخت میں
حوصلہ مندی اور فیاضی دکھائی۔

اپنے اس خیال کی تائید اور ثبوت میں ضروری تھا کہ میں صوفیائے کرام
کی ان کوششوں کو سامنے لاؤں، جو اُنھوں نے اُردو کی تخلیق کے سلسلے
میں ایک ساتھ برِ صغیر کے ہر علاقے میں کیں یا غیر ارادی طور پر ان سے
ہوتی رہیں۔ چنانچہ میں نے صوفیائے بہار اور اُردو، صوفیائے دکن اور اردو
اور صوفیائے پنجاب اور اُردو، کے عنوان سے کتابوں کے لکھنے کا ارادہ کیا
اور اس سلسلے کی پہلی کتاب "صوفیائے بہار اور اُردو" شکر ہے کہ [illegible]
آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کے [illegible]
پروگرام میں شامل ہو کر سال گذشتہ چھپ کر سامنے بھی آگئی ہے۔

دو سال ہوئے میرے ایک عزیز شاگرد اور دوست پروفیسر
منہاج الدین گورنمنٹ کالج ملتان کو سندھ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی
کے مقالے کے لئے "سندھ کے اُردو نثر نگار" کا موضوع دیا گیا۔ اور وہ
دو برس تک اس موضوع پر کام کرتے رہے اور برابر مجھ سے مشورے لیتے
رہے۔ ان کے مقالے کا عنوان اس لحاظ سے بڑا سنگلاخ تھا کہ اس

موضوع پر لکھنا تو دُور کی بات ہے کسی نے کچھ سوچا بھی نہ تھا۔ اور انھیں
اپنے اس مقالے کے لئے سفینے سے زیادہ لوگوں کے سینہ پر بھروسا
کرنا پڑا۔ چنانچہ اس کے لئے انھوں نے وہ سب کچھ کیا، جو ایک انسان
کر سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی اور دوسروں کی عافیت اور سکون تک
کو خطرے میں ڈال دیا۔ وادیِ مہران کے ایک ایک شہر اور کوچے کی
خاک چھانی۔ کراچی، حیدرآباد، سکھر، ٹھٹھہ، شکارپور، جیکب آباد، پیر جو گوٹھ
پیر جھنڈو، منصورہ، نواب شاہ، لاڑکانہ، خیرپور، گڑھی یٰسین، سلطان کوٹ،
کو گھر آنگن بنا دیا، وہاں کے ذی علم اشخاص سے مل کر معلومات حاصل کیں،
بے شمار خاندانی اور پبلک لائبریریوں کو کھنگال کر ان سے مفید مطلب
مواد جمع کرتے رہے۔ اس سب مواد کو جب وہ میرے پاس مشورے کے
لئے لائے، تو خوشی سے میری آنکھیں چمکنے لگیں، کیوں کہ ان میں ان کے
موضوع سے متعلق مواد کے علاوہ بہت سی ایسی چیزیں بھی تھیں، جن کی
مدد سے صوفیائے سندھ کی اُردو خدمات کو سامنے لایا جا سکتا تھا۔ اور
اس طرح میرے دائرۂ تصنیف میں صوفیائے بہار، دکن، پنجاب اور شمالی
ہند کے ساتھ سندھ کے صوفیا کی اُردو خدمات کا بھی اضافہ ہو گیا۔ اور مجھے
بڑی مسرت ہے کہ دو سال کی محنت اور کاوش کے بعد جناب پروفیسر منہاج
صاحب سلمہٗ کا مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے لئے سندھ یونیورسٹی نے قبول کر لیا ہے،
اور آہستہ آہستہ میری پیش نظر کتاب بھی آج پایۂ تکمیل کو پہنچ رہی ہے۔
وما توفیقی الا باللہ۔

اپنی اِس کتاب "صوفیائے سندھ اور اردو" کے لئے جہاں جہاں سے مواد اکٹھا کیا گیا ہے وہ "کتابیات" میں درج ہے۔ رسائل اور اخبارات کے نام میں نے دو چار ہی کے دئیے ہیں۔ اِس لیے کہ سب کا دینا ممکن نہ تھا۔ اس کتاب کو دیباچہ کے علاوہ میں نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے پہلا حصہ صوفی شعرا سے متعلق ہے، اور دوسرا حصہ صوفی نثر نگاروں پر لکھا گیا ہے۔ اِس حصے میں میں نے پروفیسر منہاج صاحب سلمہ کے مقالے سے کئی نثر نگاروں کو، جو صوفیا کے زمرے میں آتے تھے، بہت معمولی سی ترمیم و تبدیلی کے بعد لے لیا ہے۔ اس کے لئے میں عزیز موصوف کا شکر گذار ہوں۔

ان کے علاوہ میں اپنے ان دوستوں اور بزرگوں کا بھی سپاس گذار ہوں جن کے مفید مشوروں اور کتب خانوں کی نادر کتابوں سے میں اس کتاب کی ترتیب اور تکمیل کے دوران مستفید ہوتا رہا ہوں۔ سب سے زیادہ میں اپنے "بڑے بھائی" اور محترم دوست سید الطاف علی بریلوی علیگ کا مرہون منت ہوں کہ انھوں نے برابر میری ہمت افزائی کی، اور اُن ہی کے اصرار، ہمت افزائی اور ادب نوازی کے باعث "صوفیا اور اردو" کے سلسلے کی یہ دوسری کتاب بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ سکی ہے۔ ورنہ کہاں میرے جیسا نحیف و ناتوان اور مجبور انسان اور کہاں اس طرح کی سنگلاخ زمینوں پر خامہ فرسائی کا حوصلہ۔

اس کتاب کے سلسلے میں پروفیسر منہاج صاحب سے جو مدد مجھ کو

ملی ہے اور جتنی بیگار میں نے اُن سے لی ہے اس کا اعتراف کرتے ہوئے اتنی بات میں اور واضح کر دوں کہ اس کتاب میں جو بھی خوبیاں نظر آئیں اُن کے لیے منہاج صاحب قابلِ ستائش ہیں، کہ انھوں نے بہت دوا دوش کی ہے۔ اور سندھ کا ایک ایک چپہ چھان مارا ہے۔ اور اس کے اندر جتنی خامیاں، فروگذاشتیں اور کوتاہیاں نظر آئیں اُن کے لیے میں موردِ الزام ہوں۔ اور مجھے اپنی کمزوریوں اور کم علمی کا اچھی طرح احساس اور اعتراف ہے۔

صوفیا کے زمرے میں میں نے صاحبِ طریقت اور اہل دل بزرگوں کے علاوہ صوفی خانوادوں کے بعض ایسے افراد کو بھی شامل کر لیا ہے جن کا مشغلہ گرچہ اس وقت رشد و ہدایت اور پیری مریدی نہیں ہے لیکن ان کے خاندان کے افراد ہنوز اسی راستے پر گامزن ہیں

اس پیش لفظ کو ختم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ میں اپنے محترم دوست مولانا اعجاز الحق قدوسی صاحب کا دل سے شکریہ ادا کروں کہ انھوں نے اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود میری اس کتاب کے مسودے پر بڑی محنت سے نظر ثانی فرمائی اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔

کراچی
۵۔ مارچ ۱۹۷۳ء

محمد معین الدین دردائی

دیباچہ مؤلف

دنیا کی کوئی زبان خالص اور غیر مخلوط نہیں

غور سے دیکھا جائے تو دنیا کی ایک زبان بھی ایسی نہیں ملتی جو کسی ایک نسلِ انسانی کے بطن سے پیدا ہوئی ہو، یا ایک قوم کی گود میں پروان چڑھی ہو۔ قدیم ترین انسانی بولیاں بھی محض آوازوں اور اشاروں کے تعین کی ابتدائی صورتیں تھیں ان میں وسعت، اور ترکیبی کیفیت ہرگز ایسی نہیں ملتی جس کی بنا پر اُسے زبان کا نام دیا جاسکے۔ اِس لیے زبان کے خالص ہونے کا تصور ہی سراسر پُر فریب ہے۔ زبان کی انفرادیت اور خالص ہونے کا دعویٰ تو اُسی وقت ختم ہوجاتا ہے جب انسانی گروہ دوسرے انسانی گروہ سے خلط ملط ہوکر آپس میں شادی بیاہ کرنے لگتا ہے، یا ایک زبان اور تہذیب دوسری آنے والی قوم کی زبان اور تہذیب سے رشتۂ عقد میں منسلک ہوکر ایک نئے بچّے کو جنم دینے کے دَور میں داخل ہوجاتی ہے یہ سلسلۂ عمل نوعِ انسانی کے آغاز سے ہی جاری ہے اور رہتی دنیا تک جاری رہے گا۔ کیونکہ زبانیں اور تہذیبیں تو زندہ ہی اس وقت

یک رہتی ہیں جب تک اُن کے اندر دوسری زبان اور تہذیب کا خون مختلف قوموں کے اتصال سے پہنچتا رہتا ہے۔ یہ عمل جیسے ہی ختم ہوا زبان کو بھی ختم ہی سمجھئیے۔

یہ اتصال اور اختلاط باہمی کا عمل مختلف طرح پر جاری رہتا ہے اور پھر ایک عرصے کے بعد وہ نومولود زبان اس طرح اپنی شکل بدل لیتی ہے کہ قدیم و جدید کے درمیان مشابہت کا پتا چلانا صرف ماہرین السنہ اور علمائے اکتشافات و تحقیقات ہی کے بس میں ہوتا ہے۔

برصغیر کی قدیم قوم دراوڑ اور قدیم زبان دراوڑی ہے جس کا سراغ وادیٔ سندھ میں ملتا ہے

مؤرخین کے نزدیک برصغیر کی سب سے قدیم قوم دراوڑ اور قدیم زبان دراوڑی ہے۔ کیونکہ پروفیسر احتشام حسین کے قول[1] کے مطابق اگرچہ آریوں سے پہلے برصغیر میں نگریٹو اور آسٹرک قومیں بھی موجود تھیں لیکن ان قوموں کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ البتہ چار ہزار برس سے زیادہ قدیم دراوڑ قوم کی تہذیب اور زبان کا حال اب موہنجوڈارو اور ہڑپا کی کھدائی کے بعد پوری طرح منکشف ہو گیا ہے اور ہر شخص جان گیا ہے کہ وادیٔ سندھ میں بسنے والی یہ دراوڑ قوم ایک متمدن اور تہذیب یافتہ قوم تھی، جو اپنی دراوڑی زبان اور تہذیب

---

[1] دیکھئے پروفیسر احتشام کا مقالہ "ہند آریائی مسلمانوں کی آمد سے پہلے" مطبوعہ رسالہ اردوئے معلیٰ دہلی لسانیات نمبر شمارہ ۴-۵ صفحہ ۲۷

بہت ہی ترقی یافتہ شکل میں رکھتی تھی۔ مسٹر بیمز جنھوں نے زبانوں کی تقسیم کے سلسلے میں دراوڑی زبانوں کو جن میں جنوبی ہند کی "تامل، تلنگو، کنڑی اور ملیالم زبانیں بھی شامل ہیں" تورانین فیملی میں شامل کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"Historically there is little doubt that at an early period the whole of India, in common with all eastern and souther Asia was held by race speaking langue of the Turanian family." (1)

مسٹر بیمز کا یہ بیان شہادت دیتا ہے کہ آریوں کی آمد سے پہلے دراوڑ نسل کے لوگ تقریباً پورے بھارت میں چھائے ہوئے تھے، اور یہی دراصل برصغیر کے اصلی باشندے، اور ان سے بولی جانے والی دراوڑی زبانیں یہاں کی اصلی زبانیں تھیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے بھی اپنے مقالے میں اسی خیال کی تائید فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں:-

"ہندوستان کے اصلی رہنے والے دراویڑی اور ہندوستان کی اصلی زبانیں تامل، تلنگو اور کنڑی وغیرہ دراوڑی زبانیں ہیں

---

(1) The outlines of Indian Philology. London Page 10

[2] نقوش سلیمانی از علامہ سید سلیمان ندوی مطبوعہ مکتبۂ مشرق آرام باغ کراچی دسمبر ۱۹۵۱ء صفحہ ۳۴

سنسکرت اور پراتی ہندی خود باہر کی زبانیں ہیں جن کا اس
ملک سے چند ہزار برس سے زیادہ تعلق نہیں۔۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔ آریہ جو زبان بولتے ہوئے اس ملک میں آئے، معلوم
نہیں وہ اس کو کب تک بولتے رہے۔ بہر حال اس میں میل
ہوا اور اس سے اثر کر ایک دوسری زبان کا خاکہ تیار ہوا
جو ذرا ذرا سے فرق سے ہر صوبے میں الگ ہو گئی۔"

سندھ میں آریوں کا ورود

جیسا کہ رگ وید سے معلوم ہوتا ہے راجا سونیہ بھاویہ کے دور سے بہت قبل آریوں کا ورود سندھ میں ہوا تھا، اور دراوڑی زبانیں جب آریائی زبانوں کے ساتھ رشتۂ عقد میں منسلک ہوئیں تو اس اتصال اور اختلاط کے نتیجے میں ایک ایسے بچّے کی شکل میں رونما ہوئی جس نے اس وقت سے اب تک مختلف قوموں کا خون اپنے جسم میں داخل کر کے طرح طرح کا روپ بدلا تھا اس نومولود کی شکل و صورت اور آواز آپ رگ وید کے آغوش میں بہ آسانی دیکھ اور سن سکتے ہیں

دکپی (بمعنی بندر)	کلا (بمعنی فن)	کال (بمعنی وقت)	کوٹ (بمعنی جھونپڑ[illegible]
گن (بمعنی جماعت)	نانا (بمعنی بہت سے)	نیلا (بمعنی نیلا)	نیہار (بمعنی ابر[illegible]
پشپا (بمعنی پھول)	پوجن (بمعنی قابل عزت)	پھل (بمعنی پھل)	بیل (بمعنی سو[illegible]
بیج (بمعنی تخم)	راتری (بمعنی رات)	روپ (بمعنی شکل)	سائم (بمعنی شا[illegible]

یہ سب الفاظ دراوڑی ہیں جن کو آریائی زبانوں نے اپنے سینے سے لگا[illegible]

صرفی و نحوی قواعد میں بھی ہند آریائی زبانیں دراوڑی زبان سے بہت متاثر ہوئی ہیں، ان دونوں کے محاورات میں بھی بڑی مماثلت پیدا ہو گئی اشیا اور حرکات سے پیدا ہونے والی آوازوں کے مطابق الفاظ کی کثرت دونوں میں دکھائی دینے لگی، جیسے کھٹکھٹانا، تھپتھپانا، ہنہنانا، سنسناہٹ، گڑگڑاہٹ وغیرہ۔ بازگشتی الفاظ (Echo-words) ہند آریائی زبان میں دراوڑی ہی سے آئے جیسے کیچڑ ویچڑ، روٹی ووٹی۔ نقاب دقاب۔ کوٹ ووٹ، گھڑی وڑی، وغیرہ۔

برصغیر سے باہر کی آریائی زبانوں میں یہ خصوصیات نہیں پائی جاتیں۔ مسٹر بیمز نے اس حقیقت کو لسانیات کے ایک محقق کی حیثیت سے اس طرح بیان کیا ہے :-

[1] The Arean race speaking a language of the Indo-Germanic family, entered India from the North west, and gradually worked its way down the valley of the Gange drawing the Turanians with the Then alm in penetrable. forests and hills of the South.......... In spite of expulsion ana

(1) John Beems:- The Outlines of Indian Philol London 1863. P.

oppression. However there is reason to believe that a considerable number of the Toranians remained still in the Valley of the Ganges, and it is to the obstinacy with which they retained certain characteristics of their origicnial speech."

آریاؤں کے ورود کے بعد دراوڑی اور آریائی زبانوں کے اتصال اور اختلاط کے نتیجے میں آریائی زبانوں کی ہیئت کذائی کا نقشہ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی نے اپنی تصنیف "اردو سندھی کے لسانی روابط" میں اس طرح کھینچا ہے :-

آریہ[1] لوگ جو زبانیں بولتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے وہ ڈھائی تین ہزار سال تک ارتقا کی منزلیں طے کرتی رہیں۔ ان میں تین دور اہم اور نمایاں ہیں :
(۱) سنسکرت اور اس کی ہم عصر بولیوں کا دور، (۲) پراکرتوں کا دور، (۳) اپ بھرنشوں کا دور۔"

آریاؤں کے بعد ایرانی، ترکی، عربی اور انگریزی قومیں باری

آریاؤں کے بعد ایرانی، ترکی، عربی اور انگریزی قوموں کا سندھ میں ورود اور ان کے لسانی اثرات

لہ اردو سندھی کے لسانی روابط۔ مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۰ء ص ۱۳

باری سے سندھ اور پنجاب پر حملہ آور ہوتی رہیں۔ اور نتیجے میں دراوڑی اور آریائی زبانوں کے اتصال سے پیدا شدہ زبان کو اپنی زبانوں سے غذا پہنچاتی رہیں۔ ان قوموں کے لسانی اثرات سے متعلق ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ نے اپنی کتاب "سندھی بولی جی تاریخ" میں بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ اس میں سے کچھ اس جگہ درج کیا جاتا ہے۔

"دارا[1]: (۵۲۰-۵۱۵ ق م) جس کی فتوحات نے قدیم ایرانی زبان کے اثرات کے لیے راستہ ہموار کیا۔ پانچویں صدی قبل مسیح سے لے کر چوتھی صدی قبل مسیح تک یہ زبان اثر انداز ہوتی رہی۔

سکندر: (۳۲۵-۳۲۶ ق م) اور بلخ کے یونانی حکمران (۱۹۵-۱۵۰ ق م) جن کی فتوحات سے یونانی زبان کے اثر کا دروازہ کھلا۔ یونانی اثرات کا زمانہ تیسری صدی قبل مسیح سے لے کر دوسری صدی قبل مسیح تک ہے۔

ساکا اور منتھین: (۱۵۰-۱۲۰ ق م) کے حملوں نے ترکی اور داردی زبانوں کو اثر انداز ہونے کا موقع دیا۔

کوشان شاہ کنشک:- (۴۰-۵۰ عیسوی) کے دور میں پالی پراکرت کو عروج حاصل ہوا تو اس کے اثرات مقامی بولیوں پر پڑے۔

لہ اردو سندھی کے لسانی روابط ص ۱۳۔ بہ حوالہ "سندھی بولی جی مختصر تاریخ" مطبوعہ حیدرآباد سندھ ۱۹۶۲ء ص ۱۱

پارتھیون: (۱۰۲/۱۶۰ —— ۲۰۰ عیسوی) کے حملوں نے ترکی اور داردی اثرات کے لیے دوبارہ دروازہ کھولا۔ تیسری صدی عیسوی میں ساسانی تسلط، چوتھی صدی عیسوی میں ہیاطلہ کے غلبے اس کے بعد "سفید ہن" (۴۷۰ —— ۴۸۰ عیسوی) اور خسرو نوشیرواں (۵۳۱ عیسوی) کے حملوں سے ترکی اور ایرانی زبان کا اثر اور بڑھا۔"

ان مختلف قوموں کی زبانوں نے نومولود زبان کے جسم ناتوان میں کس طرح اپنا خون پہنچایا اس کا پتا چلانے کے لئے ہمیں سندھی لغات قواعد اور لسانی تاریخ کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ زمانی ترتیب اور لسانی تقسیم کے لحاظ سے ہم اس کی نشان دہی مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت کر سکتے ہیں۔ (۱) ایرانی زبان کے اثرات (۲) یونانی زبان کے اثرات، (۳) ترکی زبان کے اثرات، (۴) عربی زبان کے اثرات، (۵) انگریزی زبان کے اثرات۔

ایرانی زبان کے اثرات

سندھ میں جب عربوں کی حکومت کا زوال ہوا تو اس کی جگہ فارسی بولنے والے حکمرانوں نے لے لی۔ محمود غزنوی سے لے کر ناصر الدین محمود تک حکمرانوں کی زبان فارسی تھی پھر جب سندھ میں سومرہ، سمہ، ارغون، ترخان، کلہوڑا، اور تالپور خاندانوں کی حکومت قائم ہوئی تو اس وقت بھی دینی اور مذہبی تعلق کی بنا پر عربی، اور فارسی زبان سے سندھ کا رشتہ نہیں ٹوٹا۔ اس سلسلے میں مسٹر بھیرومل

لکھتے ہیں:-

"۱۰۲۴ء[1] میں محمود غزنوی نے سندھ سے خلفا کے نائبوں کو نکال باہر کیا۔ غزنوی خاندان کے وقت سے فارسی کا میل جول ہوا...... ۱۵۲۱ء سے سندھ میں ارغونوں کی حکومت ہوئی اس وقت سے سندھ میں فارسی زبان کی تعلیم کا سلسلہ باقاعدہ شروع ہوا..... دہلی کے بادشاہوں کی حکومت سے فارسی کا تعلق بڑھ گیا، کلہوڑوں اور میروں کی حکمرانی میں ہندو اہل کار خانگی خط پتر بھی فارسی میں لکھتے تھے۔ کلہوڑوں اور میروں کی صاحبی میں ٹھٹھہ اور روہڑی گویا سندھ کی یونیورسٹیاں تھیں ہندو اور مسلمانوں کے بچوں کے لئے اخوندوں (ملاؤں) کے مکتب ہوتے تھے جس میں آج کل کے اسکولوں کی طرح درجے نہ ہوتے تھے۔ کریما، گلستان، بوستان، پندنامہ اور دوسری فارسی کتابیں پڑھاتے تھے۔"

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمود غزنوی کے عہد سے لے کر انگریزوں کے قبضے تک سندھ میں فارسی کا دور دورہ رہا اور وہ وہاں کے عوام اور خواص کے دلوں پر قابض رہی۔ ہر ذی علم سندھی فارسی پر دست رس رکھتا تھا۔ اور اسی طرح جب کبھی وہ سندھی زبان میں بھی کوئی چیز لکھنے بیٹھتا تو فارسی

---

[1] اُردو سندھی کے لسانی روابط صفحہ ۸۳-۸۴ بحوالہ سندھی بولی جی مختصر تاریخ صفحہ ۲۴۷

الفاظ اور اثرات اس کے قلم پر قابض رہتے۔ مثال کے طور پر کچھ فارسی الفاظ درج ذیل کیئے جاتے ہیں جو سندھی زبان میں گھل مل گئے ہیں اور ان کا استعمال سندھی ہی الفاظ کی طرح کیا جاتا ہے:۔

آرزو، آتش، آسمان، آواز، آزادی، آثار، آگاہ، آمدنی، آبدار، آسان، آزمائش، آباد، آبرو، آبادی، افسوس، اُمید، ابر، ارجمند، انجمن، اشرفی، انداز، اولیں، ارزاں، ادائگی، باندی، بادشاہ، پندار، بیگار، بیابان، بنیاد، بزرگ، بخت، بہار، بندگی، بارش، بلبل، باغ، بندش، بہشت، بے جا، بارگاہ، باعزت، برباد، برقرار، بجالی، بہترین، بہی خواہ، برکش، بیگم، دود، تباہ، تن، تندرست، تیزی، تلخی، پابند، پروردگار، پری، پُلاؤ، پرہیز، پیروی، پوشاک، پاک، پیشانی، پیدائش، پرواز، جدا، جنگ، جوان، خوش، جانشین، چمن، چُست، چاشنی، خاوند، خدا، خرمن، خواہش، خوبی، خشکی، خاندانی، خرابی، خودی، خاموش، خریدار، خود، دبستان، داور، درزی، دستار، درویش، دسترخوان، دشمن، دنگل، دوست، درخت، دام، دل، دستور، دیوار، دامن، دور، دوزخ، دریا، درد، دیر، درخواست، درمیان، درگاہ، دربار، داستان، دردناک، رائگاں، رخسار، رفتار، راہ،

رویّہ، رنگ، روز، راز، رُخ، روزمرہ، ریشم، روشنی، رائے دہی، رومال، روپوش، رُسوا، رہائش، زمین، زبانی، زرخیز، زندہ، زبان، زور، زخم، زر، زیاں، زندگی، زبردست، زیردست، ساربان، سر، سرسام، سوگند، سامان، سود، سرد، ساخت، سپاہی، سرگرم، سرکار، سرراہ، سرحد، سروکار، سنگین، سرسبز، شبنم، شرمسار، شاگرد، شلوار، شمشیر، شاہ، شاخ، شام، شکار، شاہد، شکست، شاداب، شادی، فرمان، فروغ، فراہم، فریاد، فرزند، کار، کاکل، کچکول، کوہستان، کباب، کمک، کاش، کوشش، کارروائی، کمزور، کبوتر، کمی، کاروبار، گردہ، گویا، گراں، گریبان، گل، گدا، گذارش، گنجائش، گرمجوشی، گرمی، گندگی، گلشن، گلزار، گرفتار، گلستان، لشکر، لاش، مشک، مہمان، مرد، مگر، مفت، مست، مرہم، مُردار، مزدور، مہربانی، نازک، نارنگی، نیک، نشیب، نرم، نماز، نازاں، نادار، نمائندہ، نشانی، نیکی، نمائندگی، نوجوان، واپسی، ویرانی، ہوش، ہنر، ہمواری، ہنگامی، ہمدردی، ہرگز، یادگار، یکساں، یار۔ ۱؎

۱؎ اُردو سندھی کے لسانی روابط از ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی صفحہ ۴۶۹-۴۷۲

صوتی اعتبار سے بھی سندھی زبان پر فارسی کا کافی اثر پڑا۔ سندھی زبان نے اپنے حروف تہجی میں فارسی کے خ، ز، غ، ف، خ، حروف کو قبول کر کے اپنے اندر خاصی صوتی لطافت پیدا کر دی ہے۔

یونانی زبان کے اثرات

یونانیوں نے بھی کچھ الفاظ چھوڑے ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں:-

مقناطیس: یہ لفظ یونانی میں مکناطیس تھا، لیکن سندھ میں عربوں نے اس لفظ کو مقناطیس کی شکل میں معرب کر دیا، اور پھر یہ سندھی میں داخل ہو گیا۔

مرمر، مالیخولیا، درم، (سندھی) ڈم، سرنگ[1] (سندھی سرنگھا) وغیرہ یونانی الفاظ ہیں۔ قیاس ہے کہ یونانیوں نے کافی الفاظ چھوڑے ہوں گے لیکن سندھیوں کے ساتھ چونکہ ان کا دینی اور مذہبی رشتہ نہ تھا اس لیے ان کے رخصت ہوتے ہی ان کے چھوڑے ہوئے الفاظ بھی بہ مرور ایام رد پش ہو گئے۔

ترکی زبان کے اثرات

حکیم فتح محمد سیوہانی کی کتاب "آفتاب ادب" صفحہ ۴۶۹ میں کچھ ترکی الاصل الفاظ ملتے ہیں جو سندھی میں شیر و شکر ہو گئے ہیں۔ کچھ بھیرومل نے بھی اپنی کتاب "سندھی بولی جی مختصر تاریخ" صفحہ ۱۸۰ میں دیئے ہیں

---

[1] بھیرومل نے اس کو سندھی بولی جی مختصر تاریخ صفحہ ۱۸۰ میں یونانی لکھا ہے، لیکن مؤلف نور اللغات اسے ہندی بتاتے ہیں۔

ان سب الفاظ کو "اردو سندھی کے لسانی روابط"[1] کے حوالے سے اس جگہ پیش کر رہا ہوں:-

چقمق[1]: چاقو، چغو (چغا)، قینچی، چلیمچی، چغل، چغلی، چق، چمچو (چمچا) قابو، بقچو (بقچا) غالیچو (غالیچا)، قلندر، قمچی، بورچی (باورچی) سوغات، بیگ، بیگم، طمانچو (طمانچا)، قنات، آگو (آغا)، ایلچی، بندوق، چاق، خان، خانم، خچر، کولی (قلی) وغیرہ۔

عربی زبان کے اثرات

سندھ سے عربوں کا تعلق یوں تو قبل از اسلام بہت قدیم زمانے سے قائم تھا لیکن محمد بن قاسم کی فتوحات کے بعد یہ خطہ دمشق کی اسلامی حکومت کے زیر نگین آ گیا۔ اور پھر تقریباً تین سو سال تک عربوں کی اس خطے پر حکمرانی رہی۔ اس عرصے میں کافی عرب ترک وطن کر کے یہاں آباد بھی ہو گئے تھے۔ نتیجے میں عربی زبان پورے سندھ میں سمجھی اور بولی جانے لگی۔ جیسا کہ اصطخری اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے:-

"منصورہ[2] (ضلع نواب شاہ) اور ملتان اور ان کے اطراف کی زبان عربی اور سندھی ہے۔"

ابن حوقل بھی اپنے سفرنامے میں اس بات کی شہادت دیتا ہے:-

"منصورہ[3] اور ملتان اور اس کے اطراف میں عربی اور سندھی

---

[1] اردو سندھی کے لسانی روابط ص ۴۵۔ [2] اصطخری مطبوعہ لائیڈن ص [illegible]
[3] سفرنامہ ابن حوقل، مطبوعہ لائیڈن، ص ۲۳۳

بولی جاتی ہے۔"

عربوں نے سندھ کو اپنا وطن بنا لینے کے بعد اپنی زبان کا پورا سرمایہ بھی اُٹھا کر اُس کے حوالے کر دیا۔ قرآن مجید اور حدیث شریف عربی زبان میں تھی جو سندھیوں کو جان سے زیادہ عزیز تھی اور اس کو وہ ہمیشہ سینے سے لگائے رکھتے تھے، اور آج بھی لگائے رکھتے ہیں۔ اس دینی رشتے کی وجہ سے عربی زبان، ثقافت اور تہذیب سندھ میں خوب پھلی پھولی۔ نتیجے میں آج ہم بے شمار عربی الفاظ سندھی زبان میں موجود پاتے ہیں، مثلاً:-

"آفت[1]، آخرت، اصلاح، اخلاق، ادائل، اقوام، احوال، اعلیٰ، اصل، ایمان، احسان، لصلی، باطن، بالغ، باعث، تقرر، تعاون، تحقیقات، ثابت، ثواب، صحاب، ثقافتی، جبل، جامع، جدید، جمہوریت، جواز، جدوجہد، حیران، حیات، خادم، خاطر، خارج، خرلیف، دینار، دائم، دوران، دفاعی، دعویٰ، ذاتی، ذکر و اذکار، ذخیرہ، رباب، رسم و رواج، رائج، رحم، زوال، زرعی، سیاحت، سقیم، سبب، شاہد، شئے، شروعات، شرائط، شمولیت، صنعت، صورت، صلاح، صوت، صبح، صدر، ضمنی، ضرب، ضائع، طمع، طعام، طبع، ظاہر، ظلم، علم،

عکس، غیر، غبار، فلداری، فتح، فن، فضل، قبول، قلم، قربت، قانون، قلت، مشہور، منتخب، نسبت، نجات، نافذ، ہوا، ہدایت، وقت، وجود، وقار، وضاحت، وساطت، یقین وغیرہ۔

عربی زبان کا ایک اور نمایاں اثر یہ ہوا کہ سندھی زبان نے اپنا پرانا ناگری رسم الخط ترک کر کے عربی رسم الخط اور حروف تہجی کو اختیار کر لیا جو آج تک رائج ہے۔ اس کو "سندھی عربی صورتخطی"[1] کہتے ہیں۔

سندھ کے کلہوڑا اور تالپور حکمرانوں کے عہد حکومت میں عربی کے ساتھ سندھی زبان کی ترقی کے لیئے بھی بہت کچھ کیا جاتا رہا ہے، اور اس زبان و ادب کو بلاشبہ اتنی ترقی ہوئی کہ آج یہ مغربی پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں میں سب سے زیادہ اہم اور ترقی یافتہ سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس کو سنوارنے اور ترقی دینے میں چونکہ سب سے زیادہ ان ہی عربی کے علما، فضلا، اور صوفیا کا ہاتھ رہا اور ہے اس لیے لازمی طور پر سندھی زبان پر عربی زبان کا گہرا اثر پڑا۔ مرزا قلیچ بیگ نے اپنی تصنیف "سندھی ویاکرن" میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:-

"سندھی[2] میں تصنیف و تالیف کی ابتدا دینی کتب سے ہوئی ان کے لکھنے والے سندھ کے علما اور بزرگان دین تھے۔ ان میں

[1] سندھی ویاکرن حصہ ۳ صہ ۲۱
[2] سندھی ویاکرن حصہ ۳ صہ ۲۳

[1] اُردو سندھی کے لسانی روابط، از ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، صہ ۲۶۳-۲۶۸

بہت سے مشہور ہو گزرے ہیں، مثلاً سید صفائی بکھری، سید معصوم شاہ بکھری، قاضی محمود علامہ ٹھٹھوی، مخدوم ابوالخیر شیخ عبدالواسع صوفی، مخدوم ابوالحسن ٹھٹھوی، میر علی شیر قانع ٹھٹھوی، میاں عبدالرحیم گرہوڑ والے، شاہ عبدالکریم بلڑی والے شاہ عبداللطیف بھٹائی، وغیرہ۔ یہ سب سندھ کے مشہور عالم تھے جنھوں نے عربی، فارسی اور سندھی زبان میں اکثر دینی اور تاریخی کتابیں تصنیف کی ہیں۔" (ترجمہ)

ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ نے بھی اپنی کتاب "سندھی بولی جی مختصر تاریخ" میں اس مسئلے پر خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:-

"فتحِ اسلام کے بعد عربوں کے معاشرے اور عربی زبان کے زیر اثر سندھی زبان میں مزید مرکزیت پیدا ہوئی۔ زبان کی نفسیاتی کیفیت بدلی، زبان کے تمدنی سرمائے میں اضافہ ہوا، زبان کی ساخت، رسم الخط اور صرف و نحو پر اثر پڑا۔ ملک میں علمی ترقی کی وجہ سے سندھی زبان کے عالم اور شاعر پیدا ہوئے۔ عرب عالموں نے بھی سندھی زبان و ادب اور رسم الخط میں دلچسپی لی، ان کے متعلق تبادلۂ خیال کیا، اور اپنی معلومات اپنی تصانیف

له "سندھی بولی جی مختصر تاریخ" از ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ۔ مطبوعہ حیدرآباد سندھ در ۱۹۶۲ء، صہ ۵۰

میں قلم بند کیں۔ سندھی زبان پہلی مرتبہ عربی رسم الخط میں لکھنے میں آئی۔ جس کی ابتدائی اور نادر مثال اُس سندھی شاعر کے قصیدے کا وہ شعر ہے جو اُس نے یحییٰ یا اس کے بیٹے فضل کی تعریف میں لکھا ہے۔" (ترجمہ)

ادبی سطح سے قطع نظر عربی زبان نے لسانی سطح پر جو اثرات سندھی زبان پر ڈالے ہیں ان میں بہت سے ضرب الامثال، کہاوتیں، اور ترکیبوں کے علاوہ مندرجہ ذیل حروف تہجی ث، ح، ص، ض، ط، ظ، ذ، ع اور ق کی بھی شمولیت ہے۔ غرض جدید سندھی زبان شرف الدین اصلاحی صاحب کے قول کے مطابق "مسلمانوں کی ساختہ نہ سہی پرداختہ ضرور ہے۔ وہ عربی فارسی کے سایۂ عاطفت میں پلی ہے اور اس نے ان کا دودھ پی کر ہی وہ توانائی حاصل کی ہے جس نے اُسے دنیا کی علمی و ادبی زبانوں کی صف میں کھڑا ہونے کے قابل بنایا۔ نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو ان کی حجازی ہے"[له]

انگریزی زبان کے اثرات

انگریزوں نے مسلمانوں کے برخلاف اپنے مفتوحین سے زیادہ اختلاط روا نہیں رکھا۔ پھر مسلمانوں نے برصغیر فتح کرنے کے بعد اسے اپنا وطن بنا لیا تھا، انگریز اس کا تخیل بھی نہیں کر سکتے تھے اس لیے انگریزی زبان کی مسلمانوں کی زبان عربی فارسی کی طرح

له اُردو سندھی کے لسانی روابط صہ ۸

مقبولیت تو نہ ہو سکی لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ انگریزی الفاظ سندھی زبان میں ضرور داخل ہوئے، مثلاً:-

اسٹیشن، اسکول، اسپتال، اسمبلی، اسکیم، انچارج، اسٹاف، اردلی، اسٹیج، اسپیکر، اسپیچ، اسٹیم، اسٹیمر، اسپرٹ، الماری، اسٹول، اپیل، آرڈیننس، آکسیجن، اسپیشل، بوٹ، بٹن، بل، بلٹی، بس، پتلون، پلٹن، پاسپورٹ، پستول، پارسل، پریس، پوزیشن، پروگرام، پوسٹ، پولس، پبلک، پریزیڈنٹ، پارٹی، ٹیلیگرام، ٹیلیفون، ٹیوب، جج، جنرل، جیل، چارج، چرچ، درجن، ڈاکٹر، ڈگری، ڈویژن، ڈسمس، ریل، رپورٹ، ریڈیو، رکارڈ، رجسٹر، رائفل، ریزلٹ، سمن، سوسائٹی، سکریٹری، سولجر، سروے، فل، فیملی، فلم، کمپاؤنڈ، کیس، کارڈ، کمانڈر، کیک، کنٹرول، کارتوس، کلاس، گورنر، گراموفون، گدام، گرانٹ، لسٹ، لالٹین، لوکل بورڈ، لیگ، منی آرڈر، منسٹر، ممبر، میٹنگ، منٹ، نوٹ، نمبر، وارنٹ، ووٹ، واچ، ہوٹل، یونیورسٹی، وغیرہ"

مختلف زبانوں کے باہمی اختلاط سے سندھ میں ایک نئی زبان کا سیّال حالت میں وجود

ان زبانوں کے باہمی اختلاط سے برصغیر اور بالخصوص سندھ و پنجاب میں ایک نئی زبان

لہ اُردو سندھی کے لسانی روابط صفحہ ۴۳-۴۴-۴۴

سیّال حالت میں ظہور پذیر تو ہو گئی لیکن مسلمانوں کے سندھ میں آنے سے پہلے اس کا کوئی ٹھوس سانچہ تیار نہیں ہوا تھا مسلمانوں اور بالخصوص صوفیائے کرام نے اس سیّال زبان کے، مقام اور زمان کے لحاظ سے، مختلف سانچے تیار کیئے۔ جن کو ہم آسانی کے لیئے مگدھی، کھڑی بولی، پنجابی، سندھی اور دکنی ریختہ کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ اسی لئے میں علمائے لسانیات کے ان نظریات کا کہ اُردو برج بھاشا سے نکلی، پنجاب سے نکلی، دکن سے نکلی، گجرات سے نکلی، سندھ سے نکلی، اور بہار سے نکلی کا دل سے قائل نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اُردو کی داغ بیل ہزاروں سال پہلے پڑی، اور سیکڑوں سال وہ برصغیر کے ہر علاقے میں سیّال حالت میں رونما رہی پھر اس کو صوفیائے کرام نے جو برصغیر کے ہر علاقے میں تبلیغ اسلام کے لیے پھیل گئے تھے، ان مختلف علاقوں میں اس سیّال مادّے کو اُردو کے مختلف سانچوں کی شکل دے دی۔

صوفیائے کرام نے اس سیال مادے کو سانچے کی شکل دے دی

مسلمان فاتحین کے ساتھ صوفیائے کرام سارے برصغیر میں حق کا پیغام لے کر پھیل گئے تھے، یہ روحانیت اور اپنے اعلیٰ مقصد کی سچائی کے بل پر فاتحین کی فوج سے بے نیاز برصغیر کے گوشے گوشے میں بے تکلف اور بے جھجک پہنچ گئے ں کو پیغام حق پہنچانے کے لیئے عوام کے دلوں تک پہنچنے کی ضرورت تھی، اور دلوں تک پہنچنے کے لیئے سب سے پہلے ہم زبانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ عربی فارسی بولنے والے صوفیائے کرام نے خدا کی بھٹکی ہوئی مخلوق تک پہنچنے کے لئے علاقائی پراکرت کو وسیلہ بنایا اور ہر علاقے

کے عوام سے کچھ ان کی اور کچھ اپنی زبان میں باتیں اور تبلیغ اسلام کرنے لگے۔ ان کی اسی کوشش نے مختلف علاقوں کے لئے اُردو کے مختلف سانچے تیار کر دیئے۔ اور اس لئے یہ دعویٰ غلط نہ ہوگا کہ اُردو زبان کے اصل معمار اور خالق ہمارے صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین ہی ہیں جن کی زبانِ مبارک سے اُردو کی تخلیق ہوئی۔ پھر شعرا نے اس کو لوریاں دے کر پالنے میں جھُلایا۔ ادیبوں نے اس کو تعلیم و تربیت دے کر حسین و رعنا بنایا۔ اور بادشاہوں نے اُس کی پرورش و پرداخت میں جی کھول کر حوصلہ مندی دکھلائی۔ برصغیر کے مختلف علاقوں کے اُردو سانچوں میں مطابقت پیدا کرنے کے سلسلے میں علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے ایک مقالے میں بہت صحیح لکھا ہے کہ:-

گجرات، شمالی ہند، دکن اور بہار کی طرح سندھ کے صوفیائے کرام کے اُردو ملفوظات

"ہندوستان کی موجودہ بولی پیدا تو سندھ اور پنجاب میں ہوئی، نشو و نما دکن میں پائی تعلیم و تربیت دلّی میں حاصل کی، لیکن تہذیب اور سلیقہ لکھنؤ میں سیکھا۔"

گجرات، شمالی ہند، دکن، اور بہار کے صوفیائے کرام کی طرح

لہ نقوشِ سلیمانی، از سلیمان ندوی، مطبوعہ کلیم پریس کراچی۔ ص ۸

ٹہ شیخ وجیہہ الدین گجراتی کے چند اقوال کو بحر الحقائق کے حوالے سے حامد حسن قادری صاحب نے اپنی تصنیف "داستانِ تاریخِ اردو" ص ۳۶ (تیسرا اڈیشن) میں اس طرح

سندھ میں بھی صوفیائے کرام کے اُردو ملفوظات اوائل آٹھویں صدی ہجری سے ہمیں ملنے لگتے ہیں اور اس لحاظ سے سندھ برصغیر کے کسی علاقے

(بہ سلسلہ ماسبق) درج کیا ہے :- (الف) "اس سیتی ہور کیا خوب ہے اس دنیا میں کہ دل خدا سوں مشغول ہووے"۔ (ب) "عارف اسے کہویں جو خدا سوں بھریا ہووے"۔

حضرت سید برہان الدین عبد اللہ بن محمود الملقب بہ قطب عالم (سنہ وفات ۸۸۰ھ) کے بارے میں مذکور ہے کہ گجرات میں جہاں آپ قیام پذیر ہو گئے تھے ایک روز کسی ضرورت سے پچھلی رات کو باہر نکلے تو کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔ آپ نے فرمایا "لوہ ہے یا ککڑ یا پتھر یا کیا ہے"۔ اسی طرح آپ کے صاحبزادے حضرت سید سراج الدین محمد بن عبد اللہ الملقب بہ شاہ عالم کے بارے میں حامد حسن قادری صاحب نے اپنی تصنیف داستانِ تاریخ اردو ص ۲۶ میں لکھا ہے کہ "جب شاہ بارک اللہ چشتی احمد آبادی نے بشارتِ نبوی کی تعمیل میں قطب عالم کے فرزندِ اکبر کو شاہ عالم کا لقب دیا اور قطب عالم نے بشارتِ خواب اور لقب کا واقعہ سنا تو فرمایا کہ چشتیوں نے پکائی اور اُسے بخاریوں نے کھائی"۔

۳ ؎ حضرت شاہ بوعلی قلندر پانی پتی نے (متوفی ۷۲۴ھ مطابق ۱۳۲۴ء) ایک مرتبہ حضرت امیر خسرو کو خوش ہو کر اپنا کلام سنایا۔ حضرت امیر خسرو اُسے سن کر آبدیدہ ہوئے تو حضرت شاہ بوعلی قلندر نے فرمایا "ترکا کچھ سمجھدا رہے" حضرت امیر خسرو نے جواب دیا "روتا ہوں کہ کچھ نہیں سمجھتا" جناب حامد حسن قادری نے اپنی تصنیف میں حضرت شاہ بوعلی قلندر کا یہ دوہا بھی نقل کیا ہے :-

سے بھی پیچھے نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ہم اس جگہ حضرت مخدوم جلال الدین بخاریؒ اور بابا فرید گنج شکر کو پیش کر سکتے ہیں۔ اخبار الاخیار

(بہ سلسلۂ ماسبق) "سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کر بھور کدھی نا ہوئے"

○ حضرت مخدوم علاؤ الدین علی احمد صابر کلیریؒ (متوفی ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء) سے متعلق حامد حسن قادری صاحب نے سیر الاقطاب کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت مخدوم کلیریؒ کبھی کبھی ہندی میں شعر بھی کہتے تھے۔ ہندی میں آپ کا یہ شعر مصنف سیر الاقطاب نے درج کیا ہے :-

اس طرح اس میں ڈوب اے صابر کہ بجز ھو کے غیر ھو نہ رہے

سیر الاقطاب ۱۰۵۶ھ کی تصنیف ہے، اور حضرت صابر کلیری کا وصال ۶۶۴ھ میں ہوا ہے اس وقت کی ایسی صاف زبان محلِ نظر ہے۔ بعد میں ممکن ہے ان کی اصل زبان کو ان کے معتقدین نے زیادہ صاف اور سلیس کرنے کی کوشش میں مسخ کر دیا ہو۔

○ حضرت شیخ سراج الدین عثمانی معروف بہ اخی سراج (متوفی ۷۵۸ھ/۱۳۵۷ء) حضرت نظام الدین اولیا کے مرید تھے، اُن کے وصال کے بعد انھوں نے حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ سے خلافت حاصل کی۔ خلافت دینے کے بعد حضرت خواجہ نے حکم دیا کہ "بنگالہ جاؤ" شیخ اخی سراج نے عذر کیا کہ وہاں شیخ علاؤ الدین پہلے سے موجود ہیں، میری کیا ضرورت ہے۔ حضرت خواجہ نے فرمایا "تم اوپر دے تل

میں لکھا ہے کہ مخدوم جلال الدین بخاری کے دادا ساتویں صدی ہجری میں بخارا سے ترک وطن کر کے بھکر (سندھ) میں آباد ہو گئے تھے۔ لیکن

(بہ سلسلۂ ماسبق) ○ حضرت خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے اخلاق و تصوف پر ایک رسالہ اُردو زبان میں ۷۵۸ھ/۱۳۰۸ء میں لکھا تھا جس کا تفصیلی تذکرہ میر نذر علی درد کاکوروی نے "نگار" لکھنؤ کے شمارہ دسمبر ۱۹۲۵ء میں کیا ہے۔ اس رسالے کو بلا شبہ اُردو نثر کا سب سے پہلا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی پیدائش ۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء میں ہوئی تھی۔ اور ایک سو بیس برس کی عمر پا کر ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء میں ان کا وصال ہوا۔ درد کاکوروی صاحب نے اس قلمی رسالے کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ: "سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے اپنے سلسلے کے ایک بزرگ مولانا وجیہ الدین کے ارشادات کو اُردو زبان میں (جس کو اس زمانے میں زبان ہندی کہتے تھے) خود جمع کیا ہے، میں نے اپنے ایک بزرگ کے پاس خود اس کتاب کو دیکھا ہے۔ یہ قلمی کتاب ۲۰۷ صفحے کی ہے۔ اس کے صفحہ ۱۱۸ کی ایک عبارت کا ٹکڑا یہ ہے: "اے طالب آسمان زمین سب خدا میں ہے جو تحقیق جان۔ اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرہ ہے تو صفات کے باہر بھیتر سب ذات ہی ذات۔"

○ حضرت امیر خسروؒ کے دوہے، گیت، پہیلیاں، کہہ مکرنیاں بہت زیادہ مشہور ہیں لیکن اُن کے وہ اشعار جو فارسی اور اُردو الفاظ پر مشتمل ہیں اور ان میں دونوں زبان کے اختلاط سے گنگا جمنی رنگ پیدا ہو گیا ہے، خاص طور پر اس لیے قابلِ ذکر ہیں کہ اس سے حضرت امیر خسروؒ کی اُردو (ہندی) سے محبت کا اندازہ

پیر حسام الدین راشدی صاحب نے "تذکرہ صوفیائے سندھ" مرتبہ مولانا اعجاز الحق قدوسی کے پیش لفظ میں خود حضرت مخدوم جلال الدین

(بہ سلسلہ ما سبق) ہوتا ہے۔ پھر اس سے فارسی اور ہندی الفاظ کے اتصال اور اختلاط کا عمل سامنے آجاتا ہے۔ ہمارے صوفیا اور علما اسی طرح ہندی میں فارسی اور فارسی میں ہندی الفاظ ملا کر اس کو آمادل آویز اور دل کش بنا دیتے تھے کہ عوام غیر ارادی طور پر اس کو قبول کر لیتے تھے۔ دو چار اشعار نمونتہً درج ذیل ہیں

از بر دو لبت شہد و شکر می ریزد	ہر گاہ بگوئی کہ دہی لیہو دہی (دہی لو دہی)
زرگر پسرے چو ماہ پارا	کچھ گھڑلے سنوارنے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست	پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

شباں ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

٥ صوفیا کی اسی حسین کوشش نے سلاطین اور اُمرا کو بھی اس طرف متوجہ کیا تھا۔ چنانچہ بابر نے اپنی "تزک بابری" میں نہ صرف ہاتھی، پان، پنکھا، جامن، کمرک، کیوڑا، کرونداں، چرونجی، گلہری، مور، دوبھر وغیرہ جیسے اُردو الفاظ کو استعمال کیا ہے بلکہ اپنے ترکی زبان کے اشعار میں وہ اکثر اُردو الفاظ اور افعال بھی استعمال کر دیتا تھا۔ مثلاً :-

لحکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی	فقرا ہلیغہ لبس بولغوسید دریانی و روٹی

شمس العلما مولانا محمد عبد الغنی پروفیسر ناگپور یونیورسٹی نے اپنی تصنیف "تاریخ ادب فارسی

بخاری کے بارے میں ہی لکھا ہے کہ وہ ترک وطن کر کے ٹھٹھہ میں آباد ہو گئے تھے۔ اُن کے الفاظ ہیں :-

---

(بہ سلسلہ ما سبق) در عہد سلاطین مغلیہ" جلد سوم میں "تاریخ ہمایونی" قلمی کے حوالے سے شہنشاہ اکبر سے متعلق یہ دو واقعے درج کیے ہیں کہ "ایک مرتبہ اکبر بادشاہ کے روبرو کسی اشتعال طبع پر ادہم خاں نے خان اتکہ کو قتل کر دیا تو اکبر نے بے ساختہ ادہم خاں سے کہا :- "اے بچہ گاؤدی تو کیوں اتکہ مارا از جاں بے جان کر دی۔"
دوسرا واقعہ ہے کہ اکبر بادشاہ نے جب اپنے فرزند اور ولی عہد جہانگیر کی شادی راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے کی، تو رخصتی کے وقت اکبر اور جہانگیر نے عروس کی پالکی خود اپنے کندھوں پر اُٹھائی۔ راجہ بھگوان داس اس نظارے سے متاثر ہو کر بولا :- "ہماری بیٹی تمہارے محلوں کی چیری ۔۔ ہم باندے غلام رہے۔"
اکبر نے برجستہ جواب دیا :- "تمہاری بیٹی ہمارے محلوں کی رانی ۔۔ تم صاحب سردارے۔"

٥ دکن کے صوفیائے کرام میں حضرت شیخ عین الدین گنج العلم (پیدائش ۷۰۶ھ/۱۳۰۶ء وفات ۷۹۵ھ/۱۳۹۳ء) حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (پیدائش ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء وفات ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء)۔ شمس العشاق شاہ میراں جی (متوفی ۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء)، حضرت شاہ برہان الدین جانم (متوفی ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء) اور شاہ امین الدین اعلیٰ (متوفی ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء) کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان بزرگان دین نے نہ صرف اُردو ملفوظات، اقوال اور اشعار چھوڑے بلکہ مذہبی اور تبلیغی رسالے بھی دکنی اُردو میں تصنیف فرمائے ہیں۔ مثلاً حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے چند مقولے اور اشعار حامد حسن

ؒ حضرت جلال الدین سرخ بخاری جب اپنے وطن سے نکلے تو سب سے پہلے بھکر (سندھ) پہنچے اور وہاں کے جیّد صوفی حضرت سیّد

(بہ سلسلہ ما سبق) قادری صاحب نے داستان تاریخ اردو ص۳۹ میں بعض قلمی بیاضوں کے حوالے سے نقل کیے ہیں۔

(۱) "بھوکوں موے سوں کچھ اٹر نیا ہے، خدا کوں اٹرنے کی استعداد ہور ہے"

(۲) "اومعشوق بے مثال نور نبی نہ پایا ۔۔ اور نور نبی رسول کا مرے جیو میں بھایا

آپس اپنی دیکھا دنے کیسی آرسی لایا"

ان کا رسالہ معراج العاشقین انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہو چکا ہے شمس العشاق میراں جی کی اردو تصانیف شرح مرغوب القلوب، جل ترنگ اور گل باس مخطوطے کی شکل میں محفوظ ہیں جن کی نشاندہی حامد حسن قادری صاحب نے کی ہے۔ اور شرح مرغوب القلوب کی نثر کا نمونہ قلمی نسخہ سے انھوں نے داستان تاریخ اردو ص۴۲ میں درج بھی کیا ہے، وہو ہذا:- "خدا کہیا، تحقیق مال اور بنگر لے (اولاد) تمہارے دشمن ہیں جھوٹ دیو دشمناں کو اے کیا غفلت ہے جو تجھے اندھلا (اندھا) کیا موت کی یاد تھے (سے) تجھے بسر اکر (بھلا کر)۔

شاہ میراں جی کے فرزند حضرت شاہ برہان الدین جانم ؒ کی تصنیف رسالہ کلمۃ الحقائق کا نمونہ یہ ہے:- "یہ تن الادھا (علیحدہ) دستا (نظر آتا) ولیکن جیتا بکار (متحرک) لوٹنے نہیں بلکہ ستنتر بکار روپ دستا ہے، ایک تل قرار نہیں، جیون مرکٹ روپ۔"

بدرالدین کی صاحبزادی سے عقد کیا۔ اسی بی بی کے بطن سے سیّد احمد کبیر تولد ہوئے، جن کے صاحبزادے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت ہیں۔ حضرت جہانیاںؒ جہاں گشت ؒ کا

(بہ سلسلۂ ما سبق) حضرت شاہ برہان الدین جانمؒ کے فرزند و جانشین حضرت شاہ امین الدین اعلیٰؒ کے رسالہ گنج مخفی کا نمونہ داستان تاریخ اردو ص۴۳ کے حوالے سے درج ذیل ہے:-

"اللہ تعالیٰ نے گنج مخفی کو عیاں کرنا چاہا تو اول اس میں سوں ایک نظر نکلی، سو اس سے امین دیکھ ہوا، اس شاہد کہتے ہیں یو دونوں ذات کے دو طور ہیں، ذات نے آپس کو دیکھا، اسے نظر کہتے ہیں دیکھ کر گواہی دیا تو اسے شاہد کہتے ہیں، یہ تینوں مرتبے ذات کے ہیں۔"

۵؎ صوبۂ بہار کے صوفیائے کرام میں بہت سی ایسی برگزیدہ شخصیتوں کا نام آتا ہے جنھوں نے اپنے اردو (ہندی) دوہے، فالنامے، کچھ منتر، مجرب نسخے اور نقش پیش کر کے اس بات کا ثبوت فراہم کر دیا ہے کہ صوبۂ بہار میں نومولود سیال زبان نے ساتویں صدی ہجری سے "گدھی سانچے" کی شکل اختیار کر لی تھی ان بزرگوں میں حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری (پیدائش ۶۶۱ھ وفات ۷۸۲ھ) کا نام سرفہرست آتا ہے۔ حضرت مخدوم جہاں کا یہ شعر نسخہ اور فالنامہ اپنی کتاب صوفیائے بہار اور اردو کے حوالے سے درج ذیل ہے:-

شعر:- شرفا گور ڈراونی نس اندھیاری رات، وال نہ پوچھے کوئی تمہاری جات

اس سرزمین سے بہت ہی گہرا تعلق رہا ہے۔ سلطان فیروز اور
سلاطین سندھ کے درمیان آپ ہی کی کوششوں سے صلح ہوئی۔"

نسخہ:- اودھ پھٹکری مردار سنگ   ہلدی زیرہ ایک ایک ٹنک
انیون چنا بھر مرچیں چار   اور برابر تھوتھا ڈال
پوست کے پانی میں پوٹری کریں   آنکھ کے بیرا ترتے ہریں

~~~~~~~~

فالنامہ: دس چار کچھ آگم آوے   آٹھ پانچ پھل مانگے پاوے
نین گیارہ پہنچے راج   نو سو سترہ کرے آکاج

حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے مرید اور جانشین مخدوم
مولانا مظفر بلخی کے یہ دو دوہے اپنی تصنیف "بہار اور اُردو شاعری" ص[۱] اور
"صوفیائے بہار اور اُردو" ص۳۸ کے حوالے سے درج ذیل ہیں:-
جی تکن میں ہے کہ آئی ہیں سہانی رتیاں   جن کے کارن تھے بہت دن سے بتا میں گذر

~~~~~~~~

آدمی کوں تن پکھرا جنگل کر نہ اداس   کنکھجھ جل بنہ دسنی نہ چھوکو نہ باس

حضرت مخدوم احمد چرم پوش (درگاہ امبیر بہار شریف) کے کچھ فقرے "ضیار اُ...
میں ملتے ہیں راقم الحروف نے پروفیسر حسن عسکری کے مقالے "اُردو ہندی زبان ...
کے حوالے سے اپنی تصنیف "صوفیائے بہار اور اُردو" میں پیش کیا ہے اس سے
اس جگہ درج ہے:۔
سیتا من نمونہ تیر دمن کہا ہوئے   اینہن بیدھا بیداں میاں سرنہ کس کو ...

حضرت جلال الدین بخاری اور مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ
منیریؒ کے درمیان بہت گہرے مراسم تھے جیسا کہ حضرت مخدوم شعیب
فردوسی نے اپنی تصنیف "مناقب الاصفیاء" ص[۲۱] میں ایک جگہ لکھا
ہے کہ "سید جلال الدین بخاریؒ دہلی میں اکثر بہار کی طرف منہ کر کے سینہ ملتے
اور فرماتے عشق و محبت کی بو آتی ہے۔" معدن المعانی (ملفوظات
مخدوم شرف الدینؒ) میں ایک جگہ ان دونوں بزرگوں کے مکالمہ کا
ذکر اس طرح آیا ہے:۔

(بہ سلسلہ ما سبق) اس طرح حضرت محمد مجھری کے ملفوظات بھی "مناقب محمدی"
قلمی میں ملتے ہیں۔ تفصیلی مطالعے کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب
"صوفیائے بہار اور اُردو" مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی
اور "بہار اور اُردو شاعری" مطبوعہ آرہ کتاب گھر (بھارت)

[۱] تذکرہ صوفیائے سندھ از مولانا اعجاز الحق قدوسی کا پیش لفظ ص۲۲

[۲] جیسا کہ مولانا اعجاز الحق قدوسی نے وضاحت فرمائی ہے مخدوم جلال الدین
سرخ کے پوتے کا نام بھی مخدوم جلال الدین بخاری تھا۔ اور جہانیاں جہاں گشت
ان کا لقب تھا۔ کیونکہ ہم عصر کتب مناقب الاصفیا اور معدن المعانی کے مطابق
حضرت جلال الدین بخاری کا فیروز شاہ تغلق مرید تھا، اور ان ہی نے فیروز تغلق
اور سلاطین سندھ کے درمیان صلح کرائی تھی۔ ان میں سے حضرت مخدوم شرف
الدین احمد منیری کے مراسم تھے، ان ہی کے بارے میں مونس القلوب قلمی (ملفوظات

"ہمدریں محل جلال الدین مذکور گفت کہ بہ زبان ہندوی نیکو گفتہ است ہر کہ گفتہ است "باٹ بھلی پر سانکری" بعد از اں بندگی مخدوم عظمۃ اللہ بر زبان مبارک راند" دلیس بھلا پردور"۔ (معدن المعانی مطبوعہ سنہ ۱۳۰۱ھ صہ ۲۰۳)

"باٹ بھلی پر سانکری" یعنی راہ اچھی پر تنگ، اور "دلیس بھلا پردور" کی ترکیب سندھی اور گجراتی سانچے کی نشان دہی کر رہی ہے۔ جو ان دونوں سندھی اور گجراتی بزرگوں سے ایک مکالمہ کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

حضرت جلال الدین بخاری (اچکری) کا ایک اور جملہ "جمات شاہی" ملفوظات حضرت شاہ عالمؒ میں بھی درج ہے۔ لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی سید راجو قتالؒ کے حق میں یہ حکم فرمایا "السّاں خوجے تساں رلجے"۔

حضرت راجو قتالؒ کے بارے میں بھی درج ہے کہ ایک مرتبہ آپ کا دہلی کسی ضرورت سے جانا ہوا تو فیروز شاہ تغلق سے ملکر مزاج پرسی آپ نے ان الفاظ میں فرمائی تھی "کا کا فیروز چنگا ہے"۔

(بہ سلسلہ ماسبق) مخدوم احمد لنگر دریا بلخی فردوسی) صہ۹۰ میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مخدوم جلال الدین بخاری فیروز تغلق کے یہاں عرصے تک نہیں جا سکے تو اس نے ان کے خادم سے وجہ دریافت کی، اس خادم نے جواب دیا کہ ابھی حال میں ہمارے مخدوم شرف الدین کا ایک مکتوب حضرت کے پاس آیا ہے جس کا مطالعہ حضرت معتکف

حضرت ابو الفیض قاضی بن علا ابن عالم ترمتیؒ نے بھی جو حضرت عبد اللہ شطاریؒ سے سنہ ۸۸۱ھ میں مرید ہوئے تھے، اپنے ملفوظات معدن الابرار میں حضرت مخدوم سید جلال الدین بخاریؒ کا یہ فقرہ نقل کیا ہے "کھنڈا بے پھندا کہاں"۔

حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ چشتیہ سلسلے کے بڑے جلیل القدر صوفی گذرے ہیں آپ کی ولادت مصنف "تاریخ فرشتہ" کے مطابق سنہ ۵۸۴ھ میں ملتان کے قصبہ کھتوال میں ہوئی تھی جو اس وقت سندھ میں شامل تھا، بعد میں آپ شہر اجودھن میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ آپ کے خلیفہ حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ کا جب وصال ہوا تو اُن کی اہلیہ الملقب بہ مادر مومناں اپنے صغیر سن فرزند شیخ برہان الدینؒ کو لے کر حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، حضرت نے کم سنی کے باوجود آپ کو بیعت کر لیا

(بہ سلسلہ ماسبق) ہو کر فرما رہے ہیں اور ان ہی کے بارے میں مناقب الاصفیا صہ ۱۴۰ میں مرقوم ہے کہ "حضرت سید جلال الدین بخاری سے کسی نے پوچھا کہ آج کل اپنی آخری عمر میں آپ کا کیا مشغلہ ہے فرمایا مکتوب شیخ شرف الدین کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ (تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی تصنیف تاریخ سلسلۂ فردوسیہ، صہ ۱۶۲ - ۱۶۴)

۳؎ سندھ کے جدید اردو شعرا از مشتاق علی جعفری مطبوعہ سندھ یونیورسٹی پریس حیدرآباد در سنہ ۱۹۶۱ء صہ ۸

تو مادر مومناں نے عرض کیا "حضرت تو جا بالا ہے"۔ یعنی حضرت یہ تو ابھی بچہ ہے۔ حضرت بابا گنج شکرؒ نے فرمایا: "مادر مومناں پونم کا چاند بھی بالا ہوتا ہے۔"

سندھ میں اردو اشعار اور مکالمے کے قدیم ترین نمونے

بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے اپنی کتاب "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ" میں حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے کچھ اردو اشعار درج کیے ہیں جو حضرت امیر خسروؒ کے اشعار کی طرح کچھ فارسی اور کچھ اردو میں ملے جلے ہیں۔ اسرار الاولیا کے حوالے سے درج ذیل ہے:۔

عشق کا رموز نیارا ہے — جز مدد پیر کے نہ چارا ہے
وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے — خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا — خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
باتنِ تنہا چہ روی زیر زمیں — نیک عمل کن کہ وہی ساتھ ہے

(بہ سلسلہ ما سبق) ؎ سندھ کے جدید اردو شعرا از مشتاق علی جعفری مطبوعہ سندھ یونیورسٹی پریس حیدر آباد سنہ ۱۹۶۱ء ص۸

؎۵ "صوفیائے بہار اور اردو" از پروفیسر محمد معین الدین دردائی مطبوعہ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی۔ در سنہ ۱۹۷۳ء ص۳۱

؎۶ سندھ کے جدید اردو شعرا ص۶

؎۷ اسرار الاولیا ملفوظات حضرت بابا گنج شکرؒ مترجمہ محمد معین الدین دردائی مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی

پند شکر گنج بہ دل و جاں شنو — ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

جناب حامد حسن قادری نے اپنی تصنیف "داستان تاریخ اردو" میں ایک پرانی بیاض کے حوالے سے بابا فرید گنج شکرؒ کی ایک نظم کے کچھ اشعار بھی درج کیے ہیں، جو یہاں پیشِ خدمت ہیں:۔

تن دھونے سے دل جو ہوتا ہے پاک — پیش رو اصفیا کے ہوتے خوک
ریش سبلت سے گر بڑے ہوتے — بوکڑاں سے نہ کوئی بڑے ہوتے
خاک لانے سے گر خدا پائیں — گائے بیلاں بھی واصلاں ہو جائیں

یہ مکالمے اور اشعار چھٹی صدی ہجری کے ہیں جب کہ دکن اور برصغیر کے بہت کم علاقوں میں اردو نے ٹھوس شکل اختیار کی تھی۔ یہ فخر وادیِ سندھ کو حاصل ہے کہ اس وقت صوفیا اور عوام دونوں ایک سیال زبان کو سانچے میں ڈھالنے کی جد و جہد میں مشغول تھے۔ صوفیا کے بارے میں تو ابھی اوپر لکھا جا چکا اب عوام کے رجحان اور جد و جہد کو بھی دیکھیے۔ تاریخ فیروز شاہی (عفیف) مقدمہ چہاردہم میں مذکور ہے کہ سلطان محمد تغلق نے ۷۵۱ھ میں سومروں کے صدر مقام ٹھٹھہ پر فوج کشی کی تھی لیکن بیمار ہو کر فوج کشی کے دوران ٹھٹھہ ہی میں وہ انتقال کر گیا۔ اس کے انتقال کے بعد سلطنت ہند کا تاج اس کے بھتیجے سلطان فیروز شاہ تغلق کے سر پر حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے، جو اس وقت ٹھٹھے میں موجود تھے رکھا

؎۱ داستان تاریخ اردو از حامد حسن قادری مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۶۶ء ص۱۹

فیروزشاہ کی یہ تاج پوشی دریائے سندھ کے کنارے ہوئی تھی۔ سریرآرائے سلطنت ہونے کے بعد فیروزشاہ نے جام بابنیہ فرماں روائے سندھ پر پھر حملہ کیا، لیکن سلطان فیروزشاہ کے لشکر میں جانوروں کی بیماری پھیل جانے اور قحط پڑ جانے سے اس کو ناکام گجرات واپس ہونا پڑا۔ ٹھٹھ سے ناکام لوٹنے کے بعد وہاں کے لوگوں نے بڑی خوشیاں منائیں اور اس خوشی میں اُن کے منہ سے یہ جملہ نکلا:-

"برکت شیخ پٹھا[1] اک مُوا اک نٹھا"

تاریخ فیروزشاہی کے الفاظ یہ ہیں:-

"واول کرت کہ سلطان فیروز از ٹھٹھ بے غرض سمت گجرات بازگشت ٹھٹھیاں ایں سخن را ورد صحت ساختند و می گفتند "برکت شیخ پٹھا اک مُوا اک سٹھا"۔ (تاریخ فیروزشاہی مقدمہ یازدہم ص۲۳۱)

---

[1] حضرت شیخ پٹھا کا نام حسین، لقب شاہ عالم اور کنیت ابوالخیر ہے۔ والد کا نام راجپار اور والدہ کا نام سلطانی (بنت مراد بن شرفو) ہے۔ شیر علی قانع نے اپنی تصنیف تحفۃ الکرام جلد سوم ص۲۵۲ میں ان کی بزرگی اور کمال کا اعتراف علامہ قاضی محمود کے ان الفاظ کو نقل کرتے ہوئے کیا ہے:- "اقدم اولیا، واکرم واصلان، راہ خدای در تعریفش چہ قدم کسے راہ رود کہ شمہ از والا مقاماتش بدفتر نگنجد در اکثر سند نام چو صاحب کمال کم برخواستہ"۔
حضرت شیخ پٹھا موضع آری کے قریب، جو ٹھٹھ سے تقریباً ڈیڑھ میل جانب

"اک مُوا" سے ان کا اشارہ محمد شاہ تغلق کی طرف ہے جو ٹھٹھ میں دوران فوج کشی بیمار ہو کر فوت ہوا۔ اور "اک نٹھا"[2] سے اشارہ فیروزشاہ تغلق کی طرف ہے، جو جام بابنیہ سے شکست کھا کر گجرات کی طرف چلا گیا تھا۔

اس واقعہ اور اضطراری طور پر اظہار مسرت سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ سندھ کے عوام آج سے چھ سات سو برس پہلے (۷۵۱ھ میں) بھی اُردو بولتے اور سمجھتے تھے، اور سندھ میں نومولود ہندوستانی زبان نے صوفیا کی کوشش سے سانچے کی شکل اختیار کر لی تھی۔

(بسلسلۂ ماسبق) جنوب واقع ہے، ایک پہاڑ کے غار میں جہاں آج آپ کا مقبرہ ہے عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی شاہ عثمان شہباز کے ساتھ اس پہاڑ پر سے گذرے۔ اور اپنے مکاشفے سے اس جوہر قابل کا پتا چلا لیا، اور ان کو اپنے دست حق پرست پر بیعت کیا اور تھوڑے ہی دنوں میں حضرت شیخ پٹھا حضرت شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی کی توجہ سے آسمان ولایت کے آفتاب بن کر چمکے۔ اس کے بعد آپ کی ذات سے عرصے تک سندھ میں ہدایت و عرفان کے چشمے جاری رہے۔ آپ کا وصال ۶۶۶ھ میں ہوا۔ تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو "تذکرۂ صوفیائے سندھ" از مولانا اعجاز الحق قدوسی ص۵۰-۱۷۱، و تحفۃ الکرام جلد سوم ص۲۵۲ و حدیقۃ الاولیا قلمی مملوکہ سندھ یونیورسٹی ورق ۵۵-۵۶

[2] تاریخ فیروزشاہی میں درج ہے "دراصل نٹھا ہے جو خالص سندھی لفظ ہے"

> دسویں صدی ہجری میں سندھ کے صوفیا کے اُردو اشعار ملتے ہیں

۹۸۸ھ / ۱۵۸۰-۸۱ء سے دکن کی طرح سندھ میں بھی بعض ایسے صوفی شعرا کا پتا چلتا ہے جنھوں نے فارسی کے ساتھ اُردو میں بھی اشعار کہے ہیں۔ مثال کے طور پر میر معصوم علی بکھری کے چھوٹے بھائی میر فاضل بکھری کو لیجیے جن کی اُردو شعرگوئی کی نشان دہی "ذخیرۃ الخوانین" نے کی ہے:۔ "شعر[1] بہ زبان ہندی از قسم کانی بہ کمال فصاحت می گفت"۔

میر فاضل بکھری اور دکن کے سب سے پہلے اُردو شاعر سلطان قلی قطب شاہ کا دور ایک ہے۔ یہ دونوں دسویں صدی ہجری کے تھے۔ شمالی ہند میں اس وقت کے کسی شاعر کا دیوان یا مجموعۂ کلام اُردو میں نہیں ملتا، بارھویں صدی کے اوائل میں ولی گجراتی (المتوفی ۱۱۱۹ھ) کا نام آتا ہیں۔ پھر دہلی کے مشہور شعرا آبرو، فائز، حاتم وغیرہ کا کلام ملتا ہے۔ سندھ پر اس وقت کلہوڑا خاندان حکمراں تھا جس کی علمی سرپرستی اور داد و دہش کی خاصی شہرت تھی۔ اس بارھویں صدی ہجری میں "مقالات الشعرا" کے بیان کے مطابق سندھی نژاد اُردو شعرا کی تعداد پچاس کے قریب ملتی ہے جن میں سے اکثر صوفی مشرب اور صاحبِ طریقت بزرگ تھے۔ ان کا تفصیلی تذکرہ آئندہ صفحات میں آئے گا۔

(بہ سلسلۂ ماسبق) اور اس کے معنی "بھاگا" کے ہیں۔

[1] سندھ کے جدید اُردو شعرا صفحہ ۱۳ بہ حوالہ ذخیرۃ الخوانین۔

> بارھویں صدی سے تیرھویں صدی ہجری تک کے صوفی شعرا

پھر بارھویں صدی کے آخر سے تیرھویں صدی کے وسط تک سندھ میں تالپور حکمرانوں کا زریں دور آتا ہے۔ اس میں سندھی زبان و ادب کو جو عروج ہوا وہ تو ایک علیحدہ داستان ہے۔ اُردو شعر و ادب کی بھی کافی ترقی ہوئی۔ اس دور میں شاہو بنی، روحل فقیر، خلیفہ نبی بخش خاں، اور سچل سرمست جیسے باخدا بندگانِ دین اور صوفیائے کرام پیدا ہوئے جنھوں نے سندھی کے ساتھ اُردو شاعری کو بھی اپنے اظہارِ خیال اور تبلیغِ دین کا ذریعہ بنایا۔ شاہو بنی روحل فقیر خیرپور ریاست کے رہنے والے تھے، ان کا ایک یہ شعر "سندھ کے جدید اُردو شعرا" کے مصنف نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے لیکن حوالہ نہیں دیا ہے ؎

کیا مجھ سوں ہوئی خطا کہ سجن بولتا نہیں
کس بے درد سوں ملا رہے سجن بولتا نہیں

تیرھویں صدی کے آخر یعنی ۱۸۴۳ء / ۱۲۵۹ھ میں حیدرآباد کے قریب میانی کے میدان میں تالپوروں کا آفتابِ اقبال غروب ہوا، اور سندھ پر مکمل طور پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ سیاسی، معاشرتی، معاشی اور لسانی انقلابات نے سندھ کو تہہ و بالا کر دیا۔ مگر یہ آندھی اور طوفان سندھ کے صوفیائے کرام کے عزائم میں کوئی فرق نہ پیدا کر سکا۔ وہ اسی طرح اپنے دین و مذہب اور شعر و ادب کی خدمت میں لگے رہے۔ اس دور میں دور کے بہت سے صوفی شعرا گزرے ہیں جن میں میاں قادر بخش

بیدل روہڑی، مخدوم عبدالکریم، غلام حسین افضل سبزپوش ٹھٹوی، سید غلام علی گدا ہاشمی، مخدوم ابراہیم خلیل ٹھٹوی، پیر حزب اللہ شاہ تخت والا، ابراہیم شاہ صوفی، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اب ہم گیارھویں صدی ہجری سے تیرھویں صدی ہجری تک کے ان سندھی صوفی شعرا اور نثر نگاروں کا تفصیلی تذکرہ معہ ان کے نمونہ اشعار اور نثر پیش کریں گے جنھوں نے سندھی زبان کے ساتھ اردو کو بھی اپنی تعلیمات اور خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔

*

حصہ اول

صوفی شعرا
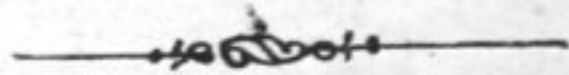
حصہ اول۔ صوفی شعرا

(۱) مُلّا عبد الحکیم عطا ٹھٹوی (سنہ ۱۰۴۰-۱۱۴۰ھ)

اس زمانے میں جب کہ شمالی ہند میں اُردو غزل گوئی کی داغ بیل
پڑ رہی تھی، سندھ کے دور افتادہ علاقے میں اُردو شاعری کا ایک ادا قا...
اُبھرا جو اس زمانے کے رسم و رواج کے مطابق اگرچہ فارسی گو شاعر تھا، لیکن اس
نے اُردو غزل کو اپنایا۔ اور اُردو میں غزلیں اور اشعار کہے، اس لیے ہم اس کو
سندھ میں اُردو کا محسن اور اُردو غزل گوئی کا پہلا شاعر قرار دیتے ہیں۔ ان کا
سنہ ولادت سندھ کے ادبی تذکروں میں کہیں نہیں ملتا، لیکن میر علی شیر قانع ٹھٹوی
نے اپنے تذکرے مقالات الشعرا میں اس کے دور کو متعین کرتے ہوئے لکھا کہ

"واز عہدِ شاہجہاں تا دورِ محمد شاہ در سخن وری مشار الیہ بود۔"

اس سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہ سنہ ۱۰۴۰ھ (۱۶۳۰ء) میں پیدا ہوا،
اس نے سنہ ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷ء) میں وفات پائی۔ وفات کے وقت ان کی عمر
سو سال تھی۔ انھوں نے اس طویل عرصے میں زمانے کے سرد و گرم کو دیکھا۔
حضرت عطا کا وطن ٹھٹھہ تھا، یہیں وہ پیدا ہوئے، پلے بڑھے، اور یہیں ان کی

شاعری کے جوہر اُجاگر ہوئے، ان کی قادر الکلامی اور کثرتِ اشعار پر تبصرہ
کرتے ہوئے صاحبِ مقالات الشعرا نے لکھا کہ:۔

"در انشا و لغت ہندی منقبتِ مرتضوی لک بیت
بہ اختتام رسانیدہ۔"

ایک جگہ وہ اپنے فن کی نا قدری کی شکایت کرتے ہوئے اپنے دیوان کے
متعلق نہایت پر درد انداز میں کہتے ہیں

نسخۂ ابیات دیوانم گزشت از سی ہزار
لیکن ایں قدر گیرا نیست اکنوں جوہری

حضرت عطا کا خاندان علم و فضل اور زہد و اتقا کی وجہ سے خاصا ممتاز تھا۔ آپ
کے والد اور بڑے بھائی اپنے وقت کے جید عالم اور مقبول شاعر تھے۔ تعلیم
سے فراغت کے بعد حضرت عطا نے بھی شعر و سخن کی طرف توجہ کی۔ جس
زمانے میں کہ عطا شاعری کی ابتدائی منزلیں طے کر رہے تھے، اور ان کا زمانہ
شباب تھا، عین اُسی زمانے میں یعنی سنہ ۱۰۶۳ھ (سنہ ۱۶۵۲-۵۳ء) میں نواب
ظفر خاں احسن شاہجہاں کی جانب سے ٹھٹھہ کا گورنر ہو کر آیا، سب سے پہلے
اسی امیر نے عطا کے جوہرِ قابل کو پرکھا، اور اپنی قدر دانیوں سے نوازکر ان
کی سرپرستی کی، اس معارف نواز امیر کی سرپرستی نے عطا کی شاعرانہ صلاحیتوں
کو اور بھی جلا بخشی، میر علی شیر قانع لکھتا ہے کہ:۔

"ٹھٹھہ کے گورنر نواب ظفر خاں (۱۰۶۳-۱۰۶۹ھ) نے اپنی سرپرستی

۱ سندھ میں اردو شاعری از ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ مطبوعہ حیدرآباد سندھ سنہ ۱۹۷۰ء ص ۱

میں ان کے شاعرانہ ذوق کی آبیاری کی۔ عطا کی شاعری کا آغاز
سنہ ۱۰۶۰ھ (۵۱-۱۶۵۰ء) سے ہوتا ہے۔"[1]

حضرت عطا نے تقریباً ایک سو برس کی طویل عمر پائی۔ اُنھوں نے اس طویل عرصے میں زمانے کے سرد و گرم کو دیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فارسی کلام میں اس طویل دور کی سیاسی اور سماجی بے چینی اور خلفشار کے کافی نشانات ملتے ہیں۔ ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ نے میر علی شیر قانع کے حوالے سے ان کے علم و فضل، زہد و اتقا، تقدس اور صوفی مشربی پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے:-

"بقول میر علی شیر قانع عطا ایک پاکباز، عبادت گذار اور پرہیزگار شخص تھے صوفی مشرب رکھتے تھے۔ عطا کو اپنے سخنور ہونے پر ناز تھا۔ وہ خود کو یکتائے روزگار سمجھتے تھے اور متمنی تھے کہ قدردان اُن کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کریں گے۔"

حضرت عطا فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے، ان کا فارسی دیوان جس کو سید محمد مطیع اللہ راشد برہانپوری نے دیوان عطا کے نام سے تصحیح و تحقیق کے بعد مرتب کیا ہے، اور سندھی ادبی بورڈ نے شائع کیا ہے، ان کی قادر الکلامی پر شاہد ہے۔ اس میں آٹھ نو سو کے قریب غزلیں، ایک سو رباعیاں ترجیع بند، مخمس اور ۱۴۱ اشعار پر مشتمل ایک ساقی نامہ ہے

---

[1] سندھ میں اُردو شاعری ص۲۰

حضرت عطا اپنی اسی سالہ مشق سخن سے اس منزل پر پہنچے کہ سندھ کے قدیم فارسی گو شعراء میں پختگی فن کے اعتبار سے ہمیں ان کا کوئی حریف نظر نہیں آتا۔ میر علی شیر قانع نے ان کے متعلق لکھا کہ:-

"شعرش مذاق متقدمین دارد"

حضرت عطا اُردو میں بھی اشعار موزوں فرماتے تھے، لیکن اُن کے اُردو اشعار کم دستیاب ہیں۔ صرف تھوڑے سے اشعار ان کے فارسی کلام کے ایک مخطوطے میں ملتے ہیں جو خود حضرت عطا کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ اُردو اشعار سنہ ۱۱۰۰ھ تک کے ہیں۔ اس کے بعد چالیس برس تک جو کچھ اُردو اشعار انھوں نے کہے ہوں گے ان کا پتا نہیں ملتا۔ جناب سید مطیع اللہ راشد مرتب دیوان عطا نے ان اُردو اشعار کو بھی مطبوعہ "دیوان عطا" کے مقدمے میں شامل کرکے ان کو ضائع ہونے سے بچا لیا ہے۔ ادبی حلقہ ان کا سپاس گذار ہے۔[1]

حضرت عطا کی اُردو شاعری کا اگر ہم تجزیہ کریں تو ہمیں ان کی اُردو شاعری کے دو موضوع نظر آتے ہیں، اُن کی اُردو شاعری کا ایک حصہ تو وہ ہے، جو اس دور کے سیاسی خلفشار سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ عالمگیر کے بعد مغلوں کا آفتاب حکومت غروب ہو رہا تھا، ہر جگہ بدامنی اور فساد رونما تھا۔ شرفا کی حالت تباہ تھی، ان کا وطن اور اہل وطن سخت پریشانیوں میں مبتلا تھے۔ وہ اپنے معاشرے کی تباہ حالی سے متاثر ہو کر فرماتے ہیں:-

---

[1] ملاحظہ ہو دیوان عطا مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ کا مقدمہ صفحات ۱۲۰-۱۳۴-۱۳۷-۲۵۹-۲۶۱

اے مسلمان وطن بیداد ہے | جور ہے، بیداد ہے، فریاد ہے
آشنا، بیگانہ، یار اغیار گشت | خود حقوقِ ما ہمہ برباد ہے
جز سکوت و شکر جائے شکوہ نیست | کار بے اصلاح مرا افسانہ ہے

دوسرے ان کی اُردو شاعری کا موضوع یا تو ان کے فن کی ناقدری ہے یا وہ غزلیں ہیں جو انھوں نے اُردو میں کہیں۔

حضرت عطا کے کچھ اُردو اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں:-

عطا اس بھوک سوں ہم لوگ تھا | ز خوردن ساگ مولی، سوک تھا
مری جاں دیکھنا پھر دکھ نہ دینا | کہ محتاج تو کے مفلوک رہتا
دو کلجگ از دعا گویاں مقابل | مدد پایا مراد جوک رہتا
ز با افراط افطار فقیراں | کیوں رجنا بہ ادھی بھوک رہتا
کہاں وہ پوچھنا ہنسنا کھلانا | نظر پر مور کی مملوک رہتا
عطا جب عطا کہاں خاموش رہتا | سخن گر از زباں بر گوش رہتا
چہ مجنوں ذو فنون زار اینجا | کہ بے پرواز خود بے ہوش رہتا
ز خود خونِ جگر پیتا و جیتا | بہ درد و داغ ہم آغوش رہتا
مسافر را ہمیں آب غذا خوش | گزا شکالے آہ دوشا دوش رہتا
چہ گل، رنگ حنا بندی بزدید | چہ نیلو فر کہ نیلی پوش رہتا
بہر دم آدمی بیچارہ بے تاب | بہ غمہا غوطہ نوشا نوش رہتا

~~~~~~

جوڑے سدھار جاگ کیا نیند باگلی | صد بار ہا زمانہ کبھی داؤ جیتنا

ہشیار رکھینا دکھ اپنا نہ سوجھنا | سب چھوڑنا نہ مال برا یا سمیٹنا
......ناڑ چھولنا نہ لڑکپن گیا ابھی | اتیت کلجگ دیر دیس جیتنا
......کیا کہہ گیا کھیت کا سمے | ...... تکے...... کھلیان دیکھنا

حضرت عطا کی زبان پر ہندی کے ساتھ اکثر سندھی الفاظ بھی آئے ہیں ان ہی کو دیکھ کر "سندھی ریختہ" کی حقیقت سمجھ میں آتی ہے۔

حضرت عطا کے یہاں بھی بابا فرید گنج شکر، امیر خسرو اور میر کامل کے ڈھب پر اُردو اشعار میں فارسی ترکیبیں اور مصرعے پائے جاتے ہیں، جن سے گنگا جمنی حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے یہاں خیالات اکثر فارسی شعرا سے مستعار لئے گئے ہیں۔
~~~~~~

(۲) حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ

(۱۱۰۲ - ۱۱۶۵ھ)

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ قدس سرہٗ پر وقتاً فوقتاً بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے اور مختلف اہلِ قلم نے مختلف زاویۂ نگاہ سے ان پر روشنی ڈالنے کی کوشش فرمائی ہے۔ کسی نے ان کو اُمیؔ کا لقب دیا تو کسی نے بحر العلوم کا، کسی نے ان کو شیعہ[۱] لکھا، کسی نے سنیؔ[۲] اور بعضوں نے ان کے مسلک کو ناقابلِ فہم[۳] بھی بتایا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک درویش صفت بزرگ اور فنا فی اللہ صوفی تھے۔ ان کی آنکھیں صفحۂ قرطاس سے زیادہ لوحِ دل پر کسی کے کتبات کو پڑھنے والی تھیں۔ وہ شیعہ، سنی، حنفی وہابی، حنبلی، شافعی وغیرہ کی جھگڑوں سے بہت بلند ہو چکی تھیں۔ وہ "کوزہ" سے زیادہ "کوزہ گر" کی محبت میں سرشار تھے۔ اور پھر اس کے نتیجے میں کوزہ گر کی ہر تخلیق پر فدا پروان تھے۔ ان کا مسلک بھٹکوں کو راہ دکھانا اور ہر انسان تک مالکِ حقیقی کا پیغام پہنچانا تھا۔ اور اس کے لئے انھوں نے شاعری کو ذریعہ بنایا، کیونکہ نثر کی بہ نسبت نظم کی صنف زیادہ دل پذیر ہوتی ہے،

---

[۱] ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سارلے۔
[۲] منشی محمد بخش واصف اور ڈاکٹر موہچند
[۳] مرزا قلیچ بیگ۔

نثر میں خارجی ہی خارجی باتیں ہوتی ہیں لیکن نظم میں شاعر کے دل کی دھڑکنیں اور خونِ تمنا بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ جو کچھ کہتا ہے سننے والوں کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتا ہے ع

کیسے پتے کی بات یہ دیوانہ کہہ گیا!

یہی وجہ ہے کہ صوفیا نے پیغام رسانی کے لئے نثر سے زیادہ نظم کو پسند کیا ہے اور نظم بھی انھوں نے مقامی زبانوں میں کہی جس سے عوام بہرہ مند ہو سکیں۔ سندھ میں اس وقت فارسی، ہندی، سرائیکی، اور سندھی بولنے والے افراد موجود تھے۔ حضرت بھٹائیؒ نے ہم زبانی سے ہم خیالی پیدا ہوتی ہے کے اصول پر ان سب ہی زبانوں کو پیغامِ الٰہی پہنچانے کا ذریعہ بنایا، اور اسی لئے ان کا کلام سندھی، سرائیکی اور ہندی (اردو) سب ہی میں موجود ہے۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کا تذکرہ بہت سی کتابوں[۱] میں کیا گیا ہے جن میں چند سے مستفید ہو کر میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔

---

[۱] (الف) تحفۃ الکرام (فارسی) مصنفہ میر شیر علی قانع ٹھٹوی۔ (ب) سندھ کے متعلق کچھ ذکر (انگریزی) از دیارام گدومل۔ (ج) شاہ عبداللطیف کی زندگی مذہب اور شاعری (انگریزی) از دیوان لیلارام سنگھ۔ (د) شاہ عبداللطیف بھٹائی (انگریزی) از ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سارلے (ہ) عکسِ لطیف، از تاج محمد آغا (و) سندھ کے جدید اردو شعرا از مشتاق علی جعفری۔ (ز) مقالات الشعراء از میر شیر علی قانع ٹھٹوی۔ (ح) شرح لطیفی از محمد بخش واصف۔

سرتاج الشعراء سید شاہ عبداللطیف بھٹائی ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب تاج محمد آغا صاحب نے اپنی تصنیف عکس لطیف میں اس طرح درج کیا ہے :-

"شاہ عبداللطیف، بن سید حبیب شاہ، بن سید عبدالقدوس، بن سید جمال شاہ، بن سید عبدالکریم شاہ، بن سید گل محمد شاہ، بن سید ضیاء اللہ شاہ، بن سید عبدالمومن شاہ، بن سید سائین شاہ، بن سید حاجی شاہ، بن سید جلال محمد، بن سید شرف الدین، بن سید میر علی شاہ، بن سید حیدر شاہ، بن سید میر علی شاہ ہراتی بن سید محمد شیرازی، بن سید محمد ترمذی، بن سید علی شاہ، بن سید یوسف شاہ، بن سید حسین شاہ رضا شیرازی، بن سید ابراہیم، بن سید علی حواری، بن سید حسین الاکبری شیرازی، بن سید جعفر شاہ، بن سید امام موسیٰ کاظم، بن امام جعفر صادق، بن امام محمد باقر، بن امام زین العابدین، بن امام حسین علیہ السلام، بن امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہم السلام۔

جیسا کہ سلسلۂ نسب سے ظاہر ہے حضرت سید شاہ عبداللطیف بھٹائی کے والد ماجد کا نام سید حبیب شاہ تھا۔ آپ کی والدہ ایک مشہور ولی اللہ حضرت نی عرف مخدوم عربی دیانہ کی صاحبزادی تھیں۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی ولادت کے بعد آپ کے والد ماجد حویلی سے منتقل ہو کر کوٹری میں جا بسے تھے جو موجودہ کوٹری کے برخلاف بٹ شاہ سے دو کوس کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، اب ویران ہو چکا ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اخوند نور محمد بھٹی سے حاصل کی۔ پھر باقاعدہ ان کی تعلیم کے سلسلے کا پتا نہیں چلتا اور یہی امر ان کے بعض سوانح نگاروں کے درمیان

آپ کی پیدائش ۱۱۰۲ھ ۱۶۸۹ء میں حیدرآباد سندھ کے ایک چھوٹے سے قصبہ ہالا حویلی میں ہوئی تھی۔ ہرات کے ایک ذی عزت سادات خاندان سے آپ کا تعلق تھا۔ آپ کے مورث اعلیٰ سید میر علی امیر تیمور کے معتمد درباریوں میں تھے۔ امیر تیمور نے سید میر علی کی خاندانی وجاہت اور کارگزاری کی بنا پر ان کے چھ لڑکوں کو مختلف ملکوں کا گورنر مقرر کر دیا تھا، جن میں ایک صاحبزادے میر عبدالرزاق بکھر (سندھ) کے اور دوسرے میر ابوبکر سیوھن کے گورنر تھے۔ آپ کے تیسرے صاحبزادے سید حیدر شاہ اپنے والد کے ساتھ ہرات ہی میں قیام پذیر رہے۔ ایک مرتبہ اپنے دونوں بھائیوں سے ملنے سید حیدر شاہ سندھ پہنچے تو وہاں ان کی ذاتی وجاہت اور خاندانی وقار سے متاثر ہو کر ہالا کے ایک معزز سردار شاہ محمد ولد دریا خاں نے اپنی صاحبزادی فاطمہ کو آپ کی زوجیت میں دے دیا۔ سید حیدر شاہ کی پہلی بیوی ہرات میں موجود تھیں۔ پانچ چھ ماہ بعد اپنے والد کی وفات کی خبر پا کر سید حیدر شاہ اپنی دوسری بیوی فاطمہ عرف بی بی سلطانہ کو سندھ میں چھوڑ کر ہرات چلے گئے۔ اور وہاں جانے کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک مہلک مرض میں مبتلا ہو کر انتقال فرما گئے۔

ہالا (سندھ) میں بی بی سلطانہ کے بطن سے میر علی پیدا ہوئے۔ انھوں نے دو شادیاں کیں پہلی سے شرف الدین اور دوسری سے سید احمد نامی دو فرزند ہوئے۔ ان دونوں صاحبزادوں کے خاندان مٹیاری شہر میں شرف پوتہ اور میرن پوتہ کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ اسی خاندان میں سید شاہ عبدالکریم بلڑی والے مشہور بزرگ گزرے ہیں جن کی چوتھی پشت میں قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین

غلط فہمی کا باعث بنا۔ لیکن ان ہی سوانح نگاروں سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ شاہ صاحب کو مثنوی مولانا روم سے بڑی محبت تھی۔ اور وہ اسے کبھی اپنے سے جدا نہیں کرتے تھے۔ وہ اسے ہر دم پڑھتے اور فیضان حاصل کرتے تھے۔ آپ کے کلام میں نہ صرف مثنوی مولانا روم کے بہت نمایاں اثرات پائے جاتے ہیں بلکہ اکثر موقع پر آپ نے مولانا روم کو اپنا معلم روحانی بھی ظاہر کیا ہے۔ اس وقت کے سندھ کے حکمران میاں نور محمد کلہوڑا نے، جو آپ کے عقیدت مند تھے، مثنوی مولانا روم سے حضرت کی شیفتگی کو دیکھ کر اس کا ایک نادر نسخہ تحفہ پیش کیا تھا۔ محمد بخش صاحب واصف نے شرح لطیفی میں بڑی تفصیل سے آپ کی فارسی عربی زبان پر لیاقت کو ثابت کیا ہے۔ مصنف عکس لطیف نے ان کے حوالے سے ایک جگہ لکھا ہے :۔

"شاہ صاحب مطلق ان پڑھ نہ تھے بلکہ آپ کو بہت سے علوم پر کافی عبور حاصل تھا، اور بہت سی زبانیں جانتے تھے۔ مثلاً عربی فارسی، سرائیکی، ملتانی، ہندی (اردو)، پنجابی، بلوچی وغیرہ اور سندھی تو آپ کی مادری زبان تھی۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کی کئی آیات اور عربی فارسی کے فقرے آپ کے کلام میں جا بجا موجود ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کو علوم ظاہری پر بھی کافی دسترس حاصل تھا۔"[1]

---

[1] "عکس لطیف" از تاج محمد آغا۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی صورت و سیرت کے بارے میں تقریباً ان کے تمام سوانح نگاروں نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ تاج محمد آغا مصنف عکس لطیف نے لکھا ہے کہ :۔

"وہ ایک خوش شکیل و جمیل انسان تھے، سینہ کشادہ اور بازو سڈول اور مضبوط رکھتے تھے، قوت اور ہمت کی حد نہ تھی، ریش مبارک جو گورا اور بھری ہوئی، گندمی رنگ، سیاہ اور بڑی بڑی آنکھیں جو شراب عشق کے نشے میں ہر وقت مخمور رہتی تھیں ...... خلق خدا پر نہایت خلیق اور شفیق تھے، کبھی کسی کو اپنی طرف سے تکلیف نہیں پہنچائی، آپ سادگی پسند تھے، اکثر گیروے رنگ کی کفنی پہنتے تھے جو کالے سوت سے بُنی ہوئی تھی، سر پر صوفیانہ وضع کی ایک سفید اور دراز ٹوپی پہنتے تھے جسے تاج یا کلاہ کہتے ہیں۔ اس تاج کے اوپر ایک چھوٹا سا کالا کپڑا عمامہ کی طرح لپٹا ہوا ہوتا تھا۔ ہاتھ میں ایک گول دستہ کی عصا رہتی تھی۔"[1]

شاہ صاحب کو "کوزہ گر" سے عشق اس کے ایک کوزہ کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا اور اسی وقت سے ان کی شاعری کی بھی ابتدا ہوئی۔ عشق کی آگ دل میں لیئے وہ شہر شہر، قصبہ قصبہ، کوبہ کو اور در بہ در کی خاک چھانتے پھرے، راستے میں سنیاسی فقیروں کی صحبت اختیار کی، دوران سفر جہاں جہاں جاتے وہاں کی

---

[1] عکس لطیف از تاج محمد آغا مطبوعہ ۱۹۵۱ء صفحہ ۴۱-۴۲

مقامی عشقیہ داستانوں سے اپنی شاعری کے لیے مواد لیتے اور ان کو قلمبند کر لیتے۔ کراچی اور حیدرآباد کے درمیان جھیل کینجھر پہنچے تو وہاں کے "نوری اور جام تماچی" کی عشقیہ داستان کو اپنی "سرکامود" میں قلمبند کر کے غیر فانی بنا دیا۔ وہاں سے ٹھٹھہ پہنچے اور بزرگان عظام اور صوفیائے کرام کی صحبت سے مشرف ہوئے۔ وہاں سے روانہ ہونے کے وقت "سہنی مہینوال" کی مشہور داستانِ عشق کو اپنی شاعری میں قلمبند کر لیا۔ ٹھٹھہ کے بعد بھنبھور پہنچے تو وہاں "سسی پنوں" کی داستان سے متاثر ہو کر اس کو بھی اپنی شاعری کے لئے منتخب کر لیا، اور اپنے سوز و ساز سے اس کو غیر فانی بنا دیا۔ طویل صحرانوردی کے بعد عمر کوٹ پہنچے تو وہاں کی "عمر اور ماروئی" کی مشہور داستان کو اپنی شاعری کے لیے منتخب کر لیا اور اس داستان کے ضمن میں "کُلّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ" اور حب الوطنی کے بڑے بڑے رموز و نکات بیان فرمائے۔ عمر کوٹ سے سوا میل کے فاصلے پر مہارانی مومل کا محل دیکھا تو اس سے "مومل اور رانا" کی داستان کا مواد اپنی شاعری کے لیے اخذ کر لیا۔ اور ان تمام داستانوں کو اپنی شاعری میں اس طرح سمو دیا کہ آگے چل کر وہ تصوف کے اشارے بن گئے۔

شاہ صاحب کے سندھی کلام کا مجموعہ "شاہ جو رسالو"[1] (یعنی شاہ کا رسالہ)

---

[1] اس کو سب سے پہلے ۱۸۶۶ء میں ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ نے جرمنی میں چھپوایا تھا۔ اس کے بعد قاضی ابراہیم صاحب نے ۱۸۶۸ء میں ایک نسخہ مرتب کر کے بمبئی میں چھپوایا۔ اس کے بعد اس کا تیسرا ایڈیشن پھر بمبئی ہی سے شائع ہوا۔ ۱۹۰۰ء میں محکمہ تعلیم کی طرف سے

کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے اشعار زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ اس میں تصوف اور اخلاق کے بے شمار رازہائے سربستہ کا انکشاف کیا گیا ہے۔ سندھی شاعری کے اس غیر فانی شاہکار کا کمال یہ ہے کہ جوں جوں قدامت کی چادر اس پر پڑتی جاتی ہے اس کا حسن اور نکھرتا جاتا ہے۔ اور سندھی زبان اپنی منزلوں سے گذر کر جیسے جیسے نئے سانچے اختیار کر رہی ہے "شاہ جو رسالو" کی زبان کو اپنا ہم سفر پاتی ہے۔ اس کے بعض بعض سندھی اشعار ہندی (اردو) سے بہت زیادہ ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً:-

سوری چڑھن، سچ، لبسن اسی کام عاشقن

سولی چڑھنا — یہ — کام — عاشقوں کا

شاہ صاحب کے کلام کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایرانی شاعری کی اندھی تقلید سے بالکل پاک ہے۔ ان کے یہاں "خطِ رخسار" "بندِ قبا" اور "کاکل و کلاہ" کی پابندی نہیں ملتی۔ انھوں نے سرزمینِ حسن و عشق کے لیے ایران کے فرہاد و شیریں، نجد کے قیس و لیلیٰ، مصر کے یوسف و زلیخا، اور عراق کے وامق و عذرا، کو نہیں منتخب کیا، بلکہ سندھ کے "مومل اور رانو" "عمر اور ماروئی" "نوری اور تماچی" اور "سسی اور پنوں" کو پسند کیا۔ ان کی نظر میں

(بہ سلسلہ ماسبق) موجودہ سندھی رسم الخط میں اسے شائع کرایا گیا۔ پھر ۱۹۱۳ء میں مرزا قلیچ بیگ صاحب نے اس نسخے کو بڑی محنت اور کاوش سے نئے سرے سے ترتیب دے کر شائع کرایا۔

نیل و دجلہ، اور فرات، سے زیادہ دلکش مہران، اور کاک کی موجیں ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری سے اخلاق و تصوف کی بڑی بڑی تعلیمات دیں۔ وہ خیالات کی فضا میں کبھی نہیں اُڑتے ان کو ہمیشہ حقیقت کی تلاش رہتی ہے۔ اگر جس وقت کوئی حقیقت اُن کے سامنے آجاتی ہے اس کو اسی طرح دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور اس طرح وہ زندگی کے چہرے سے حقیقت کا نقاب اُٹھانے میں بہت زیادہ حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے "عشق و سپردگی" پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ اور غالباً یہ مولانا روم کا غیر معمولی اثر ہے۔ وہ عشق ہی کو سب مرض کی دوا قرار دیتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ خرد سے گتھیاں سلجھتی نہیں اُلجھتی ہیں۔ مثلاً:۔

سوری متھے سیں کھڑی لیکے سرا
جبھ لگا نیں منے ہور پائی سیج تھی

(معنی) وہ کون ہے جو اپنے دوستوں کو سولی پر دیکھ کر خوش ہوا
جب آنکھیں چار ہوئیں تو سولی بھی سیج بن گئی۔

وحدت الوجود کی وضاحت آپ کے کلام میں اکثر جگہ ملتی ہے۔ مثلاً:۔

اک قصر در لکھ، کوڑی کنٹس گر کھیوں
جیداہ کریاں پر کھ تنداہ صاحب سامھوں

(معنی) ایک محل لاکھ دروازے، اور اس میں کروڑوں کھڑکیاں
جدھر دیکھتا ہوں ادھر وہ صاحب ہی سامنے ہے

وحدتا کثرت تھی کثرت وحدت کل　　حق حقیقی ھیکڑو بولی بی ۽ بھل

ھوھا جو حلُ پا اللہ سند و سبھنیں

(معنی) وحدت میں کثرت بنی اور سب کثرت وحدت ہو گئی
وہ حق ہے اور در حقیقت ایک ہے تو اُسے بھول کر غیر کو مت پکار،
خدا کی قسم ہر جگہ اسی دوست کا شور و ہنگامہ ہے

شاہ صاحب رسول اللہ صلعم اور اہل بیت کی محبت کو زندگی کا سب سے بہترین سرمایہ سمجھتے تھے اور ہمہ دم اس میں سرشار رہتے تھے۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی قدس اللہ سرہٗ کے اکثر اشعار اُردو میں بھی ملتے ہیں، لیکن ابتدائی بارھویں صدی ہجری میں سندھ کے اندر اُردو اشعار،[1] "سندھی ریختہ" ہی کی شکل میں مل سکتے ہیں اور وہ ان کے "شاہ جو رسالو" میں تلاش کرنے سے کافی مل جاتے ہیں، ہم یہاں ان کے دو اشعار جو بہت صاف اُردو میں کہے گئے ہیں نمونتہً درج ذیل کرتے ہیں:۔

بلبل روئے رین دن کہاں گئی گلزار　　اُن کی قیامت آج ہے جن کے بچھڑے یار[2]
لا الٰہ کر آرسی الا اللہ سے دیکھ　　محمد صورت رب کی اس میں میخ نہ میکھ

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کا وصال "تریسٹھ برس کی عمر میں ۱۴ صفر ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۲ء کو ہوا۔ آپ کی وصیت کے مطابق شاہ محمود کے قدموں کی طرف آپ کے جسم لطیف کو سپرد خاک کیا گیا۔ آپ کے ایک مرید نے بھا

---

[1] سندھ کے جدید اُردو شعرا از مشتاق علی جعفری ص۱

[2] اسی خیال کو ایک شاعر نے یوں ادا کیا ہے ع تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی۔

نے یہ تاریخ وفات لکھی :-

گفت ایں رجا مریدش ارتحالِ پیر
گردیدہ محوِ عشق وجودِ لطیف میر

۱۱ ۶۵ ہجری

شاہ بھٹائی سے میاں غلام شاہ کلہوڑا حکمران سندھ کو بڑی ارادت و عقیدت تھی۔ آپ کا مقبرہ انہی نے بڑے اہتمام سے ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳-۵۴ء میں تعمیر کرایا اور اظہار عقیدت کے لئے مقبرہ کا مینار اتنا اونچا بنوایا کہ خدا آباد سے نظر آئے۔ یہ مقبرہ سندھ کے مشہور معمار عیدن کے زیر نگرانی تعمیر ہوا تھا۔ غلام شاہ کلہوڑہ کے بعد میر نصیر خاں تالپور نے مقبرہ اور مسجد کی نئے سرے سے مرمت کرائی اور اس کے گرد قلعہ کی تعمیر میں ہاتھ لگایا لیکن مکمل نہ ہو سکا۔ میر [illegible] تالپور نے مقبرہ کے ایوان میں ایک کنواں بنوایا اور ان کے چچازاد بھائی نے روضۂ مبارک کے سامنے چاندی کا ایک دروازہ بنوایا جو آج تک قائم ہے۔[1]

[1] عکس لطیف صفحہ ۳۸

(۳) میر حیدر الدین کامل رح

۱۱۰۰ھ/۱۶۸۸-۸۹ء — ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۰-۵۱ء

حضرت میر حیدر الدین ابوتراب کامل کا تعلق ٹھٹہ کے امیر خانی سادات سے تھا۔ آپ کے والد رضی الدین فدائی (المتوفی ۱۱۳۰ھ/[illegible]ء) اور دادا میر ابوالمکارم شہود (المتوفی ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۲-۶۳ء) اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور فارسی کے صاحب کمال شاعر تھے۔ میر علی شیر قانع نے اپنی تصانیف مقالات الشعراء اور تحفۃ الکرام میں دونوں بزرگوں کی بہت تعریف کی ہے۔[1] میر حیدر الدین کامل نے اس علمی ماحول میں گیارھویں صدی ہجری کے آخر میں آنکھیں کھولیں۔ علم وفضل اور شاعری ان کو وراثت میں ملی۔ تصوف اور فقر کے عناصر نے ان میں اور بھی چار چاند لگا دیے۔ آپ کے اسلاف میں میر ابوالبقا میر خاں (المتوفی ۱۰۵۷ھ/[illegible]ء) اور میر ابوالقاسم نمکین (المتوفی ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹-۱۰ء) حکومت سندھ کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہے تھے لیکن حضرت میر کامل نے فقر و درویشی اختیار کر کے تجرد، عسرت، اور مسکینی کو اپنا شعار بنایا۔ انھوں نے ساری زندگی عبادت و ریاضت اور تبلیغ دین میں بسر کی۔ گوشہ گیر

[1] ملاحظہ ہو تحفۃ الکرام جلد ۳ صفحہ ۱۹۶-۲۰۸ و مقالات الشعرا صفحہ ۱۳۰-۱۳۱

ہو کر قرآن و حدیث کے درس و تدریس میں مشغول رہے۔ اکثر و بیشتر آپ پر استغراق کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اور اس میں آپ سے بعض مرتبہ کرامات بھی ظاہر ہو جاتی تھیں۔ شادی آپ نے نہیں کی تھی اس لئے اولادِ جسمانی کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ معنوی اولاد کی آپ کے کوئی کمی نہ تھی۔ آپ کے شاگردوں، عقیدت مندوں اور مریدوں میں سندھ کے بہت سے اکابر علما، فضلا، مؤرخ اور شعرا شامل تھے۔ جن میں سندھ کے ممتاز مؤرخ اور شاعر میر علی شیر قانع (۱۱۴۰ - ۱۲۰۳ھ) محمد پناہ رجا (المتوفی ۱۱۹۷ھ) اور میر ابو البقا بہادر علی سبزواری ٹھٹوی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ چنانچہ میر علی شیر قانع نے مقالات الشعرا میں اکثر مقام پر آپ سے اپنی عقیدت اور تلامذت کا اعتراف کیا ہے، مثلاً :-

"فقیر[۱] چندے فیضِ صحبتش دریافتہ"

"فقیر[۲] نیز در حضور آں اُستادِ کامل گاہے فکرِ سندی می کرد"

قریب[۳] دو سال دیگر زماں بہ سخن آشنا نہ بودہ تا بہ تجدید بہ فیض خدمت استادِ کامل عامل میر حیدر الدین ابوتراب کامل مستفید شدہ چند غزل گذرانده۔"

میر علی شیر قانع کے بیان کے مطابق حضرت میر کامل نے اپنے شاگرد

---

۱ مقالات الشعرا ص ۲۵۳

۲ مقالات الشعرا ص ۲۰۴

۳ مقالات الشعرا ص ۲۱۴

محمد پناہ رجا کو اپنے کلام کے دس ضخیم مجموعے تدوین کے لیے حوالے کیے تھے۔ جن کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ وہ انھوں نے مرتب کیے تھے یا نہیں، یہ مجموعے اب کہاں ہیں اس کا کوئی پتا نہیں چلتا۔

حضرت میر کامل صوفی اور درویش کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ ادیب اور قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ میر قانع کے بیان کے مطابق آپ نے سندھی اور اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی اشعار موزوں فرمائے تھے۔ لکھتے ہیں :-

"شعر[۱] فارسی ہم اغلب بر عنوان ایہام سر زد طبیعت گرامی می شد۔"

پیر حسام الدین راشدی صاحب نے اپنی سندھی تصنیف "تذکرہ امیر خانی" میں کچھ اشعار دیے ہیں، اس سے نمونتہً درج ذیل ہیں :-

چساں رقم کنم ایں ناز رنگ رنگ ترا	چگونہ صلح نگارم چگونہ جنگ ترا
ز آشیانِ قلم باز کے کند پرواز	کہ پر برشتہ جاں بستہ ام خدنگ ترا

حضرت میر کامل اپنے علم و فضل اور تقدس کی بنا پر اپنے دور کے ممتاز صوفی اور اہل اللہ شمار کیے جاتے تھے۔ آپ کو علوم ظاہری اور باطنی میں کمال دسترس حاصل تھی۔ آپ کی بزرگی اور روحانیت کے سب ہی معترف تھے۔ میر قانع ان کے علم و فضل اور تقدس کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں :-

استاد[۲] محقق مجرد زیستہ۔ در کمالات آنجناب کتابہا باید سیاہ کرد

---

۱ مقالات الشعرا ص ۲۵۳

۲ اسلامیہ کالج میگزین سکھر بابت ۱۹۶۳-۶۴ء ص ۳۳

مجتبش سرمایہ فیوضات ظاہری و باطنی می دانستند۔ اغلب بزرگاں
بہ عدم ارادت بہ وے سلوک داشتند۔ ہرگز رجوع بہ دنیا نفرمودہ
و بہ عمل منطوقہ کُن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل زیستہ"
یہی بزرگ آپ کے اخلاق اور استغنا کے بارے میں مقالات الشعرا میں
اس طرح لکھتے ہیں :-

"جنابِ[1] کامل آں میر بے نظیر سراپا کمال و مرجع ارباب کمال بودہ
فقر اختیاری برگزیدہ۔ حصور و مجردی زیستند۔ با وجود آنکہ معیشت
شاں بہ عسرت کلی بود اکثر ارباب دول مثل نواب مہابت خاں کاظم
وغیرہ حکام سماجتہا وظیفہ و نیاز عرض می کردند۔ از ہیچ کدام قبول نہ
فرمودہ۔ ہمہ را عزلت گزیں، و گوشہ گیر از ابنائے زمانہ می بودند۔ و
ہر کہ از اہل دول وغیرہ بخدمت شاں حاضری می شد بے بہرہ نمی ماند
صحبتش غیر قال و حال و قال اللہ و قال الرسول نہ بود۔ اوقات
بابرکات در تحزن دائمی و استغراق بسر می رفت۔ خوارق از ایشاں
بسیار سرزدہ است۔"

حضرت میر کامل کلہوڑا حکمرانوں کے عہد کے بزرگ تھے۔ آپ کی اد
عمر میں سندھ سے مغلوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا تھا۔ اور کلہوڑا خاندان بر
اقتدار آیا تھا۔ آپ کے پردادا امیر ابوالبقا شاہجہاں کے عہد حکومت میں

---

[1] اسلامیہ کالج میگزین سکھر۔ ص ۳۳

سندھ کے صوبہ دار تھے۔ اور سیوھن، گنجابہ، بدین، ٹھٹہ اور جھوناگڑھ کا
علاقہ آپ کی جاگیر میں تھا۔ ٹھٹہ کی مشہور جامع مسجد شاہجہاں کے حکم پر آپ
نے ہی بنوائی تھی۔ حضرت میر کامل سے پہلے دہلی سے اکثر صوبیداران آتے
رہتے تھے اور ان کے ساتھ بہت سے فارسی کے ایسے شعرا بھی آتے جو
اُردو میں بھی غزل کہتے تھے۔ مثال کے طور پر محمد سعید راہبر (۱۱۳۶ھ – ۱۱۴۲ھ، ۱۷۲۴ء – ۲۵، ۱۷۲۹ – ۳۰ء)
کو پیش کیا جا سکتا ہے جو نواب سیف اللہ کے ساتھ آئے تھے۔ یا میر جعفر علی
بے نوا جو نواب مہابت خاں کاظم کے دور میں اور عماد الملک نواب غازی الدین
خاں فیروز جنگ ۱۱۹۵ھ (۱۷۸۱ء – ۸۲) میں ٹھٹہ پہنچے تھے۔ ان کے علاوہ سید عبد الجلیل
بلگرامی، سید محمد بلگرامی اور میر غلام علی آزاد بلگرامی بھی وقائع نویس کے منصب پر
فائز ہو کر سندھ آئے اور بکھر اور سیوھن میں اقامت گزیں ہوئے۔ یہ سب
کے سب فارسی کے علاوہ اُردو میں بھی شعر کہتے تھے جن کا تذکرہ اس قبیل کے
دوسرے اُردو میں شعر کہنے والے شعرا کے ساتھ میر قانع نے مقالات الشعرا
میں کیا ہے۔ ان لوگوں کی وجہ سے سندھ میں اُردو شعر و شاعری کا ذوق پیدا
ہوا اور پھر سندھ کے قدیم باشندے بھی فارسی اور سندھی کے علاوہ اُردو
میں شعر کہنے لگے۔ جن میں ایک حضرت میر حیدر الدین کامل بھی تھے۔ یہ
اُردو شاعری کا پہلا دور تھا۔ کیونکہ ہندوستان میں بھی اسی دور کو اُردو
شاعری کا دورِ اولین ہی کہا جاتا ہے۔ اس میں ولی، آبرو، ممنون، ناجی
مظہر جانِ جاناں اور حاتم وغیرہ اُردو شعرا تھے۔ اس بنا پر ہم حضرت میر حیدر الدین
کامل کو سندھ کے اولین دور کا شاعر قرار دے سکتے ہیں۔

حضرت میر حمید الدین کاملؔ کا شمار اس دورِ اولین کے اُردو کے قادر الکلام اُردو شعرا میں کیا جاتا ہے اور ان کی شہرت ان کی زندگی ہی میں دُور دُور تک پہنچ چکی تھی۔ میر قانعؔ لکھتے ہیں:۔

"ہر چند[1] اشعار ہندی ایشاں عالمگیر است اما فقیر آنچہ یاد دارد می نویسد، در ایہام ہندی بے مثل، و دُہرہ، و کبت، و نکات غریب و صفات عجیب و سائر اقسام از ایشاں بسیار بہ زبانہاست۔"

اُردو شاعری میں ایہام گوئی کی صنعت شعرائے قدیم اور متاخرین میں بہت زیادہ مقبول رہی ہے، ایہام گوئی لفظی اور معنوی دونوں طرح کی ہوتی ہے، غالبؔ کا یہ شعر:۔

ترے وعدے پر جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

لفظی ایہام گوئی کی بہت اچھی مثال ہے۔ معنوی ایہام کے لیے مومنؔ کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے:۔

یار نے تم کو جاں کہا، سمجھے بھی تم کہ کیا کہا
یعنی کہ بے وفا کہا جان کا اعتبار کیا

حضرت میر کاملؔ کے یہاں بھی ایہام گوئی کی کافی مثالیں ملتی ہیں۔

[1] مقالات الشعرا از میر علی شیر قانع ص ۲۰۳

اس صنعت میں انھیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ پیر حسام الدین راشدی صاحب نے ان کی ایہام گوئی کے بارے میں اپنی تصنیف تذکرۂ امیر خانی میں ایک جگہ لکھا ہے:۔

"آپ[2] کا ایہامی شعر اس دور کے ہندوستان کے ایہام گو شعرا سے کسی بھی صورت میں کم نہیں۔"

ایہام گوئی کے سلسلے میں مثال کے طور پر ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

یار جانا کی بات جانے ہیں
یہ نہ جانے تو پھر جانا کیا

پہلے مصرعہ میں جانے فعل ہے جس کا مصدر جانا ہے، اور دوسرے مصرعے میں جانے فعل ہے جس کا مصدر جاننا ہے۔ اس طرح پہلے مصرعہ میں جانا محبوب کے لیے ہے اور دوسرے مصرعے میں جانا مصدر ہے۔

حضرت میر کاملؔ کے اُردو کلام کی کچھ خصوصیات نمایاں نظر آتی ہیں ایک تو یہ کہ وہ متقدمین شعرائے دہلی کی طرح اپنے ماحول کی عکاسی میں مقامی تشبیہات اور استعاروں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مثلاً محبوب کے رخسار تل ان کو زیادہ بھلا لگتا ہے۔ شمع سے زیادہ مٹی کا دیا ان کو پسند ہے:۔ مثلاً:۔

خالی رخسار پیا چنبا ہے
گال کے کھیت میں اُگا ہے تل

عشق کی آگ جگمگاتی ہے
یہ دیا تیل بات باتی ہے

[2] تذکرہ امیر خانی از پیر حسام الدین راشدی ص ۲۳۵

کیوں نہ وہ دل کے اڑن کھٹولے ہوئے ٭ شوق سوں جس نے چار پر پائے

حضرتِ کامل کے کلام کی دوسری خصوصیات ان کی نازک خیالی، بلند پروازی، سلاست، روانی، جدت اور اچھوتی تشبیہات کا استعمال ہے، ان کے یہاں محاورے، ضرب الامثال اکثر پائے جاتے ہیں۔ استعاروں میں ان کے یہاں ندرت پائی جاتی ہے۔ لب کو لعل سے تشبیہ اکثر متقدمین شعرائے دہلی نے دی ہے۔ حضرت میر کامل نے بھی لب کو لعل ہی سے تشبیہ دی ہے، لیکن جدت اور ندرت کے ساتھ، مثلاً:-

وعدہ ہوئے دروغ جو اس لب سے ہم سنے
یہ لعل قیمتی دیکھو جھوٹا نکل گیا

—۱۰۱—

لبوں دلبر کے میرے قتل پہ بیڑا اٹھایا ہے
خدایا خون سوں میرے تو اس کوں سرخ رو کر

ایک شعر میں آنکھوں کو ہرن سے اور سبزہ خط کو ہری گھاس سے تشبیہ دے کر عجیب نازک خیالی اور ندرت پیدا کی ہے، ملاحظہ ہو:-

خط تیرے کا شوق انکھیاں کا لگا
ہرن کو سبزی بنا چارہ نہیں

ایک جگہ زلفوں کو آنکھوں پر لٹکتا دیکھ کر فرماتے ہیں:-

زلف انکھیاں پہ آن لٹکے ہیں
دام بادام دو دو اٹکے ہیں

سوئے ہوئے محبوب کی تصویر کشی بہتوں نے کی ہے۔ حضرت میر کامل کی تصویر کشی کا بھی لطف لیجئے:-

سو با پڑا ہے کیا رے نازک بدن اکیلا
خوں جوش دے ٹپکتا جامن سے اٹھا دیکھ

حضرت میر کامل کے کلام میں تصوف کے اکثر مسئلوں کی بڑے دلکش انداز میں وضاحت ملتی ہے۔ "وحدت الوجود" اور "ہمہ اوست" کی وضاحت ملاحظہ ہو:

تیرے وصل میں دوجی بات نہیں
سب ہوا بھول ایک بات نہیں

حضرت میر کامل کے دل میں "اہل بیت" سے بے انتہا محبت تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں ان کی منقبت ان کے جذبات عقیدتمندانہ کی عکاسی کرتی ہے:-

لے نقشِ دو سرا میں چرا ہوں
نام تیرا، مدام تیرا ہوں
بھوت ندیاں دکھوں کی تیرا ہوں
آمدد کر لہرتے گھیرا ہوں
یا علی میں غلام تیرا ہوں

حضرت میر کامل نے بابا فریدالدین گنج شکر اور امیر خسرو کی تقلید میں کچھ ایسے اردو اشعار بھی لکھے ہیں جن میں فارسی تراکیب یا پورا مصرعہ ہی فارسی کا شامل کر لیا گیا ہے۔ مثلاً ؎

دے مجھے ساز، بخشش سامانم
رحم کن رحم، از غلامانم

٭

پا شکستہ فتادہ ام در چاہ
میں پڑا ہوں، مجھے اٹھا، یا شاہ

حضرت میر کامل گیارھویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں، اس عہد کے متقدمین شعرائے دہلی اور دکن کی طرح آپ کے یہاں بھی بہت زیادہ قدیم متروک الفاظ اردو کے استعمال کئے گئے ہیں جیسے: سوں، تھی، کوں، ہوت (رہت) ادے گا، بنا دے گا، تو وغیرہ۔ مثلاً:-

دکھ سیں ہو کر دو نیم آیا ہوں | بندہ مسکیں یتیم آیا ہوں
تو بنا دے گا میرا جملہ کاج | ہے ترے پر تمام میری لاج

صوفیا کے یہاں غیر مذہب والوں کی دل جوئی، ان کی مقامی زبان سے دل چسپی بہت زیادہ پائی جاتی ہے، وہ ان کو اپنی شیریں کلامی، اور رواداری کے جذبات سے رام کیا کرتے تھے۔ حضرت میر کامل کے اردو کلام میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔ وہ نہ صرف بہ کثرت ہندی الفاظ استعمال کرتے ہیں بلکہ ان کے مذہبی بزرگوں کا نام بھی عزت سے لیتے ہیں کہ ان کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے۔ وہ رام اور رحیم کو ایک ہی مالک کے دو نام سمجھتے ہیں۔ وہ محبوب کے لیے اکثر رام کا لفظ استعمال کرتے ہیں، مثلاً :-

اس جگت کے دبیر سب دیکھے | خان و سلطان امیر سب دیکھے
ذرہ کوں مہر سوں لگی ہے پیت | شمع کے درشن کا پتنگ اتیت

وہ الف قامت جیو رام ہوئے | رام کے سوجھ الف آرام ہوئے

آپ کا وصال ۱۱۶۴ھ / ۱۷۵۰-۵۱ء میں ہوا۔ میر علی شیر قانع نے تاریخ وفات "اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ جَنّٰت" (۱۱۶۴ھ) سے نکالی ہے۔ آپ کے کچھ اردو اشعار نمونۃً درج ذیل ہیں :-

پیارے لوٹ کے ہمیں ستاتا کیا | ہر گھڑی لڑ کے روس جاتا کیا
پھر سجن پاک سیج چلے ہیں کیوں | بات ہے سچ ہمیں بتاتا کیا
یو جلا کھیل میں یو جاتا ہوں | شمع رو کا پتنگ اڑاتا کیا

یار جاناں کی بات جانے ہیں | یہ نہ جانے تو پھر نہ جانا کیا
دلبری میں سکیچ سو کچھ ناہیں | دل چرانے میں دل چرانا کیا
شمع کہتی جلی جلی بتیاں (تاکل سے) | کاٹنا سر، جلا جلانا کیا
تیغ غمزے کی روز کامل پر | جو بہانا تو پھر بہانا کیا

عشق اب ڈول ہے زلیخا کا | اس سوں آگے ہے چاہ میں یوسف

دوست بخشے گا دوست سب کے سب | گرچہ عاصی ہوں اس کا آسی ہوں

کس کی چوپر پہ اجل ڈھارا نہیں | پیتا رے تو کس کو وہ مارا نہیں

زلفاں کے اگر ساتھ اڑاؤ تو اڑ دل گا | سو بار اگر مار لڑاؤ تو لڑوں گا
کامل ہے غنی ٹھیکری لاکھ لگا دے
کیوں ٹوٹا گھڑا، پھر تو گھڑاؤ تو گھڑوں گا

درد ہے دال سوہ بجاتا ہے | مجھے کچھ درد دال بجاتا ہے

حضرت میر کامل کا اردو کلام گرچہ بہت کم دستیاب ہے لیکن اردو زبان پر جو ان کو مہارت اور قدرت حاصل ہے وہ بہت سے اہلِ زبان

کے لئے قابلِ رشک ہے۔ ایہام گوئی کی صنعت برتنے کے لئے زبان پر عبور اور قدرتِ کاملہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس صنعت کو صرف وہی برت سکتا ہے جو الفاظ کا بادشاہ ہو۔ ایک لفظ کو طرح طرح کے معنی میں استعمال کر دینا کوئی معمولی بات نہیں۔ اور اس صنعت میں حضرت مہر کامل کو کمال حاصل ہے۔ ان کے دستیاب شدہ اکثر اُردو اشعار میں ایہام گوئی کی صنعت پائی جاتی ہے۔ اس بنا پر قیاس غالب ہے کہ انہوں نے اُردو دیوان چھوڑا ہو جو اب تک ہماری نظر سے پوشیدہ ہے۔

---

(۴۲) حضرت عبدالوہاب سچل سرمستؒ

(۱۱۵۲ھ — ۱۲۴۲ھ)
۱۷۳۹-۴۰ء — ۱۸۲۶-۲۷ء

حضرت عبدالوہاب سچل سرمستؒ وادیٔ مہران کے جلیل القدر اور مقبول ترین صوفیائے کرام میں سے گذرے ہیں۔ ایک طرف آپ صاحبِ عرفان ولی، اور بقا باللہ مرشد کے منصب پر فائز تھے تو دوسری طرف ہفت زبان شاعر کی حیثیت سے بھی مقبولِ خلائق تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب انتالیسویں پشت میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ شیخ شہاب الدین فاروقی غازی محمد بن قاسم کے معتمد جاں نثاروں میں تھے اور بغرض جہاد ان کے ہمراہ سندھ آئے تھے۔ فتح سندھ کے بعد آپ کو محمد بن قاسم نے سیہون کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔

اسی فاروقی خاندان کے ایک ولی کامل خواجہ محمد حافظ المعروف بہ سائیں صاحب ڈنہ ضلع خیرپور سندھ کے ایک گاؤں درازا شریف میں قیام پذیر رہ کر تبلیغ دین اور رشد و ہدایت میں مشغول رہے۔ ان ہی کے پوتے حضرت سچل سرمستؒ ہوئے۔ آپ کی پیدائش وہیں درازا شریف میں ۱۱۵۲ھ مطابق ۱۷۳۹ء میں ہوئی۔ آپ کے والد خواجہ صلاح الدین کا ۱۱۵۸ھ میں وصال ہوا جب آپ صرف چھ سال کے تھے یتیم ہونے کے بعد آپ کی پرورش اور

تعلیم و تربیت کی ذمہ داری آپ کے چچا میاں عبدالحق اور دادا خواجہ محمد حا[illegible]
نے سنبھالی۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے حافظ عبداللہ [illegible]
صدیقی سے قرآن پاک حفظ کیا۔ پھر علوم ظاہری اور باطنی کے لئے آپ نے
اپنے چچا عبدالحق قدس اللہ سرہٗ سجادہ نشین درگاہ شریف درازا کے سامنے
زانوئے شاگردی تہہ کیا، جو اپنے وقت کے جید عالم اور مرشدِ کامل تھے۔
اور پھر ان ہی سے مرید ہو کر طریقت، حقیقت اور معرفت کے مراحل طے کئے۔

حضرت عبدالحقؒ کو اپنے بھتیجے عبدالوہاب سے بہت زیادہ محبت تھی۔
وہ ان کو پیار سے، برابر سچو کہا کرتے تھے۔ بعد میں حضرت عبدالوہاب نے اپنے
مرشد اور مربی کے اس خطاب کو اپنا تخلص قرار دیا، اور سچل سرمست کے نام سے
ادبی اور روحانی دنیا میں مشہور ہوئے۔ حضرت سچل سرمست کو بھی اپنے استاد،
پیر اور مربی سے بے انتہا عقیدت اور محبت تھی۔ وہ ذاتی طور پر ازدواج کی پابندی
کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن اپنے مرشد کی رضا جوئی میں انھوں نے اُن کی
صاحبزادی کو اپنی زوجیت میں لینا قبول فرمایا جو دو سال کی رفاقت کے بعد
بغیر اولاد کے خدا کو پیاری ہوئیں۔

حضرت سچل سرمست بچپن ہی سے بہت بردبار، اور خاموش طبع اور
تھے عیش و آرام سے دُور رہتے، ذکر و فکر اور عبادت و ریاضت میں اپنا زیادہ
وقت صرف کرتے۔ خداداد ذہانت کا یہ عالم تھا کہ چودہ برس کے سن میں تمام
علوم ظاہری کی تکمیل کرلی۔ خلوت نشینی اور کتب بینی آپ کو بہت مرغوب
خاطر تھی۔ شیخ محی الدین ابن عربی، خواجہ فریدالدین عطار اور دوسرے صوفیائے

عظام کی تصانیف کا بغور مطالعہ فرماتے، سماع کے شائق تھے، اور کسی ساز کے
چھیڑتے ہی بےخود اور سرمست ہو جاتے۔ آخر میں آپ پر جذب و سرمستی کی
کیفیت بہت زیادہ طاری رہنے لگی تھی لیکن اس حالت میں بھی شریعت کے
احترام اور درویشوں کی رضاجوئی کو پیش نظر رکھتے۔

حضرت سچل سرمست کی شبیہہ مبارک کا نقشہ سبطین اثر صاحب نے
اس طرح کھینچا ہے[1]:-

"اونچی پیشانی، کتابی چہرہ، ستواں ناک، گورا رنگ، گیسو دراز بر
[illegible]یں سفید رنگ کا کرتہ، موٹے کپڑے کا سفید تہہ بند، پاؤں میں مخصوص
سفید جوتیاں اور فرق مبارک پر سبز رنگ کا قلندری تاج، جوانی
کو رخصت کر کے خندہ پیشانی سے پیری کا استقبال کرنے والا یہ
بزرگ آخری دم تک بالوں پر خضاب لگانے سے بے نیاز رہا۔"

طریقت کی چار منزلیں ہیں (۱) فنا فی الشیخ (۲) فنا فی الرسول (۳) فنا فی
[illegible] اور (۴) بقا باللہ یعنی قطرہ کا سمندر بن جانا۔ یہ آخری اور اعلیٰ ترین منزل
[illegible] جو اللہ اپنے مخصوص بندوں ہی کو عنایت فرماتا ہے ع

"ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را نہ دہند"

حضرت منصور[2] اور سرمد شہید[3] کے بعد حضرت سچل سرمست کی بھی

---

[1] رسالہ سچل سرمست مطبوعہ محکمہ اطلاعات حکومت سندھ خیرپور ڈویژن ۱۹۵۹ء صفحہ ۶۹
[2] منصور: ابوالمغیث الحسین الحلاج بن منصور بن محمد بیضاوی ۲۴۴ھ میں مضافات بیضا

رسائی اس منزل تک ہوئی تھی جیسا کہ آپ نے ایک سندھی شعر میں فرما[یا]

ایہا امانت عشق جی
ناں میسر ملکن

(یعنی عشق کی امانت جو سچل کو ودیعت ہوئی ہے وہ فرشتوں کو بھی نصیب نہیں [ہے])

(بہ سلسلہ ما سبق) (فارس) طور میں پیدا ہوئے اور ۲۴ ذیقعدہ ۳۰۹ھ میں انہیں دار...
گیا، اور ان کے جسم کو جلا یا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اصل میں حلاج نہ تھے، ایک روز رو[ئی]
کے انبار پر سے گذرے، اور انگلی سے اشارہ کیا تو بنولے اور روئی علٰحدہ علٰحدہ ہو گئے۔ اسی د[ن]
سے ان کو حلاج کہنے لگے (رنٹ لرٹے مقالات الشعرا مرتبہ سید حسام الدین راشدی ص ۲۳...)

[5] سرمد: ابتداً یہودی تھے، بعد میں اسلام قبول کیا، ملا صدرا اور میر ابوالقاسم [سے]
حکمت و فلسفے کی تکمیل کی ۱۶۳۱ء (۴۲-۱۰۴۱ھ) میں ٹھٹہ آئے، شیخ بہاء الدین
اور محمد باقر کے پاس قیام کیا، اور یہیں عشق مجازی میں مبتلا ہوئے اور دیوانگی تک
نوبت پہنچی ۱۰۴۴ھ میں اپنے محبوب کو ساتھ لے کر ٹھٹہ کو خیرباد کیا اور بادیہ پیمائی
کردی، وہ کبھی لاہور میں اور کبھی حیدر آباد میں نظر آتے ہیں، حیدر آباد سے دہ[لی]
آئے جذب و مستی کی یہ کیفیت تھی کہ برہنہ رہتے تھے دہلی میں ان کی ایک ربا[عی]
ان کی عریانی اور برہنگی، اور ان کا یہ فقرہ "شیطان قوی ست" کا فقرہ ملا قوی و
القضات اور عالمگیر کی نظر میں قابل اعتراض ٹھہرا اور ۱۰۷۰ھ میں قاضی القضا[ت]
کے فتوے پر عالمگیر کے حکم سے جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں کے بالمقابل جانب
قتل کیے گئے اور وہیں مدفون ہوئے۔ یہ واقعہ منصور کے دار پر چڑھائے جانے کے بعد
کے بعد پیش آیا (سرمد۔ تالیف نقی محمد خان خورجوی و مقالات الشعرا)

اپنے ایک فارسی شعر میں آپ نے اس کو اور زیادہ کھول کر بیان فرمایا ہے:-

ہر کجا ہم جا بجا ہم من خدایم من خدا
تا چہ شد پوشیدہ ام از درد ایں خاکی قبا

یہی وجہ ہے کہ آپ کو شہنشاہ عشاق اور منصور ثانی کہا جاتا ہے۔

حضرت سچل سرمست سندھی، سرائیکی، ملتانی، فارسی اور اردو کے قادر الکلام شاعر تھے۔ فارسی میں آشکارا اور فدائی اور بقیہ زبانوں میں سچل، سچیڈنو اور سچو تخلص فرماتے تھے۔ شاعری میں آپ کا مخصوص موضوع وحدت الوجود، اور تصوف کے دوسرے رموز و نکات کی تشریح ہے۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی تقلید اور تتبع میں سسی پنوں، عمر ماروی، مومل رانو، سوہنی مہینوال، اور نوری جام تماچی پر خوب خوب کافیاں کہی ہیں، اور ان کرداروں کو ادبی دنیا میں غیر فانی بنا دیا ہے۔ سندھی شاعری میں آپ مرثیے کے بانی کہے جاتے ہیں۔ سندھی شاعری میں مرثیے کی موجودہ شکل آپ ہی کی رہین منت ہے۔ سندھ میں ایک شاعر بھی ایسا نہیں ملتا جس نے مختلف زبانوں میں اتنا زیادہ کلام چھوڑا ہو مرزا قلیچ بیگ کی تحقیقات کے مطابق آپ کے نو لاکھ چھتیس ہزار چھ سو چھ ابیات موجود ہیں۔[1] قاضی علی اکبر اور الیس بخت صاحب نے اپنے مضامین میں حضرت سچل سرمست کی مندرجہ ذیل ہشت کتابوں کی نشان دہی کی ہے۔[2]

---

[1] رسالہ سچل سرمست مطبوعہ ۱۹۷۰ء محکمہ اطلاعات و نشریات حکومت سندھ خیرپور ڈویژن ص ۴۷
[2] رسالہ سچل سرمست ص ۴۸ - ۶۱

(۱) سنارھی وسہرا گیکی کافیاں اور دوہے، (۲) مرغی نامہ سندھی، (۳) قتل نامہ سندھی، (۴) وحدت نامہ سندھی، (۵) جھولنا اور گھڑولیاں، (۶) سندھی مرثیہ (۷) دیوان آشکارا فارسی، (۸) راز نامہ فارسی، (۹) وحدت نامہ فارسی، (۱۰) رہبر نامہ فارسی (۱۱) گداز نامہ فارسی، (۱۲) وصلت نامہ فارسی، (۱۳) تار نامہ فارسی (۱۴) ساقی نامہ فارسی، (۱۵) بحر طویل فارسی، (۱۶) اُردو غزلیات، (۱۷) دیوان خدائی، (۱۸) مثنوی عشق نامہ، (۱۹) مثنوی درد نامہ، (۲۰) نکتۂ تصوف۔

ان کتابوں میں سے دیوان آشکارا فارسی کو جیسا کہ قاضی علی اکبر صاحب نے اپنے مضمون[1] میں لکھا ہے، پہلی مرتبہ میر علی مراد خاں تالپور والی ریاست خیرپور نے شائع کرایا تھا، اور دوسری مرتبہ ام۔ ڈی۔ لالا صاحب نے بقیہ تمام فارسی کتابوں کو خود قاضی علی اکبر صاحب نے اپنے خرچ سے طبع کرایا ہے، اور وہ سب ان کے پاس موجود ہیں۔

حضرت سچل سرمست کے حضور مختلف بزرگوں، ادیبوں اور شعرا نے مختلف اوقات میں عقیدت کے پھول نچھاور کیے ہیں۔ میں ان میں سے کچھ کو چن کر اس جگہ پیش کرتا ہوں[2]۔ حضرت بیدل فقیر فرماتے ہیں:۔

منجھہ سخن تسبیحی الوھیت سندو آثار ھو
جنگ جذبی جوش مستی، مثل عطار ھو

(یعنی) آپ کا کلام الوہیت کے آثار سے بھرپور ہے اور جذباتی کشمکش، جد و جہد،

---

[1] رسالہ سچل سرمست مطبوعہ ۱۹۵۸ء صفحہ ۱۶
[2] رسالہ سچل سرمست مطبوعہ ۱۹۵۸ء صفحہ ۴۸-۵۸

جوش اور مستی کے لحاظ سے خواجہ فریدالدین عطار کے کلام کی طرح ہے[1]۔

مخدوم اللہ بخش عباسی مؤلف "تذکرہ مخادیم کھڑا" رقم طراز ہیں:۔

"سچل سائیں پر ہمیشہ عشق آلہی کا غلبہ ہوتا تھا اور حال میں آ کر کلام کہتے تھے"

مرزا قلیچ بیگ لکھتے ہیں:۔

"آپ کا کلام تصوف کے اصولوں پر مشتمل ہے اور مضمون محض معرفت اور حقیقت کی بابت ہے"۔

جناب محمد صدیق میمن مؤلف سندھی ادبی تاریخ لکھتے ہیں:۔

"سچل سرمست دین اور بے دینی، کفر اور اسلام کے درمیانی پردے عشق حقیقی کی آتش سے پھونک دیتے تھے"۔

جناب رحیم داد خاں مولائی شیدائی کا خیال ہے کہ:۔

"سچل کا کلام معرفت کی شراب ہے جس سے دل مست ہو جاتا ہے"

شمس العلما ڈاکٹر داؤد پوتہ کی رائے ہے کہ:۔

"آپ کا کلام عین بے باکی کا آئینہ ہے اور اس سے رندی اور مستی اجاگر ہو رہی ہے، ایسا لگتا ہے جیسے وجد میں آ کر رقص کرتے ہوئے آپ نے شاعری فرمائی ہے، اور ذوق سے قارئین کے دل پر بھی ایسی ہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے"۔

رحیم بخش میمن لکھتے ہیں:۔

"سچل کا کلام توحید اور معرفت آلہی کا بے نظیر خزانہ ہے"۔

رشید احمد لاشاری کا خیال ہے کہ:۔

"آپ کا کلام عشق و محبت کی سرمستیوں اور تصوف کی باریکیوں سے معمور ہے"

قاضی علی اکبر صاحب فرماتے ہیں کہ :-

"سچل سرمست کا کلام سراپا الہام محبت و سوز، درد و گداز، کیف و حال، جذب و جلال، موج و مستی کے فلسفہ کا ایک بھرپور گنجینہ ہے جو بے خودی، وجد اور جذب و سرمستی کے عالم میں کہا گیا ہے۔"

جناب سبطین اثر صاحب لکھتے ہیں :-

"سچل سرمست وادیٔ مہران میں ایک عظیم المرتبت شخصیت گذری ہے جن کی ذاتِ گرامی بے شمار صفات سے مزین تھی۔ ولائت میں دیکھو تو کرامت کا سرچشمہ، تصوف کا یہ عالم کہ عالمِ بے ثبات آنکھوں میں نہیں سماتا، علم و فضل میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا رواں دواں، معرفت کا یہ حال کہ وارفتگی میں بے حال نظر آئیں، دنیا کے ہر وجود کو واجب الوجود میں دیکھیں اور انا الحق کا نعرہ بلند کریں۔ شاعری میں زبان کھولتے ہیں تو موتیوں میں تولنے کے قابل کلام۔"

تمام صوفیائے کرام کی طرح حضرت سچل سرمست نے بھی شاعری شہرت اور نام و نمود کی خاطر نہیں کی۔ عوام چونکہ نثر سے زیادہ شاعری کو دل نشین کرتے ہیں اور وہ دوہے اور مثنویوں سے بہت زیادہ اثر اور نصیحت قبول کرتے ہیں۔ اس لئے حضرت سچل سرمست نے بھی شاعری ہی کو اپنے خیالات کے اظہار اور تعلیمات کا ذریعہ بنایا، ورنہ وہ شعر گوئی اور اُس کی تعلی کو ذرا نہیں پسند فرماتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"وڈ چڈ ین تہ وڈای جا شعر جوڑ چرنا ہی نقیری"

(یعنی) شعر گوئی باعثِ شہرت و تکبر ہو تو اس شہرت اور تکبر کے سایہ دار درخت کو کاٹ کر پھینک دے۔ شعر گوئی میں فقیری نہاں نہیں ہے"۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کے اشعار میں تعلیمات ہی تعلیمات پائی جاتی ہیں۔ ان کے ذریعہ انھوں نے بھٹکوں کو راہ راست پر لانے، سلوک و تصوف کے رازہائے سربستہ سے پردے ہٹانے اور نفی و اثبات، فنا و بقا، ذکر و فکر، حال و قال، ہمہ اوست اور وحدت الوجود جیسے دقیق اور نازک مسائل کو کمال چابک دستی سے سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ خود فرماتے ہیں :-

این سخن کہ شعر باشد اے پسر این ہمہ ذکر است آیات و خبر

نامہ می گویم تو با حکم او سرہا اسرارہا اندرو

یار گوید باز گو از مثنوی چند ابیات از سر معنوی

این سخن عشق است نے از شاعری ست کے خساں دانند این اشعارہا

حضرت سچل سرمست حبِ الٰہی اور عشقِ رسول میں سرشار تھے اور اس کا اظہار بار بار انھوں نے اپنے فارسی اردو اور سندھی کلام میں کیا ہے۔

عاشقم بر اسم محمد مصطفےٰ در دلم جا گیر نامِ مرتضےٰ

لطف بر ما کرد سید المرسلین　　　　کرد مارا از گروہ عاشقین

از سر وحدت مارا آگاہ کرد　　　　من گدا بودم ولے مارا شاہ کرد

حضرت سچل سرمست کو صوفیائے کبار میں حضرت مولانا روم اور خواجہ فرید الدین عطار سے بڑی عقیدت تھی، خاص کر خواجہ فرید الدین عطار سے انھوں نے کافی روحانی فیض حاصل کیا ہے، لکھتے ہیں :-

"اے دلا! خوشبو خوشتہ عطار در جانم رسید"۔

ایک اور جگہ خواجہ صاحب کے وطن سے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں :-

"اے صبا! با ما حقیقت شہر نیشاپور کن ؛

می کنم قربان بر آں خاک زمیں ایں جان و تن"

حضرت سچل سرمست کی مادری زبان سندھی تھی، زیادہ تر ان کو سندھی بولنے والوں سے ہی سابقہ پڑتا تھا، اسی لیے زیادہ تر ان کا کلام سندھی میں ہے۔ لیکن صوفی زبان اور مقام کا پابند نہیں ہوتا، وہ سارے جہان کے لئے ہے اور سارا جہان اس کا ہوتا ہے۔ اس کے یہاں صوبائیت اور نسل و رنگ کے امتیاز کی مطلق گنجائش نہیں ہوتی۔ دنیا کا ہر انسان چاہے وہ کسی ملک کا ہو یا کسی مذہب کا اس کی ہمدردیوں کا مستحق ہوتا ہے، انسانیت اور محبت میں اس کا اصل مذہب مضمر ہے۔ چنانچہ انھوں نے پیغام حق پہنچانے اور اخلاق و دین کی تعلیمات کے لئے مختلف ملکوں اور صوبوں

میں بولی جانے والی زبانوں کو اختیار کیا۔ ان کے یہاں سندھی کے علاوہ اُردو میں بھی کافی اشعار ملتے ہیں جن کو پڑھکر اُن کی اُردو زبان پر قدرت اور مہارت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

سندھ میں حضرت سچل سرمست کا وہی عہد تھا جو دہلی اور لکھنؤ میں میر حسن، میر تقی میر، مرزا سودا، جرأت، انشا، مصحفی، نظیر اکبرآبادی، اور سعادت یار خاں رنگین کا تھا۔ حضرت سچل سرمست اپنے معاصرین کے درمیان خیالات کی بلندی، تصوف کی ہمہ گیری، جذبات کی گہرائی اور قدرت زبان کے لحاظ سے ہرگز کسی سے کم نہ تھے۔ لیکن دہلی اور لکھنؤ کا کام چونکہ اُردو زبان کے مختلف سانچوں کو کاٹ چھانٹ کر، بنا سنوار کر حسین اور دلکش بنانا تھا اس لیے وہ دوسرے علاقوں کی زبان سے زیادہ صاف ستھری اور نکھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے سندھ، دکن، اور بہار میں صوفیاء ان کو اپنے اصلی رنگ میں پیش کر دیتے تھے، اور ان پر مقامی اثرات بہت نمایاں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جن شعرا کو دہلی اور لکھنؤ میں قیام کے مواقع مل جاتے تھے اُن کی زبان میں نسبتاً زیادہ صفائی اور نکھار آ جاتا تھا۔ چنانچہ راسخ عظیم آبادی اور ولی دکنی کے اشعار بہار اور دکن کے دوسرے شعرا سے زیادہ صاف اور شگفتہ نظر آتے ہیں، ورنہ معنویت اور جذبات کی گہرائی میں اس دور کے سندھی اردو شعرا کسی طرح پیچھے نہ تھے۔ مثال کے طور پر تشبیہہ و استعارات کو لیجیے، محبوب کی زلفوں کی توصیف اکثر شعرا نے کی ہے اور طرح طرح کی تشبیہیں استعمال کی ہیں لیکن سچل سرمست

کی سادگی میں کچھ اور ہی لطف ہے :-

میں اژدہا تھا سمجھا، دیکھی جو زلفِ پیچاں

رُخ پر لٹک رہی تھی، بیدرد زلف کالی

حضرت سچل سرمست کا عشق حقیقی ہے، ان کے یہاں سپردگی اور شوق کا عجیب انداز ہے۔ عام شعرا محبوب کو قاتل، صیاد اور دشمن کہہ کر مخاطب کرتے ہیں لیکن حضرت سچل کا اپنے محبوب کے بارے میں کچھ اور ہی نظریہ ہے :-

اُس دوست سے میں کیسے کروں شکوہ اے سچل

زخمی کیا جگر تو دوا بھی پلا گیا

اب ذرا سپردگی کا انداز ملاحظہ ہو :-

کیا ہے دل پہ مرے عشق نے قیام اپنا　　تمام نفل و فرائض کو اب سلام ہوا

کیوں سہو کا سجدہ کرے وہ، عشق ہے جس کا امام

دم بھر بھلانا دوست کو، نے عاشقوں کا کام ہے

منصور ہو یا سرمد ہو صنم، یا شمس الحق تبریزی ہو

اس تیری گلی میں اے دلبر، ہر ایک کا سر قربان ہوا

دہلی کے صوفی شاعر خواجہ میر درد کے کلام کی جھلکیاں آپ کو حضرت سچل سرمست کے یہاں اکثر جگہ نظر آئیں گی، زبان اور اندازِ بیان کا کچھ فرق ضرور ہے لیکن نفسِ مضمون اور روح میں کوئی فرق نہیں، مثلاً :-

کنے کا تیرا مجھکو ہے انتظار ہونا　　رُخ دیکھنے کو تیرے دل بیقرار ہونا

اس دل میں درد نے ہی کیا شور و شر مچایا　　فرقت میں تیری رونا ہے بار بار ہونا

سُولی پہ چڑھ رہا تھا منصور دردِ غم سے　　پی کر شراب مستی خونی خمار ہونا

دیدِ یار سے عاشق کے چہرے پر وقتی مسرت اور رونق جو آجاتی ہے اس کا نقشہ غالب نے اس طرح کھینچا ہے :-

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنھ پر رونق

وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

حضرت سچل سرمست نے غالب سے بہت پہلے اس کو یوں ادا فرمایا ہے :-

اے دوست تو آتا نہیں میری شفا کے واسطے

اِس درد میرے کی دوا آنا ترا اِک پل ہوا

حضرت سچل سرمست کی سندھی شاعری میں تو مختلف اصناف ملتے ہیں لیکن اُردو میں انھوں نے صرف غزل ہی کو منتخب کیا، اور اسی میں انھوں نے تصوف اور فلسفۂ زندگی کے جملہ رموز و نکات کو آشکارا کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ فنا و بقا، شاہد و مشہود، جذبۂ عشق، معرفت و بے خودی، مقامِ لاہوت، اور جمالِ ازلی کے سارے اسرار کو انھوں نے اپنی اُردو شاعری میں اس طرح کھول کر بیان کیا ہے کہ سُننے والوں پر بھی وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ طریقت کی چوتھی منزل بقا باللہ کی وضاحت اِس طرح فرماتے ہیں :-

فنا کی بات باطل ہے اگر تو ہم سے سچ پُوچھے

خدا ہے تو بقا باللہ، نہ ہرگز تُو فنا ہوگا

جذبۂ عشق کے اظہار میں حضرت سچل سرمست کی بے باکی، بے خوفی، جوش،

دولولہ، اور جنون و مستی، حدِ انتہا تک پہنچ جاتی ہے۔ مثلاً:-

عشق ہی امام میرا دیگر امام کیا ہے　　میخانہ میں بنا ہوں اک جرعہ جام کیا ہے
جس جا ملائکوں نے تجھ کو سلام کیا　　کہہ قاضیا ہمیں سے اس جا سلام کیا ہے

پکڑ کر تیغِ لاہوتی میں میدان آؤں گا　　گلی اب چھوڑ دلبر کی طرف دیگر نہ جاؤں گا

بے چارا اک تپش ہے آشفتہ اس صنم کا　　کتنے ہوئے ہیں حیران دیکھ جنبش لازوالی

ابرو کمانِ دلبر، مژگاں خدنگ خنجر　　ہم نے انھوں کے آگے سینہ سپر کیا ہے
آتی ہے بے نیازی دلبر نہ کر سچل سے　　اُس کی گلی میں تم نے اکثر گذر کیا ہے

"ہمہ اوست" اور "وحدت الوجود" تصوف کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ حضرت سچل سرمست نے اپنے مخصوص انداز میں اس کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے:-

ہو الاول، ہو الآخر، ہو الظاہر ہو الباطن　　یہاں بھی وہ وہاں بھی وہ سچل پھر تو کجا ہوگا

دوئی کا دین باطل کر نکل باہر مذاہب سے　　حکم یہ ایک ایک کا ہر جا میں چلاؤں گا

حضرت سچل سرمست کے یہاں تصوف اور معرفت کے علاوہ وارداتِ عشق کی تصویر کشی بھی ملتی ہے، ہجر و وصال کا کیف، انتظار کی گھڑیاں، عشق

کی بے تابیاں، معشوق کی بے اعتنائیاں، اگر کوئی دیکھنا چاہے تو ان کے اردو کلام کو دیکھے۔ ہجر اور انتظار کا سماں ملاحظہ ہو:-

آتش لگائی جاں سوں فریاد یہ فریاد ہے　　مرتا ہوں تیرے ہجر میں سوز کی صمصام ہے
تیرے ہجر میں پیارے روتا ہوں زار زار　　وعدے نے تیرے ہم کو اب منتظر کیا ہے

اب ذرا معشوق کی بے اعتنائی کا شکوہ بھی سن لیجیے:-

کس سوں میں کہہ سناؤں میرا یار ہے خیالی
مرا حال پوچھتا نہیں، ہے اصل لا اُبالی

اب حکیم محمد صادق رانی پور کی کتاب "سچل سرمست جو سرائیکی کلام"[1] اور ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ کی کتاب "سندھ میں اردو شاعری" سے کچھ اردو اشعار

---

[1] سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۵۹ء میں حکیم محمد صادق رانی پوری کا ترتیب دیا ہوا "سچل سرمست جو سرائیکی کلام" شائع کیا تھا۔ اس کے آخر میں حضرت سچل سرمست کی پچاس اردو غزلیں بھی شامل کردی گئی ہیں۔ جناب قاضی علی اکبر درازی نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ ان اشعار میں سے بعض اشعار کے اصل قدیم اردو الفاظ کو حکیم صادق صاحب نے متروک سمجھ کر اس کی جگہ نئے الفاظ بدل دیے ہیں۔ بلاشبہ اصولِ تحقیق کی بنا پر یہ بڑی غلطیوں میں شمار کیا جاتا ہے محققین کے لیے اس میں کچھ دشواریاں ہوجائیں گی لیکن اردو ادب کے شیدائی حکیم محمد صادق صاحب کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتے کہ انھوں نے حضرت سچل سرمست کے کچھ اردو کلام کو ضائع ہونے سے بچالیا۔ اب یہ دوسرے محققین اور ادیبوں کا کام ہے کہ حضرت سچل سرمست کے بقیہ اردو کلام کو بھی جو مختلف خاندانوں کے ذاتی کتب خانوں میں پڑا ہوگا پیش کرکے اردو زبان و ادب کی خدمت بجالائیں۔

بہ طور نمونہ درج ذیل ہیں، جن سے حضرت سچل سرمست کی اُردو غزل گوئی کے بنیادی مزاج اور اسلوب بیان کا پتا چلے گا۔ پھر یہ بھی اندازہ ہوگا کہ انھوں نے زبان کے سلسلے میں کن باتوں کو روا رکھا ہے۔ معنوی لحاظ سے بھی ان کے صوفیانہ رنگ پر بڑی وضاحت سے روشنی پڑے گی۔ تصوف، معرفت اور بعض فلسفیانہ نکتوں کی وضاحت وہ کس انداز سے کرتے ہیں، یہ بھی مکمل طور پر سامنے آجائے گا:۔

مری آنکھوں نے اے دلبر عجب اسرار دیکھا تھا
میانِ ابر اس خورشید کا انوار دیکھا تھا

جلایا طورِ سینا کو تھا جس نورِ تجلی نے
ترے کوچے میں اس انوار کو اظہار دیکھا تھا

عذر حاصل ہوا تھا جس جگہ ان علم والوں کو
وہاں میں نے وہی نورِ مبیں اظہار دیکھا تھا

مرا تو کام تھا اس ہادی و رہبر کی صورت سے
اسی صورت کا میں نے ہر جگہ دیدار دیکھا تھا

جما ہے میں یہ ہر جا جس طرح سورج کی یہ کرنیں
بہ ہر مظہر اسی انداز سے انظار دیکھا تھا

جو آیا تھا وہاں سے ایک بار اس بزمِ رنداں میں
نہ اس مدہوش کو ہم نے کبھی ہشیار دیکھا تھا

کہا اک بار اس نے بالیقیں کلمہ انا الحق کا
روا اسرار میں منصور کو بردار دیکھا تھا

کنارہ تھا نہ جس کا تو سچل اس بحر میں آیا
نگوں سار اس میں ہر اک طالب دیدار دیکھا تھا

فرقت میں تیری رونا دن رین مجھ کو حاصل
حبل الورید سے بھی میں بے خبر ہوا ہوں

امید لطف کی ہے تجھ سے ہی عاشقوں کو
لا تقنطوا من رحمہ میں بے خطر ہوا ہوں

سمجھا تھا دور میں نے لیکن نہ دور ہو تم
ترے کرم سے جاناں میں در نظر ہوا ہوں

کعبہ کنشت اب دور ہے منزل تو میری اور ہے
بدنام ہوں بدکار ہوں صورت میں گر انسان ہوں

ہنسنا کبھی، رونا کبھی، راضی کبھی تدبیر پر
تسبیح کی خواہش نہیں، زُنّار پر خنداں ہوں

نے وِرد خواں نے متقی، زاہد نہ میں عابد بنا
مجنوں ہوں، مفتوں ہوں، دیوانہ ہوں، مستان ہوں

قاضی نہیں، مفتی نہیں، مُلّا نہ میں ہوں محتسب
میں ملحد و کافر نہ ہوں، نے صاحبِ ایمان ہوں

صورت بشر کی ہے مری ظاہر گدا گر ہوں بنا
باطن کو پہچانے مرے سلطان ہوں، سلطان ہوں
سجل نہ میرا نام ہے وہ نام میرا پاک ہے
میں خود سراپا عشق ہوں ہم گوئے ہم چوگان ہوں

مو تو امیں ہے بشارت اس عشق کی اشارت مرنے میں ہے صفائی پاؤگے تم حیاتی
موجو فنا بقا میں اس حسن مہ لقا میں حق کی قسم تو حق ہے بن جا تو ذات ذاتی
اس شمع پہ پتنگے آئے ہیں کیا اُچھل کر ترسیں گے وہ نہ ہرگز جن کو ملی مماتی
منصور کا یہ قصہ معراج ہے سراسر سولی پہ دیکھ لے تو اثبات میں ثباتی
سمجھا سجل نے بے شک مجھ میں ہے حق سمایا جب سے ہے دل لگا یا دوئی رہی نہ جاتی

مجھ کو ترا جادو لگا، نا صبر، نا آرام ہے تیری طرف سے اے صنم، نا خط ہے نا پیغام ہے
آتش لگا کی جان سوں فریاد پر فریاد ہے مرتا ہوں تیرے ہجر میں سر سوز کی صمصام ہے
اس حال اپنے کی خبر کس کو سناؤں اے سجن جنجال ہے یہ زندگی مرنے میں میرا کام ہے
آخر یہ مطلب پالیا مرشد نے ہم سے یہ کہا بن عشقِ دلبر کے سجل کیا کفر کیا اسلام ہے

آؤ سنو لے یارو ہے عشق انتظاری آرام نہیں ہے پل بھر ہر دم ہے بے قراری
کیا خویش کیا قبیلہ سب سے جدا ہوا ہوں میں بھی اٹھایا سر پہ برہے کا بوجھ بھاری

سنورے، آج سر پر میرے برہ باران آیا ہے
کرم کر کے صدف اوپر ابر نیسان آیا ہے

یہ کہا معشوق نے مورکھ برہ سے بے خبر ہاتھ میں تلوار ہے تیرا کہاں تن من ہوا

بنا کر آدمی صورت سراسر خود خدا ہوگا کبھی یونس، کبھی یوسف، کبھی وہ مصطفےٰ ہوگا

بر کے در پہ میں تو دیوانہ ہو رہا ہوں یارو میں دو جہاں سے بیگانہ ہو رہا ہوں
نے کو تیرے دلبر میں منتظر ہوا ہوں بے زر غلام تیرا میں سر بسر ہوا ہوں
نی ندر اس میری فریاد میرے گل کو اس واسطے سجل میں چھوڑوں نہیں پکاروں

کو فنا کرے گی جاناں تری جدائی فرقت میں تیری در در کرتا ہوں میں گدائی

کو خبر نہیں ہے اس عشق کی اے یارو جو شخص ہے یہ کہتا معشوق بے وفا ہے
ں سے تونے مارا عشاق کو اے ظالم خوں ریزی غریباں شاہد تجھے روا ہے
ے ہی نام کا میں ہر دم رہوں گا عاشق روزِ ازل سے سجل در کا ترے گدا ہے

ے ہی ناز سے آنکھوں کے میں غلام ہوا ترا ہی عشق مرا پیشوا امام ہوا
ں میں کس کو بھلا اپنے حال سے آگاہ ترے ہی درد سے قصہ مرا تمام ہوا

ترے غرور کا چرچا ہوا زمانے میں — سب ہی نے گوش میں دیں انگلیاں، یہ کام ہوا

ہے غنیمت مجھ کو یارو دوستی دلدار کی — کیوں نہ بیگانہ رہوں جب یہ جہاں فانی ہوا

ہاتھ پہ لالی لگائی آج کیا درشن ہوا — زلف پہ جیرا ہوا، سر پہ گل سوسن ہوا

برحلہ ہے سب مشکل بازی کون رہے ہاتھ لگائے گا
جس نے ہاتھ لگایا اس کو، سارا ہوش گنوائے گا

کیا کہوں میں جو مرا کوئی اختیار نہیں — ہائے رے آج مرے پاس وہ دلدار نہیں
نبض کو دیکھ کے مایوس فلاطوں بھی ہوا — کہہ دیا صاف کہ یہ مست تو ہشیار نہیں
تجھ کو درد نہیں یار نے سچل سے کہا
میں نے رو رو کے کہا، تجھ کو اعتبار نہیں

بلبل کو برہ پہنچا، آئی ہے رت بہاراں — فریاد وصل اس کی ہے مثل بیقراراں
میں نے یہ اس سے پوچھا عاشق ہے تو گلوں کا — یہ وصل ہو یا فرقت روتا ہے زار زاراں
منقار ہے گلوں پہ پھر بھی ہیں لاکھ نالے — یہ کیا سبب ہے آخر حاصل ہیں گل ہزاراں
بلبل نے یہ بتایا اے عشق سے بے بہرہ — اس باغ میں نہیں ہے میرے لئے نگاراں
آئی نہ راس میری فریاد میرے گل کو — اس واسطے سچل میں چھوڑوں نہیں پکاراں

آیا وہ یار آیا، کہتا ہوں حمد للہ — رخ دوست نے دکھایا کہتا ہوں حمد للہ
اس حال ناتواں کی پرسش بہت تھی اس کو — مجھ کو گلے لگایا، کہتا ہوں حمد للہ
غفلت کے خواب اندر دن رین میں پڑا ہوں — برہے نے ہے جگایا، کہتا ہوں حمد للہ
معشوق کی نگہ سے دل خوش ہوا ہے میرا — فرقت کا غم ہٹایا، کہتا ہوں حمد للہ

کرتا ہوں اے سر سخن اس باب شکر للہ — اس برہ نے کیا ہے بیتاب، شکر للہ
تیرے جو مین دیکھے حیرت میں پڑ گیا ہوں — تو نے کیا ہے مجھ کو بے خواب، شکر للہ
کیا ورد کیا وظائف، کیا قول کیا یہ پارے — بھولا ہوں شد و جزم و اعراب، شکر للہ
وحدت کا اڑ کے آیا شہباز دل پہ میرے — اب مٹ چکے ہیں سارے آداب، شکر للہ
ظاہر ہو یا ہو باطن اندر ہو یا ہو باہر
سچل سیر دیتے ہے ہر باب شکر للہ

آنکھوں میں اس کی کاجل ہاتھوں پہ اس کے لالی — بیتا ہے خوب بھر بھر وہ جام پر لگالی
دیکھو اے دوستو تم کیا خوب دل ربا نے — اس دل کو لوٹنے کی ترکیب ہے نکالی
کر کے وہ ناز و عشوہ عشاق میں ہے آیا — مدہوش ہو رہا ہوں دیکھو یہ جیت جاتی
بیچارہ اک نہیں ہیں آشفتہ اس صنم کا — حیراں ہوئے ہیں لاکھوں کیا حسن لا یزالی

یہ ناؤ نوش نوشاں مجروح کی دوا ہے — عشاق کے لیے تو یہ اصل سے شفا ہے
یہ ہے طریق مشکل آساں نہ اس کو سمجھو — اس عشق میں اے یارو صد جور صد جفا ہے
سر کی نہ کر تمنا گر راہِ عشق پوچھے — یہ قتل عاشقوں کا الفت میں ہی روا ہے

اس کو خبر نہیں ہے اس عشق کی ای بارو — جو شخص ہے یہ کہتا معشوق بے وفا ہے

آشفتگاں ہزاراں قرباں سر کریں گے

سجلؔ غریب مسکین درگاہ کا گدا ہے

اے دوست میرے دل کو تیر نظر لگا ہے — میری یہی صدا ہے اک جانتا خدا ہے

عاشق غریب کا دل زخمی کیا ہے تو نے — چیرا ہے تیرے سر پر اُتھول یہ بھی خطا ہے

شمشیر تیری عریاں خوں ریز ہے اے دلبر — تیرا الم کے آگے عاشق ہوا فنا ہے

اے جانِ جاں تو آجا میری گلی میں اک دن[1] — خاکِ قدم پہ تیری یہ جان و سر فدا ہے

نازِ دل سے تو نے دل عشاق کو اے ظالم — خوں ریزیٔ غریباں شاید تجھے روا ہے

تیرے ہی نام کا میں ہر دم رہوں گا عاشق

روزِ ازل سے سجلؔ در کا ترے گدا ہے

اس درد نے اے دلبروں بے خبر کیا ہے — مجروح میرے دل کو در یک نظر کیا ہے

ناحق مسافروں سے آنکھوں کی ہے لڑائی — میں نے گواہ ان پہ ہر شہر دبر کیا ہے

طالیس، کیا فلاطونؔ، لقماں بھی قید ہوتا — اس زلف کے ستم نے سب پر اثر کیا ہے

میری گلی میں آنا، دلبر نے دی تسلی — وعدوں نے منتظروں شام و سحر کیا ہے

تو اتنی بے نیازی دلبر نہ کر سجلؔ سے

کیا اس گلی میں میری تو نے گذر کیا ہے

---

[1] جناب جگر مراد آبادی نے اس "سپردگی" کا اظہار اس طرح کیا ہے:-

اے جانِ جاں آجا! آنکھوں کی راہ دل میں — ان خشک ندیوں سے مشکل ہی کیا گذرنا

دل ناز سے غنیوں نے لوٹا اور کیا اسرار ہے،

بس اب تو آجاؤ صنم، تیرا ہی یہ بیمار ہے

تیرے ہی غمزے سے بے جاں ہوں، بے جان ہوں،

خوبی ہے تجھ میں حسن کی دل کو تجھ ہی سے پیار ہے

اس روز یہ وعدہ کیا، میں تجھ سے ہوں، تو مجھ سے ہے

اے دوست پورا کر دکھا، تو نے کیا اقرار ہے

در در پھروں اس درد سے ہلکے میں عاجز ناتواں

دل ہاتھ سے میرے گیا، تیرے گلے کا ہار ہے

یہ تار تیری زلف کا عاشق ہے اس میں پھنس چکا

اب چھوٹنا مشکل سجلؔ شکرِ خدا صد بار ہے

ہاتھ پر لالی لگائی، آج کیا اسرار ہے — عاشقوں کا قتل ہوگا، خوں بھری تلوار ہے

چھوڑ کر سر کی تمنا آ مرے پاس ایک بار — اک نگہ سے کر دوں واصل یہ مرا اقرار ہے

بن سجلؔ تو عشق کا پروانہ شمعِ حسن پر

دیکھ ابراہیم پر آتش ہوئی گلزار ہے

الفت کا شہباز صنم نے میری طرف اڑایا ہے

علم و عقل اور شرم و حیا کو طعمہ کر کے کھایا ہے

عرش اور کرسی پردہ پریشاں دھرتی پر چل آیا ہے

دردمندوں کے دل پر اس شہباز نے گھر بنوایا ہے

جاں کی وہ بے جانی ہے، اس کے دام میں جو بھی آیا ہے — وہ جگ اس پر میں چھپے ہیں سجلؔ پر بھی چھایا ہے

میں یار، یار ہوں خود، کچھ بھی نہیں تفاوت — سمجھا "انا معی" کو دیگر کلام کیا ہے
اس جا ملائکہ بھی میرے ہوئے سلامی — اب تو بتا اے قاضی! میرا اسلام کیا ہے
"بے یسمع و بے یبصر" یہ صدق دل سے جانو — وہ دوست ہر جگہ ہے اس کا پیام کیا ہے

تحقیق الحقیقت ساری ہے اس خدا کی
سچل ہے جب وہ مالک، تو پھر غلام کیا ہے
حق پاک ہے، حق پاک ہے، حق خالق افلاک ہے
گہ خرم و بے باک ہے، گہہ خود بہ خود غمناک ہے
گہہ حیدرِ کرار ہے، شاہ یتیماں یار ہے
دلدل سوار، آقائے ارض و مالکِ افلاک ہے
گہہ ہے حسینؓ اور گہہ حسنؓ، گہہ اس کا رنگِ پیرہن
گہہ سرخ، گہہ سبزہ بدن، گاہے وہ خوش پوشاک ہے،

جو اپنا آپ پہچانے، "انا سوۃ" وہ انسان ہے
بڑی ہے بات الفت کی، وہ ہے مشکل نہ آساں ہے
وہی ظاہر، وہی باطن، وہ ہم تم کا بہانا ہے
نکل اس کفر اور اسلام کی حد سے یہ فرمان ہے
اسی خواجہ کی خدمت میں سلاموں پر سلام اپنے
سچل اس شاہ کا تہہِ دل غلامانِ غلاماں ہے

کبھی مومن، کبھی مسلم، کبھی کافر کہایا ہے — کبھی مُلّا، کبھی قاضی، کبھی بامن بلایا ہے
کبھی منصور بن کر خود کو سُولی پر چڑھایا ہے — زلیخا بن کے یوسف مصر کا والی بنایا ہے

مجھ کو بتا تو قاضیا کیسا تمہارا کام ہے — تجھ کو کتابوں کی خوشی میرے لیے ما تام ہے،
عاشق اجلا دے آگ میں ساری کتابوں کے ورق — اک نام میرا یاد کر یہ دوست کا پیغام ہے،
مجھ کو تو مارا ہجر نے کہتا ہے تو پڑھ کتاب — گھر میرے اس محبوب کی آمد کا آج انجام ہے،
کیوں سہو کا سجدہ کرے وہ عشق ہے جس کا امام — دم بھر بھلانا دوست کو نے عاشقوں کا کام ہے

آخر یہ مطلب پالیا مرشد نے یہ ہم سے کہا
بن عشق دلبر کے سچل کیا کفر کیا اسلام ہے

میاں سرفراز خاں عباسی کلہوڑا خاندان کے ذی علم فرماں روا تھے، اپنے والد میاں غلام شاہ عباسی کے انتقال کے بعد سندھ کی حکومت کے وارث ہوئے۔ صاحبِ علم و فضل اور شعر و ادب کے رسیا تھے۔ لیکن سیاست اور حکومت کی بساط پر مات کھا گئے۔ اپنے ایک ہندو وزیر راجہ لیکھی کے ورغلانے پر اپنے خاندان کے وفادار اور ذی اقتدار سردار بہرام خاں کو بلا وجہ قتل کرکے مکمل تباہی اپنے اوپر لے آئے۔ سلطنت ہاتھ سے نکل گئی۔ ظالم چچا عبدالنبی نے انھیں گرفتار کر کے قید خانے میں مروا ڈالا۔ یہ سندھی، اردو اور فارسی کے پر گو شاعر تھے، ان کا فارسی دیوان موجود ہے، اور قید خانے میں جو ایک سندھی میں مناجات لکھی تھی وہ اپنے درد اور اثر کی وجہ سے آج بھی زبان زدِ عوام ہے۔ اردو میں اُن کا کلام نہیں ملتا لیکن ایک شعر

ان کا[1] جو ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ نے اپنی کتاب "سندھ میں اُردو شاعری" میں درج کیا ہے وہ شاہد ہے کہ اس کا کہنے والا یقینی صاحبِ دیوان ہوگا۔ گردشِ ایام نے ان کے ساتھ ان کے کلام کو بھی تباہ کر دیا۔ حضرت سچل سرمست ان کی بعض خوبیوں کے باعث ان پر شفقت فرماتے تھے۔ ایک قطعہ ان سے متعلق انھوں نے لکھا ہے اس میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ بہت پُردرد انداز میں کھینچا گیا ہے :-

چمن کے تخت پر جب شاہِ گلشن کا تجمل تھا ہزاراں بلبلوں کی فوج تھی ہر سو غلغل تھا
خزاں کے دن جو دیکھے پھر جو دیکھا سوئے گلشن سوں بتایا باغباں رو رو یہاں غنچہ یہاں گل تھا

دُنیا کی بے ثباتی پر ان کا یہ بے مثل شعر بھی ملاحظہ ہو :-

ارے بلبل کسے پر باندھتی ہے آشیاں اپنا
نہ گل اپنا، نہ باغ اپنا، نہ لطفِ باغباں اپنا

حضرت سچل سرمست کے اُردو کلام کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے کے بعد صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کا بنیادی مزاج تصوف اور اخلاق پر مبنی ہے، وہ فنافی اللہ، فنافی الرسول، فنافی الشیخ، اور بقا باللہ کی منزلوں سے گذر کر

[1] شعر یہ ہے :- قفس کے بیچ میں بلبل کہاں فریاد کیا کیجیے
لکھا قسمت کا ہونا تھا چمن کوں یاد کیا کیجیے

بحرِ عشق میں غرق ہو چکے تھے۔ کفر و اسلام کے پردے انھیں محبوبِ حقیقی تک پہنچنے میں سدِ راہ نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ عشق کی بے قراری اور سوز کو حاصلِ حیات سمجھتے تھے۔ وہ اپنے محبوب سے شکوہ تو کرتے ہیں لیکن اسے بے وفا نہیں کہہ سکتے۔ وہ فراقِ یار میں تڑپتے ہیں، جلتے ہیں، اور کبھی کبھی جینے سے بھی بیزار ہو جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس کی لذت سے بھی آشنا ہیں اور اسے اپنی سب سے قیمتی متاع سمجھتے ہیں، ان کے "سپردگی" کا عجب انداز ہے وہ اپنے محبوب کے در کی گدائی اور اس کے اشارے پر مٹنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

حضرت سچل کا عشق دکھاوے کا روائتی اور مجازی عشق نہیں ہے بلکہ حقیقی ہے، وہ اپنے محبوب کو دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہیں اس پر فنا ہو جانے ہی میں اپنی بقا سمجھتے ہیں۔ اپنی افتادِ طبیعت، طریقِ زندگی اور اندازِ فکر سے انھوں نے عشق کو اس طرح قبول کر لیا ہے کہ اس سے علٰحدہ ہو کر ان کا وجود بے معنی ہے جس طرح پھول کو خوشبو سے، جسم کو روح سے، روشنی کو سورج سے، ناخن کو گوشت سے جدا نہیں کیا جا سکتا اسی طرح جیتے جی عشق و محبت سے ان کی علٰحدگی بھی ممکن نہیں۔ وہ سراپا عشق ہیں اور اس کے اظہار میں وہ تکلف اور تصنع کو بھی روا نہیں رکھتے، وارداتِ عشق کا اظہار ان کے یہاں بڑی بے ساختگی اور سادگی سے کیا گیا ہے۔ ان کی اُردو غزلوں میں افہام و تفہیم کی بہت کم ضرورت پڑتی ہے۔

حضرت سچل سرمست پیشہ ور شاعر نہ تھے۔ شاعری کو انھوں نے نام و نمود

جاہ و حشمت اور مال و زر کا ذریعہ نہیں بنایا تھا۔ بلکہ اس کو انسان، انسانیت
اور اپنے پروردگار سے حقیقی اور بے لوث محبت کا وسیلہ تصور کیا تھا۔ ان
کی محبت "کوزے" سے نہیں "کوزہ گر" سے تھی، وہ کسی پیکرِ نازک کے جسم اور
اُس کے عشوہ و ناز کے دلدادہ نہ تھے۔ بلکہ ان کی محبت دنیائے آب و گِل
کی سطح سے بلند خالقِ کونین میں مرکوز تھی۔ انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد
خلقِ خدا کی خدمت اور انسانیت کی خدمت کو بنا لیا تھا۔ اس عہد میں
آمد و رفت کی سہولت نہ ہونے کے باعث ڈیڑھ دو ہزار میل دور دہلی
کے لال قلعے تک پہنچنے کے مواقع بھی ان کو حاصل نہ تھے اس لئے اگر
اُردو غزل گوئی میں ہم اُن کے معاصرین میر و سودا کی زبان ان کے یہاں
نہیں پاتے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ان کی وسعتِ قلبی، اور انسان
دوستی ہی کیا کم ہے کہ انھوں نے سندھ میں بسنے والے چند نفوس کی خاطر
اُردو زبان میں بھی اپنی وارداتِ قلبی اور پیغامِ ربانی کو پیش کیا کہ وہ ان کے
افکار اور تعلیمات سے محروم نہ رہ جائیں۔ وہ بلاشبہ آفاقی قدروں اور عالمگیر
انسانی محبت کے قائل تھے۔

حضرت سچل سرمست نے نوے برس کی عمر پائی۔ وہ ۱۴ رمضان المبارک
۱۲۴۲ھ مطابق ۱۸۲۶ء کو اپنے مالکِ حقیقی سے یہ کہتے ہوئے جاملے:۔

کوئی یہاں ماں باپ نہ میرا — حد سے لاحد میں ہے بسیرا
سچل میرا ہر جا ڈیرا — اپنا ہوں نہ پرایا ہوں

(۵) "روحل فقیر"

۱۱۳۲ھ — ۱۱۹۴ھ
۱۷۱۹-۲۰ء — ۱۷۸۰-۸۱ء

حضرت روحل خاں کے والد شاہو خاں زنگیجہ خانوادے کے ایک ممتاز
اور با اثر فرد تھے۔ جو بلوچوں کے جتوئی قبیلے کی ایک شاخ ہے۔ شاہو خاں کلہوڑہ
خاندان کے فرماں روا میاں دین محمد کے معتمد امرا میں سے تھے۔ میاں نور محمد کلہوڑہ
کی تخت نشینی کے بعد وہ عمر کوٹ کے علاقے میں ایک بلند منصب پر فائز کیے
گئے تھے۔ وہ علاقہ ان کو اتنا پسند آیا کہ عمر کوٹ اور کھارو ڈے کے درمیان
ایک مقام "پدما دجی بھٹ"[1] گاؤں میں سکونت پذیر ہو گئے۔ اسی گاؤں میں تقریباً
۱۱۳۲ھ میں ان کے فرزند حضرت روحل فقیر عدم سے وجود میں آئے۔

سلے سنگی، ست ساتھی، پر گھٹ آئے
پورنما میں چکورا آیا، گھر شاہو کے پائے (روحل)

حضرت روحل نے دولت اور ثروت میں آنکھیں کھولی تھیں اس لیے زمانے
اور دستور کے مطابق اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور ہوئے۔ جوانی ہی سے اُن کو تصوف اور

[1] "پدما دجی بھٹ" (یعنی پدماو کا ٹیلہ) گاؤں اب ویران ہے، صرف وہاں ایک پختہ کنواں ابھی تک باقی ہے جو "روحل جی واں" (روحل کا کنواں) کے نام سے مشہور ہے۔

روحانیت کی چاٹ لگی اور وہ اس دور کے مشہور صوفی بزرگ حضرت شاہ عنایت اللہ شہید[1] کے فرزند حضرت عزت اللہ[2] کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ سنہ ۱۱۳۰ھ میں میراں پور (عرف جھوک موجودہ ضلع ٹھٹھہ) کے مشہور صوفی بزرگ شاہ عنایت اللہ کی شہادت ہوئی۔ اس کے دو سال بعد حضرت روحل فقیر پیدا ہوئے تھے۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد وہ ان کی بزرگی کا چرچا سن کر روحانی تربیت کے لئے اُن کے خاندان کی طرف مائل ہوئے، اور میراں پور جا کر حضرت شاہ عنایت اللہ کے مزار مبارک پر عرصے تک معتکف رہے۔ پھر ان کے فرزند حضرت عزت اللہ کے دست حق پرست پر بیعت ہو کر روحانی تربیت حاصل کی۔

شاہنو خاں کے انتقال کے بعد میاں غلام شاہ عباسی[3] نے اپنے دورِ حکومت میں

---

[1] شاہ عنایت اللہ شہید: بن مخدوم فضل اللہ سنہ ۱۰۶۶ھ (۱۶۵۶ء) میں میراں پور میں پیدا ہوئے۔ دکن میں سید عبدالملک برہانپوری کے دست حق پرست پر بیعت کی، اور اپنے شیخ کی اجازت سے شاہ غلام محمد کے ساتھ ٹھٹھہ تشریف لائے۔ اور میراں پور جھوک مقیم ہو کر رشد و ہدایت میں مصروف ہو گئے۔ سنہ ۱۱۲۹ھ میں نواب اعظم خاں ٹھٹھہ کا صوبیدار ہو کر آیا اور مالگزاری کی عدم ادائیگی کو بہانہ بنا کر صفر سنہ ۱۱۳۰ھ میں ان کو شہید کر دیا۔ (تذکرہ صوفیائے سندھ اعجاز الحق قدوسی، صفحہ ۱۳۴ - ۱۴۸)

[2] شاہ عزت اللہ: صوفی شاہ عنایت اللہ کے بڑے صاحبزادے تھے جو آپ کی شہادت کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ شاہ عزت اللہ نے سنہ ۱۱۸۶ھ میں وفات پائی۔ (تذکرہ صوفیائے سندھ۔ اعجاز الحق قدوسی، صفحہ ۱۴۸)

(مسلسل)

روحل شاہ کو جیسلمیر، جودھپور، اور بیکانیر کی حکومت میں سفیر بنا کر بھیج دیا۔ غالباً اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس علاقے کے لوگ حضرت روحل کی بزرگی اور تقدس کی بنا پر ان کا بڑا احترام کرتے تھے، اور وہ اس علاقے کی زبانوں پر بھی حاوی تھے۔ حضرت روحل نے اس منصب کو قبول کر کے فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کو بھی اپنا مقصد حیات بنا لیا چنانچہ اس خطے میں وہ عرصے تک راجا اور پرجا سبھوں کے درمیان بڑی مستعدی سے روحانیت کا پیغام پہنچاتے رہے۔ اس پیغام رسانی کا ذریعہ انھوں نے سندی شاعری کو بنایا جو اس علاقے میں سمجھی اور بولی جاتی تھی۔ جودھپور کا راجا بجیہ سنگھ ان کی بزرگی، تقدس اور درویشانہ صفات سے حد درجہ متاثر تھا، اور بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ کئی مرتبہ جودھپور کے درباری پنڈت آلیسر سنگھ اور دوسرے پنڈتوں سے اُن کے مذہبی مناظرے بھی ہوئے، جن کو حضرت روحل نے "اگم دارتا" کے نام سے منظوم بھی کیا ہے۔ اس خطے میں بہت سے رجواڑے اور عوام ان کے معتقد ہو گئے تھے۔ کافی لوگ ان کے ہاتھ پر مسلمان ہو کر مرید ہوئے۔ اس طرح انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ تصوف اور مذہب کی بڑی خدمت انجام دی۔ کچھ عرصے بعد وہ اپنے پیر و مرشد حضرت

(بہ سلسلۂ ماسبق) [3] میاں غلام شاہ کلہوڑہ: خاندان کلہوڑہ کا چوتھا فرماں روا تھا، جو میاں محمد مراد یاب کے قید ہونے کے بعد سنہ ۱۱[illegible]ھ میں تخت نشین ہوا، اور سنہ ۱۱۸۶ھ میں اس نے وفات پائی (فٹ نوٹ تذکرہ صوفیائے سندھ، اعجاز الحق قدوسی، صفحہ ۱۴۳)

غوث اللہ کی خدمت میں میراں پور چلے آئے اور پھر ہمیشہ ان کے ساتھ رہے۔

جب ۱۲ جمادی الثانی ۱۱۸۷ھ (۱۷۷۳ء) کو حضرت صوفی غوث اللہ شاہ کا وصال ہوا تو وہ اپنے مسکن کنڈڑی میں گوشہ نشین ہو گئے، اور وہیں اپنے مرشد کے وصال سے سات سال بعد تقریباً ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) میں اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ کنڈڑی میں آپ کا مزارِ مبارک آج بھی مرجعِ خاص و عام ہے۔

حضرت روحل کی مادری زبان سرائیکی تھی، لیکن وہ عربی، فارسی، سندھی، اُردو اور ہندی زبانوں پر بھی خاصی دسترس رکھتے تھے۔ راجپوتانا کے علاقے جیسلمیر اور جودھپور میں سفیر کی حیثیت سے عرصہ تک رہ کر دین و مذہب کی تبلیغ میں مشغول رہے تھے۔ اِس لیے اس دیار کے ہندو بالخصوص میگھواڑ اور راجپوت بہت بڑی تعداد میں مشرف بہ اسلام ہو کر ان کے مرید ہو گئے تھے اپنے ان معتقدوں کی رہبری اور ہدایت کے لیے انھوں نے بہت سے ہندی دوہے "چوپائی" اور "شبد" وغیرہ لکھے۔ یہ سب اشعار "اگم وارتا" "سرب گیان" "من پربودھ" اور "ادھبھت گرنتھ" وغیرہ کے نام سے جمع کر دیے گئے ہیں اور کنڈڑی درگاہ کے سجادہ نشین صاحب کے پاس محفوظ ہیں۔ ان اشعار میں حضرت روحل نے تصوف کے اہم مسائل، توحید، نفی و اثبات، تزکیۂ نفس، اور ہمہ اوست کی بڑے دلکش انداز میں وضاحت فرمائی ہے۔ زبان کے لحاظ سے حضرت روحل کے اشعار معجونِ مرکب معلوم ہوتے ہیں؛ ان میں ہندی، اُردو، سندھی اور سرائیکی سب ہی زبان کے الفاظ خلط ملط ہیں۔ وجہ اس کی صاف ہے۔ یہ صوفیا جو کچھ کہتے تھے اس سے ان کا مقصد شاعری نہیں بلکہ عوام کی رہبری ہوتا تھا۔ ان کا

مخاطب جن الفاظ میں اور جس طرح ان کا پیغام سمجھ لے وہ اس میں کوشش کر کے سمجھاتے تھے، اور صوفیائے کرام کا یہی طرزِ عمل "زبانِ ریختہ" کے بنانے میں بڑا مددگار ہوا۔ سچل سرمست کی طرح حضرت روحل نے بھی "ہمہ اوست" سے متاثر ہو کر "خودی" اور "انا" کا نعرہ لگایا۔

باپ میرا شاہ ہو ناہیں، اس گھر ناہیں ذات
جننے ہم جانا نہیں، کال درن نہیں جات

نہیں روحل نہیں ذات زنگیہ اُسے کو سترآہی ہے

حضرت روحل سے پہلے کبیر داس گذرے ہیں، ان کے زمانے میں ان کی صوفیانہ شاعری کے بڑے چرچے تھے۔ اِس لیے فطری طور پر وہ ان سے متاثر ہوئے ایک دو جگہ انھوں نے اس کا ذکر بھی کیا ہے:-

کہت روحل ہم روحل ناہیں کبیر روپ ہمارا

جناب نبی بخش خاں بلوچ نے اپنی تصنیف "سندھ میں اُردو شاعری" میں حضرت روحل کے اُردو کلام کا کچھ نمونہ دیا ہے اس کے حوالے سے کچھ اشعار درج ذیل ہیں:-

صفت کرو سجان کی جو آدا نت مدھ ہوئے
سو ایک ایک اکھنڈ ہے اور نہ دوجا کوئے

لہ اس طرح کی شاعری کا گیارھویں بارھویں صدی ہجری میں شمالی ہند اور بہار کے صوفیا کے یہاں بہت رواج تھا، ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب "صوفیائے بہار اور اُردو" ص ۴۳-۴۴-۴۹۔

ایک ہی اکھر رتھ لے، نہیں کوئی اکھر انیک،

اے من بھولا مت پھرو، بے انت جگ، گرو ایک

جنم جنم کا دُکھ مٹا، اور جنم جنم کو پاپ

سبھ تن پاؤں ہو رہیا، جب درسیو آتم آپ

ستگرو جی میں سرن تمھارے آیا

من میں تھا رہی نہ کائی، درد مٹا، سُکھ پایا

گیان سورج گھٹ بیتر ہویا، اکھنڈ جوت رنگ لایا

جس کارن جگ پھرت اداس، سو گھٹ بیتر پایا

جنم مرن کا سنسا بھاگا، چیتن سوں چت لایا

یار ہیں سے جب پرچا لاگا لعل امر بھئی کایا

اگم دیس کو انتر مارگ ستگرو موہ بتایا

روحل رتن امر لک ملیا، بھاگ پرایت پایا

---

(۶) حضرت مراد فقیر زنگیجہ

۱۱۴۲ھ/۱۷۲۹-۳۰ء — ۱۲۱۱ھ/۱۷۹۶-۹۷ء

حضرت مراد خاں فقیر بھی بلوچیوں کے مشہور قبیلہ زنگیجہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد کا نام محمد حیات خاں زنگیجہ تھا۔ حضرت روحل فقیر سے آپ کا قریبی خاندانی تعلق تھا۔ یہ مادجی بھٹ گاؤں کے دونوں باشندے تھے اور دونوں نے اپنی ابتدائی زندگیاں اسی گاؤں میں گزاری تھیں۔ حضرت مراد خاں فقیر کی پیدائش اسی گاؤں میں ۱۱۴۲ھ/۱۷۲۹ء میں ہوئی تھی۔ حضرت مراد خاں فقیر حضرت روحل صاحب سے عمر میں کچھ بڑے تھے لیکن ان کے زہد و اتقا، علم و فضل اور تقدس کی بنا پر ان سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ان ہی کی صحبت میں وہ تصوف اور روحانیت سے آشنا ہوئے اور پھر ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ اپنی ایک صاحبزادی کا عقد بھی انھوں نے اپنے پیر حضرت روحل سے کر دیا تھا۔ جن کے بطن سے خدا بخش خاں اور دریا خاں پیدا ہوئے۔

بعض وجوہ کی بنا پر جب حضرت روحل نے یہ مادجی بھٹ کو چھوڑ کر کوٹڑہ میں رہائش اختیار کی تو اپنے دوست اور مرشد کی محبت میں حضرت مراد خاں فقیر بھی کوٹڑہ میں جا بسے۔ بعد میں حضرت روحل نے کوٹڑہ کو بھی چھوڑ کر کنڈڑی میں بود و باش اختیار کر لی تھی، لیکن حضرت مراد خاں یہیں رہے۔ یہیں آپ کا وصال ہوا اور یہیں سپرد خاک

بھی کیئے گیے۔

حضرت مراد فقیر کی مادری زبان سرائیکی تھی، لیکن وہ سندھی، فارسی، مارواڑی، اور ہندی میں اچھی لیاقت رکھتے تھے۔ سرائیکی زبان میں تو وہ اپنے وقت کے فصیح ترین شعرا میں شمار کیئے جاتے تھے۔ سرائیکی کے علاوہ انھوں نے اردو میں بھی اشعار کہے ہیں لیکن ان میں سندھی اور ہندی الفاظ کی بھرمار ہے۔ اس دور کے صوفی شعرا کا بالعموم یہی انداز شعر گوئی تھا جن کو ہم اردو کے ابتدائی ارتقائی دور یعنی "دورِ ریختہ" کا بہترین نمونہ کہہ سکتے ہیں۔

حضرت مراد فقیر نے کلہوڑوں کے زوال کا پرآشوب دور بھی دیکھا اور ان ہی کے سامنے "تالپوروں کے اقبال کا آفتاب بھی طلوع ہوا تھا۔ آخری کلہوڑہ حکمران میاں عبدالنبی کی حماقت سے وہ بہت بے زار تھے۔ اپنی بدبختی سے جب میاں عبدالنبی نے اپنے ملک کی شورش کو دبانے کے لیے والیِ افغانستان تیمور شاہ سے مدد طلب کی اور جواب میں مدد خاں افغان اپنی درندہ صفت افواج لے کر سندھ میں داخل ہوا تو اس نے کشت و خون اور آتش زنی کا وہ بازار گرم کیا کہ سندھی عوام چیخ اٹھے۔ یہ واقعہ ۱۱۹۵ھ ۱۷۸۱ء کا ہے۔ اس واقعہ کے بعد سے حضرت مراد فقیر کھلم کھلا تالپوروں کے حامی بن گئے اور کلہوڑا حکمران اور اس کے حلیف مدد خاں سے انھیں شدید نفرت ہوگئی۔ ایک شعر میں مدد خاں کو مار کر نکال دینے کے لیے وہ عوام کو اس طرح للکارتے ہیں :-

مارو مدد کوں دور کرو چھوڑ دیجے یہودی یزید میاں

تالپور حکمرانوں کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد میر سہراب خاں تالپور

والئی خیرپور نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی۔ اپنے پیر روحل کی طرح حضرت مراد فقیر بھی تصوف میں وجودی فلسفہ کے ماننے والے تھے اور اکثر "ہمہ اوست" کے نظریے کے مطابق "انا" کا نعرہ لگا دیتے تھے۔ ان کا زہد و اتقا بہت مشہور تھا وہ اپنے دور کے مشہور صوفی درویشوں میں شمار کیئے جاتے تھے۔ ان کی ساری زندگی عوام کی خدمت اور روحانیت کی اشاعت میں گزری، اُن کی شاعری میں تصوف، اخلاق کے بعض اہم نکتوں کی وضاحت ملتی ہے۔ انھوں نے ہوس، طمع، ریاکاری اور دل آزاری کی جی کھول کر مذمت کی ہے۔ جناب ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ نے ان کا کچھ اردو کلام جو دوہے، چوپائیاں اور شبد کی شکل میں ہے اپنی تصنیف "سندھ میں اردو شاعری" میں پیش کیا ہے۔ اسی کے حوالے سے کچھ اشعار نمونتاً درج ذیل ہیں :-

"دوہرے"

ستگہ گیانی بھٹیا سنسار رہیا نہ کو بھرم مٹا دے جم ٹرے اواگوں نہ ہو
سکھ تیرے سرہار ہے جپنا گرومت کا و جو تم پوچھو چاہ سوں، سو سبھ دیوں بتا

کہو بہ بھو ہم کوں ہول، تم آیو سنسار چوراسی لکھ جات کم جو لیوت ہے اوتار
نا کبھی بر جیئے، نا کوئی مرے جوتی جوت سمار جیسے جل ترنگ بھرے بیر اجل مل جاو
پریم گنگ میں جب بھیو تب اور کچھ نہ سہائے ستگر کلبر ال دھن سبھی تجھے سرائے

"چوپائیاں"

گر کرپا تے کال نہ کار جنم مرن کا سنسا جاو

ہم تس سنگر کی بھکاری — بھرم مراد مٹا دے بھاری

نہ کہیں آوے نہ کہو جاوے — آپ ھیں میں پھر آپ سماوے

جیون ساگر پر انیک تر لگا — ات اک اور جوا جور نگا

پریم بنا کچھ بھگت نہ ھوئی — پریم بنا کچھ ایک نہ دوئی

پریمی ہووے پر جا پاوے — پریم الکھ مراد لگا وے

پریم بنا جو بھگت کمائے — سنو تول کبھوں مکت نہ پائے

پریم بنا سبھو کرم کے کیڑے — کہت مراد مایا موہ پیڑے

"شبھل"

سکھی ری چلو پیا کے دوار

پریم کو بادل امس رس برسے رم جھم امرت دھار
گگن منڈل انحد گرجے، ڈھڈس میگھ ملار
نرمل نیر نام سہول سبھجے، من کو میل اُتار
چت من چیتن بجلی چمکے پر گھٹ جوت اپار
بیوت سانت بوند سکھ اپجے، تجئے سکل وکار
چرن کنول کی سیوا کرئیے، مانگوں دان وچار
کہت مراد یہ مکت کو مانگ، چین لیو سنت سار

---

(۷) "حضرت شاہو خاں زنگیجہ"

سنہ ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۱-۵۲ء — سنہ ۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۴-۱۵ء

حضرت شاہو خاں زنگیجہ حضرت روحل کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ جن کا نام دادا کے نام پر حضرت روحل نے شاہو رکھ دیا تھا۔ حضرت روحل کی دو شادیاں ہوئی تھیں، پہلی سے دو صاحبزادے شاہو خاں اور غلام علی پیدا ہوئے۔ اور دوسری شادی جو حضرت مراد فقیر کی صاحبزادی سے ہوئی تھی ان سے خدا بخش اور دریا خاں تھے۔ یہ چاروں اپنے اپنے وقت پر آسمانِ تصوف کے درخشاں ستارے بن کر چمکے۔

حضرت شاہو نے علوم ظاہری اور باطنی کی تعلیم اپنے والد حضرت روحل سے حاصل کی اور پھر ان ہی کے ہاتھ پر بیعت حاصل کر کے اُن کے خلیفہ اور جانشین ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد حضرت شاہو نے اپنے چھوٹے بھائی غلام علی کی تعلیم و تربیت خود کی اور ان کو بھی علوم ظاہری و باطنی میں کامل بنا دیا۔ حضرت شاہو کی ساری زندگی اخلاق و تصوف کی تعلیم اور عوام کی رہبری میں گزری۔ آپ کو سندھی، سرائیکی، اور ہندی میں خاصی مہارت حاصل تھی اور اکثر ہندی آمیز اُردو میں بھی کلام موزوں فرماتے تھے۔ آپ کا کلام کم ملتا ہے۔ ایک منظوم مکالمہ جو حضرت شاہو اور اُن کے والد حضرت روحل کے درمیان واقع ہوا تھا

"سندھ میں اُردو شاعری" میں درج ہے۔ وھو ہٰذا :۔

حضرت شاہو اپنے والد اور مرشد سے عرض کرتے ہیں :۔

گرو پوری کم جانیا، کبدھ پری نہ پہچان
شاہو اب عرض کرے، دیجو سرب گیان
گیان بنا گم کم پڑے، جب ستگر کہہ سمجھائے
شاہو پر دیا کرو دیجو ترت دکھائے

(مطلب) گرو نگر (مرشد کے مقام) کو تو ہم نے نہیں سمجھا، البتہ اپنی جہالت اور لاعلمی کا اندازہ ضرور ہو گیا۔

شاہو التجا کرتا ہے کہ حضرت اسے صحیح علم اور گیان سے روشناس کریں۔ کیونکہ گیان (معرفت) کے بغیر بوجھ کم پڑتی ہے جب تک سچا مرشد سمجھا کر تعلیم نہ دے شاہو پر کرم فرما کر جلد رہبری فرمائیں۔

حضرت روحل اپنے فرزند اور مرید کی اس درخواست کا جواب دیتے ہیں :۔

ستگر بھری پرس ہے، سدا بے پرواہ
روحل! اوہ راجا بھئے راجن کے پتشاہ
اننگ اکتشر نہ ملے، نین نیں بھرپور
روحل بچن بولے کر جگے ہنسا سور

(مطلب) سچے مرشد کے مقام کو سمجھنے والا ہر دو سب سے بے پرواہ ہو جاتا ہے روحل کہتا ہے کہ وہ راجا بلکہ راجاؤں کا راجا ہے۔

ہوس اس کے یہاں قطعی نہیں، اس کی آنکھیں حقیقی محبت سے بھرپور رہتی ہیں۔

روحل موتیوں جیسے بول بولتے ہیں جو ہنس کے چگنے کے لائق ہے یعنی عقلمندوں کے سمجھنے کے لائق ہے۔

حضرت شاہو کی شاعری میں بالکل حضرت روحل کا عکس نظر آتا ہے۔ وہی زبان، وہی انداز بیان اور وہی تصوف کے اشارے اور کنائے، بلکہ آگے چل کر جیسا آپ دیکھیں گے حضرت روحل کے سب ہی فرزندوں کی شاعری کا تقریباً ایک ہی انداز نظر آتا ہے۔ سب ہی صوفی درویش گزرے اور سبھوں نے اپنے اشعار میں تصوف و اخلاق کے موتی بکھیرے ہیں لیکن ان سب نے شاعری میں زبان سندھی، ہندی اور اُردو الفاظ پر مشتمل مخلوط قسم کی استعمال کی ہے۔ جسے اُردو کے بجائے "ریختہ" کہنا زیادہ صحیح ہو گا۔ بحور اور قافیے ہندی اور فارسی دونوں سے لیے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت روحل کے فرزندوں نے اپنے تقدس مآب والد کی جہاں فقر و تصوف میں پیروی کی، وہاں ان کے طرز بیان اور شاعری کو بھی مکمل طور پر اپنایا۔ بلاشبہ یہ اس دور کی اُردو سے ذرا مختلف ہے کیونکہ اس دور میں شمالی ہند کے شعرا کی اُردو شاعری کا یہ انداز نہ تھا لیکن چونکہ حضرت روحل کبیر داس کی زبان پر ریجھ گئے تھے، اس لیے انھوں نے اپنی شاعری میں ان کی پیروی کی اور اُن کے فرزندوں نے اپنے والد اور مرشد کی۔

حضرت شاہو کی پیدائش ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۱-۵۲ء) میں اور وصال ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۴-۱۵ء) میں ہوا۔

---

(٨) حضرت فقیر غلام علی زنگیجہ

سنہ ١١٨٠ھ - سنہ ١٢٥٥ھ
١٧٦٦-٦٧ء ١٨٣٨-٣٩ء

حضرت فقیر غلام علی حضرت روحل فقیر کے دوسرے فرزند تھے۔ اپنے بڑے بھائی حضرت شاہو سے انھوں نے علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کی، اور پھر راہِ طریقت میں بھی ان ہی کا ہاتھ پکڑا۔ "سندھ میں اردو شاعری" کے مصنف نے ان کا سنہ پیدائش اندازاً سنہ ١١٨٠ھ (١٧٦٦-٦٧ء) لکھا ہے۔ آپ کی پیدائش اپنے آبائی گاؤں کنڈڑی میں ہوئی تھی، اور وہیں سنہ ١٢٥٥ھ (١٨٣٩-٤٠ء) میں آپ کا وصال ہوا اور سپردِ خاک کیے گئے۔ آپ کے ٢ دو فرزند ہوئے روحل فقیر ثانی، اور فقیر نواب خاں۔ یہ دونوں بھی فقر و تصوف میں بلند مقام رکھتے تھے۔ روحل فقیر ثانی اپنے والد فقیر غلام علی کے بعد ان کے جانشین ہوئے، اور عرصے تک اُن کے دم سے روحانیت کا سرچشمہ جاری رہا۔

حضرت فقیر غلام علی ایک درویش کامل اور صوفیِ باصفا بزرگ تھے۔ انھوں نے سندھی اور سرائیکی کے علاوہ ریختہ (اردو) میں بھی اشعار کہے ہیں۔ سندھی اور سرائیکی میں ان کی کافیاں بہت پُراثر اور پُرسوز ہوتی ہیں جن میں محبت اور عرفان کا پیغام دیا گیا ہے۔ بعض سرائیکی کافیوں میں آپ نے اردو الفاظ اور فقرے جوڑ کر بڑی دلکشی پیدا کر دی ہے،

مثلاً:-

کل فقیر کوں کیتم (میں نے کیا) سجدہ، شاہو شاہ ہمارا
پیر آ ساڈا (ہمارا) ظاہر ہو یا، شاہو شاہ سڈا (کہلاتا ہے) وندا

ان مصرعوں میں اپنے پیر حضرت شاہو سے اظہارِ عقیدت کیا گیا ہے۔ اردو (ریختہ) میں کہے ہوئے آپ کے کچھ اشعار نمونتہً درج ذیل ہیں:-

"پریم نگر کے مانہہ، شیام سوں کھیلوں ہوری
بندرا بن مول بین بجا دے چشماں لادت چوری
عطر عبیر کی دھوم مچی ہے، کیسر بھرت کٹوری
گگن منڈل موں دامنی (بجلی) چمکے، انحد کی گھنگھوری
آپ سوں آپ ہیں کھینچ لیوے، پائے پریم کی ڈوری
شاہو شاہ کے سرہانے آیا، پریت لاگی تب موری
غلام علی اب گیاں گلی میں، لیو شام کشوری

(۹) حضرت دریا خاں زنگیجہ "

سنہ ۱۱۹۰ھ / ۷۷-۱۷۷۶ء — سنہ ۱۲۷۰ھ / ۵۳-۱۸۵۲ء

حضرت دریا خاں زنگیجہ حضرت روحل فقیر کے سب سے چھوٹے فرزند اور حضرت فقیر غلام علی کے چھوٹے بھائی تھے۔ آپ کی پیدائش سنہ ۱۱۹۰ھ میں اپنے آبائی گاؤں کنڈڑی میں ہوئی تھی۔ آپ کے والد ماجد حضرت روحل فقیر کا وصال آپ کے بچپن ہی میں ہوگیا تھا اس لیئے آپ کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری آپ کے بڑے بھائی حضرت فقیر غلام علی نے اپنے ذمہ لی۔ حضرت دریا خاں نے روحانی تربیت اپنے بڑے بھائی ہی سے حاصل کی اور ان ہی سے مرید بھی ہوئے آپ کا وصال سنہ ۱۲۷۰ھ میں ہوا۔

حضرت دریا خاں زنگیجہ نے اپنی ساری زندگی تبلیغ اسلام، خدمت خلق اور رشد و ہدایت میں بسر کی۔ سندھی اور سرائیکی کے ساتھ اُردو میں بھی اشعار کہتے تھے۔ آپ کا کلام معرفت اور تصوف کے نکات سے پُر ہوتا ہے۔ اپنے والد اور بھائی کی تقلید میں حضرت دریا خاں نے بھی اپنی زبان "ریختہ" ہی رکھی ..... وہی سندھی اور ہندی الفاظ پر مشتمل مخلوط زبان۔

اپنے ہندو معتقدین کو اپنی طرف مائل کرنے کے خیال سے اُن کی دلجوئی کے طور پر اکثر دیومالا کی داستانوں سے استعارے اور تشبیہات اپنے کلام میں

لاتے ہیں۔ اور اس میں بڑے پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ اُردو (ریختہ) میں آپ کا زیادہ تر کلام "دوہوں" اور "شبدوں" پر مشتمل ہے۔ ڈیڑھ دو سو برس قبل سندھ میں اس سے زیادہ صاف اور شستہ "سندھی ریختہ" کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے:-

"دوھے"

پریم تو میرے وس (بس) نہیں، پریم نہ میرے ہاتھ

ستگر ساودوان (عالم) ہو کہہ سمجھائے بات

رام رام کے نام سوں (سے) جن کو لاگی پریت

دریا خاں ایہہ سنسار سوں ھاری لیوے جیت

پریم پارکھو کوئی نہیں (ایسی) جو کرے پریم پہچان

دریا خاں جس گھٹ پریم ہے دہاں ہے پرگھٹ گیان

روگی روگ سریر کی سنگت، نام سوں جیوں جل پانی

دریا خاں آس نراس برابر جو دیکھا ہے سو فانی

"بانی"

مت بھولو، من مت بھولو	ہر نام سمرن، مت بھولو
ستگر سبد میں الٹ سمایو	گھٹ کایا (یعنی گھڑی الٹی) کاشتی تیرتھ نایو
من کی پنج سماس منایو	گیان ھنڈولے میں جھولو

"شبد"

شام مندر آیو رے، سکھی ہیرو کاں

بندرابن میں کھیلے ہوری، سمکہ صاحب شام کشوری

رادھا روپ بنایو رے

پانچ سکھی مل منگل گاؤ، چنگ مرڈنگ کی چوٹ چلاؤ
رنگ رس تال بجایو رے

دریا خاں ای پد نب میں پایا، ستگرہ سبد میں سہج سمایا
آپ آپے گن گایو رے

---

(۱۰) حضرت سید قنبر علی شاہ بھاڈائی

۱۲۰۰ھ – ۱۲۶۴ھ
۱۷۸۵-۸۶ء – ۱۸۴۷-۴۸ء

حضرت سید قنبر علی شاہ کے والد یحییٰ شاہ شہر سجاول سے دس میل دور جنوب میں تحصیل جاتی ضلع ٹھٹھہ کے ایک گاؤں بھاڈ کے رہنے والے تھے۔ سید قنبر علی شاہ کی پیدائش اسی گاؤں میں تقریباً ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۵-۸۶ء میں ہوئی تھی اپنی جائے پیدائش کی مناسبت سے وہ اپنے نام کے آخر میں بھاڈائی لکھتے تھے، اور اسی نام سے عوام میں مشہور ہوئے۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد بعض حالات کے تحت حضرت سید قنبر علی شاہ اپنے قدیم گاؤں بھاڈ کو چھوڑ کر تحصیل گھوڑا باری ضلع ٹھٹھہ کے گاؤں گنبانا لی میں منتقل ہو گئے اور وہیں اپنی ساری زندگی گزار کر، ۲۷ ذی الحجہ ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۷-۴۸ء کو چونسٹھ سال کی عمر میں واصل بہ حق ہوئے۔ آپ کا مزار مبارک وہیں گنبانا لی میں آج بھی مرجع خلائق ہے۔

حضرت سید قنبر علی شاہ کی طبیعت بچپن ہی سے تصوف کی طرف مائل تھی گھر میں بھی اس کا چرچا تھا، اس لئے وہ تعلیم سے فراغت کے بعد تزکیۂ نفس کی طرف مائل ہو گئے، اور سخت ریاضتوں اور عبادتوں میں مشغول رہے۔ سندھی زبان کے بلند پایہ شاعر تھے اور شریف تخلص کرتے تھے۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ رسالہ کے نام سے "بینتوں" اور

"دائیوں" پر مشتمل ان کا سندھی مجموعۂ کلام موجود ہے۔ اسی رسالہ میں اُنھوں نے اُردو میں بھی کچھ اشعار لکھے ہیں۔ ان کا ایک دوہا نمونتہً درج ذیل ہے:-

رام بھگت ایکاندھے مجے سیر پائے ساز
شریف پینتے بکھیا روٹی کے لحاظ
بھیک مانگنے

(۱۱) "حضرت نظر علی فقیر زنگیجہ"

۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰-۱۱ء) - ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۸-۴۹ء)

حضرت روحل فقیر نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے حضرت شاہو خاں اور حضرت غلام علی پیدا ہوئے اور اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد سلسلے دار کنڈری درگاہ کے سجادہ نشین ہوئے۔ دوسری بیوی سے خدا بخش سائیں اور حضرت دریا خاں زنگیجہ ہوئے۔ خدا بخش سائیں نے ۱۲۴۳ھ (۱۸۲۷-۲۸ء) میں وفات پائی حضرت نظر علی فقیر زنگیجہ آپ ہی کے فرزند تھے۔ حضرت نظر علی ابتدا ہی سے راہِ سلوک کی طرف مائل تھے۔ اس لیے ان کا میلانِ طبع اپنے چچا حضرت دریا خاں زنگیجہ کی طرف بچپن ہی سے تھا چنانچہ علوم باطنی کی تحصیل آپ نے ان ہی سے کی اور ان ہی کے مرید بھی ہوئے۔ ایک جگہ اپنی عقیدت کا اظہار اپنے مرشد اور مربّی سے اس طرح کرتے ہیں:-

دان، دھیان، گیان، دریا خاں گوردا تا موہ دیجیے
نظر علی مری آد کی ہمیت اب چھانی کیوں کر کیجیے

حضرت نظر علی زنگیجہ اپنے آبائی گاؤں کنڈری میں ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰-۱۱ء) میں پیدا ہوئے اور جوانی ہی میں اپنے مرشد اور چچا دریا خاں سے پانچ سال پہلے ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۸-۴۹ء) میں واصل بہ حق ہوئے۔ حضرت نظر علی نے سندھی، سرائیکی اور اردو زبان میں

کافی اشعار کہے ہیں، فارسی اور عربی کے اچھے عالم تھے۔ آپ کو اُردو زبان پر جو قدرت حاصل تھی اس کا اندازہ ان کے اُردو اشعار اور اس فارسی شعر کے ترجمے سے ہوتا ہے جو اُنھوں نے برجستہ نظم ہی میں کیا ہے، فارسی کا شعر ہے:۔

دلم دلداری جوید، تنم آرام می خواہد　　عجائب کشمکش دارم کہ جانم مفت می کاہد

آپ نے اس کا اُردو ترجمہ اس طرح فرمایا ہے:۔

دل چاہے دلدار کو، من چاہے آرام　　دبدھا میں دونوں گئے، مایا ملی نہ رام

حضرت نظر علی فقیر نے بھی اپنے دادا حضرت روحل فقیر کی طرح اپنی شاعری کو تزکیۂ نفس، توحید باری، نفی و اثبات، اور "ہمہ اوست" کے نظریوں کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا ہے، ان کے اُردو کلام کی زبان زیادہ تر صاف، رواں اور سلیس ہے لیکن اکثر وہ اپنے خاندان کے بزرگوں کی پیروی میں "ریختہ" زبان بھی استعمال کرتے ہیں۔ اُن کی اُردو شاعری میں روحل فقیر اور دریا خاں کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے، چنانچہ توحید باری پر ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"نظر علی، اک صاحب جانو　　اس بن اور نہ دوجا جانو"

آپ کا کلام کنڈڑی درگاہ میں محفوظ ہے۔ اس جگہ دو[2] کافیاں نمونتاً درج ذیل ہیں، ان میں سے ایک تو رواں، سلیس، صاف اور شگفتہ اُردو میں ہے اور دوسری "سندھی ریختہ" حضرت روحل فقیر کے رنگ میں:۔

اِدھر دل مجھ سے کہتا ہے کہ چل تو یار کے دیرے　　اُدھر تن مجھ سے کہتا ہے کہ تو دکھ مجھ کو دے رے

جو کہنا دل کا سنتا ہوں تو وہ رہتی ہے گھر میرے　　اگر تن کی سنوں باتیں تو پھر دکھ دیوے بہتیرے

نہ دل مانے نہ من مانے، ہر اک اپنی طرف پھیرے
کروں میں کیا نظر ایسی جو مشکل آن کر گھیرے

"کافی ریختہ میں"

ھک (ایک) تو ھری مرے ھردے بسے　　میں تو اور کچھ نہیں جانوں
سادھ سنگت ڈو بھاگ آوے　　مستک بھاگ سے پرکھو پاوے

آتم رام دھیاؤں

سم سم پر جو پالو جنہیں　　انند سکھ ہے گھٹ تہیں

گیت گرو گن گاؤں

دھن دھن سادھ جے ہر ہر نالے　　من میں مست مگن متوالے

آتم الٹ سماؤں

گور دریا خاں پیالہ جو پایا　　جنم مرن کا دکھ مٹایا

انحد ناد بجاؤں

نظر علی اپنا سی دھیاؤں　　انبھو دیس میں نگر بساؤں

امرا (پد) پد پاؤں

(۱۲) "حضرت محمد یوسف فقیر اگڑہ"

سنہ ۱۲۰۰ھ / ۸۶-۱۷۸۵ء - سنہ ۱۲۶۹ھ / ۵۳-۱۸۵۲ء

حضرت محمد یوسف فقیر، ضلع خیرپور (سندھ) کے "اگڑا" نامی گاؤں میں تقریباً سنہ ۱۲۰۰ھ (۸۶-۱۷۸۵ء) میں پیدا ہوئے۔ سندھ کے مشہور درویش اور شاعر حضرت سچل سرمست کی خدمت میں حاضر رہ کر روحانی تربیت حاصل کی اور اُن ہی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو کر عبادت و ریاضت اور خدمتِ خلق میں مشغول ہو گئے۔ کچھ دنوں کے لئے امرت سر میں بھی قیام پذیر رہے اور وہاں نانک پنتھی درویشوں کے ساتھ رہنے کے باعث گرونانک کی بعض تعلیم کو پسند کرنے لگے تھے۔ چنانچہ وہاں سے واپس آنے کے بعد کبھی کبھی "نانک شاہ یوسف" بھی اپنے آپ کو کہتے تھے لیکن حقیقی ارادت اور عقیدت جو اُن کو حضرت سچل سرمست سے تھی اُس میں ذرا بھی کمی نہیں ہوئی۔ حضرت سچل سے آپ کی عقیدت و محبت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب آپ کسی کو مرید فرماتے تو ہمیشہ یہ جملہ ضرور فرماتے "تم بھی سچے کا میں بھی سچے گا"۔

حضرت محمد یوسف فقیر اپنے مرشد کی طرح ہمہ دم سرمستی و کیفِ عشقِ آلہی میں سرشار رہتے تھے، اہلِ دل اور صاحبِ حال بزرگ تھے، جامہ پہنتے تھے اور کیف و سرمستی میں پیروں میں گھنگھرو باندھ کر گاتے اور رقص کرتے

موسیقی سے بڑی دلچسپی تھی۔ ۹ رجمادی الاول سنہ ۱۲۶۹ھ (۵۳-۱۸۵۲ء) کو تقریباً اہتّر سال کی عمر میں آپ واصل الی اللہ ہوئے۔ اُن کے ہم عصر شاعر حضرت قادر بخش بیدل نے یہ تاریخ وفات لکھی تھی :-

سالِ وصلش خرد بہ جہت سروش
گفت طائرِ بہ آشیاں رفتہ
۱۲۶۹ھ

حضرت فقیر محمد یوسف فارسی، اُردو، سندھی اور سرائیکی کے اچھے شاعر تھے۔ ان کے کلام کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان پر ہر وقت مستی اور سرشاری کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اشعار میں عروض کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ سُر اور ترنم کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ بعض بعض شعر ایسے ملتے ہیں جنھیں پڑھ کر رقص کا منظر سامنے آجاتا ہے۔ اُن کے اُردو کلام میں زیادہ تر عشق و محبت کے "پیغام" اور معرفت کے نکتے ملتے ہیں، وہ معرفت اور تصوف کے بہت سے سربستہ اسرار و رموز کو اپنے اشعار میں بہت دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں، اُن کے اُردو اشعار میں سندھی، سرائیکی اور ہندی الفاظ کی بہت زیادہ آمیزش پائی جاتی ہے، اور صحیح معنی میں اُن کے اُردو اشعار کو "سندھی ریختہ" کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ حضرت فقیر محمد یوسف کے مجموعۂ کلام کا ایک قلمی نسخہ سنہ ۱۹۵۹ء میں ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ کی نظر سے گزرا ہے، اور اس سے انھوں نے کچھ اُردو کا نیا اپنی کتاب "سندھ میں اُردو شاعری" میں نقل کی ہیں۔ ہم اس کے حوالے سے کچھ اشعار ذیل میں درج کرتے ہیں :-

ہم دیکھا ہے دیدارا برہ بلذار، تماشا پل پل کا وہ واہ
ہم جاؤں گی بلہارے ہمارے یار، حُسن کا جل جھلکا وہ واہ

جب پیتا جام شراب، ہوا بے تاب، نشہ میں خواب، غرق در "ھو"
جوں بھنورا میں گلزار، مقید وار، زلف کے سنبل کا دہ واہ

براہ عشق عاشق دم برد ہو ہو و ھو ھو ھو
دکھو دنیں جہاں دل غم برد ہو ہو و ھو ھو ھو

یار یوسف یار ہے   ھادی ہمہ دیدار ہے
ہے ہر جا حکم تمہارا   سن ھادی حال ہمارا
مجھ سیں بناتا ہے صنم   نؤ نؤ گوڑھے نیں
عشق امام ہمارا ہے   دو جگ یار نظارا ہے
تحقیق تجھ درس بن، فرہاد میں مروں گی   تم داد کے ہو صاحب، انداد میں مروں گی
تجھے دل درد رکھتے ہوں، نہ مرتے ہوں نہ جیتے ہوں
خدا کے واسطے مجھ پر، پڑا ہے شوق کا شعلا
پیا تیرے مکھ پر خال خال کالے یوں   دو زلف بسیھر بال بال کالے یوں

ہیں جام مئے ناب تجھ لب کا   سو گلگوں شراب تجھ لب کا
میم مصحف رخ تمہارا ہے   ہم پڑھتے کتاب تجھ لب کا

تورے زلف کا زنجیر مورے گل میں دام ہے   تجھ دید میں دم عید جما جم کا جام ہے

منصب ہے عشق عاشق اور مقصود یک نگاہ
مجھ کوں یہ آستانہ، مسجد ،، سلام ہے
در پیچ زلف نانگ یوسف تو آمدہ
تر پچھن سوں جھوٹے ناہیں، جھوٹا کلام ہے

اب ایک ایسی کا نی ملاحظہ ہو جس میں صرف سر تال ہی کو پیش کیا گیا ہے: ۔

اچھے تدم تدم تن اندر تا نا نا نا
دیہی دیہی دھم دھم، تھا تھا، تہ تھئی تھئی، پریم
گگن گرجت، بدرت، برجت، ماتا جیہڑ و درجت چمکت
گجرت کا کا کا سن دھی، اجد بیٹا
گت گت بانا با نا جھنگیت، چھانا نا نا، ابر دو درمکت
گھنگت گھنا نا نا درِ درِ درِ درِ دھا دھا دھود ھود ھجیا
منگتت منگتت، کرمت، رحمت، یوسف، تو شفقت
لطفت چاہتت، تاری تاری کھورمت تار بجیا

---

(۱۳) "حضرت غلام شاہ لغاری"

۱۲۱۴ھ - ۱۸۰۰ - ۱۷۹۹ء ۱۲۷۸ھ - ۶۲ - ۱۸۶۱ء

حضرت غلام شاہ لغاری ان صوفیائے باصفا میں ہیں جنہوں نے دولت پر فقر کو، دنیا پر دین کو ترجیح دی۔ اور اپنے خالق کی رضا جوئی کے لئے دولت وحشمت پر لات مارکر فقر درویشی کو اپنا شعار بنایا۔ آپ نواب غلام اللہ خاں لغاری کے فرزند ارجمند، اور نواب ولی محمد خاں لغاری[1] وزیر اعظم میر نور محمد خاں تالپور[2] کے بھتیجے تھے۔ آپ کی پیدائش ۱۲۱۴ھ میں ہوئی۔ بہتر سے بہتر اساتذہ

---

[1] نواب ولی محمد خاں لغاری: بن غلام محمد خاں ۱۱۶۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۷ ذی قعدہ ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۲ء) کو انھوں نے وفات پائی۔ تالپوروں کے عہدِ حکومت میں انھوں نے نمایاں کارنامے انجام دیے۔ یہ تالپوروں کے وزیر مملکت اور سپہ سالار افواج سندھ تھے۔ انھوں نے سیاست وحکومت اور رزم آرائی میں غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ شاعری اور طب میں غیر معمولی دستگاہ رکھتے تھے، شاعری میں ولی تخلص کرتے تھے، ان کی اب تک حسب ذیل تصانیف کا پتا چل سکا ہے:۔

(۱) دیوان ولی فارسی (۲) نزہتہ الابدان (۳) ساقی نامے ۲ (۴) موعظت نامہ (۵) مثنوی ہیر و رانجھا۔ (تعلیقات تکملہ مقالات الشعراء: از سید حسام الدین راشدی صفحہ ۶۲۰)

[2] میر نور محمد خاں تالپور: وفات ۱۰ر شوال ۱۲۵۶ھ

اور علماء سے شاہزادوں کی طرح گھر پر تعلیم حاصل کی۔ سن شعور کو پہنچے تو اپنے والد کے ساتھ جو علاقہ عمر کوٹ کے گورنر تھے، معاون کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ آپ کے والد نواب غلام اللہ خاں لغاری کے انتقال (۱۲۵۳ھ ۱۸۳۷-۳۸ء) کے بعد میر نور محمد خاں تالپور نے ان کو علاقہ جاتی کا ناظم مقرر کیا اور ریاست کچھ میں انگریزوں کی سازشوں پر نظر رکھنے کی ہدایت کی، اور انھوں نے اس کام کو بہت مستعدی سے انجام دیا۔ کیوں کہ ۱۸۳۸ء ۱۲۵۴ھ کے آخر میں شاہ شجاع کو کمک پہنچانے کے بہانے سے جب انگریزوں نے سندھ میں وکر بندر کے قریب داخل ہونے کی کوشش کی تو غلام شاہ لغاری نے بڑی دانائی سے انگریزوں سے پہلے اس مقام پر پہنچ کر فصل خریف اور ساری ضروری اشیا کو اپنے قبضے میں کر لیا کہ انگریزوں کو رسد نہ پہنچ سکے اور وہ مجبور ہو کر واپس جائیں کرنل پاٹنجر نے، جو تالپور حکومت میں انگریزوں کی طرف سے سفیر مقرر تھا، برٹش انڈیا کی حکومت کو اس واقعہ کی اطلاع اس طرح دی ہے:

"۲۷ نومبر کو لفٹنٹ اسٹاک کا خط ملا کہ فوج دریائے سندھ کے دہانے پر پہنچ گئی ہے لیکن غلام شاہ جنھیں میر نور محمد نے ایک ماہ پیشتر وہاں بھیج دیا تھا انھوں نے نہ صرف اناج اپنے قبضے میں لے لیا بلکہ ہر قسم کی رسد کو فوج تک بھیجنے سے انکار کر دیا ہے۔"[1]

یکا یک حضرت غلام شاہ لغاری کا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا، اور وہ

---

[1] سندھ میں اردو شاعری صفحہ ۸۸ - ۸۹

جھوک عرف میراں پور کے صوفی بزرگ حضرت فضل اللہ شاہ قلندر کے حلقہ
ارادت میں شامل ہو کر عبادت و ریاضت اور خدمتِ خلق میں مشغول ہو گئے
آپ فارسی، اردو، اور سندھی کے بہت اچھے شاعر اور ادیب تھے۔ آپ نے
سلوک اور معرفت سے متعلق فارسی میں ایک رسالہ "انیس العاشقین" اور تصوف
پر ایک کتاب فارسی ہی میں "غوثیہ" کے نام سے لکھی۔ اپنے پیر و مرشد حضرت
فضل اللہ شاہ قلندر کے ملفوظات موسوم بہ "دردنامہ" کو مرتب کیا۔

حضرت غلام شاہ لغاری کو علم طب پر بھی مہارت حاصل تھی اور خدمتِ
خلق کے طور پر عوام کے علاج معالجے میں بھی اپنا وقت صرف کرتے تھے
اور اس طرح روحانی اور اخلاقی بیماریوں کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ جسمانی
امراض سے بھی نجات دلانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ انھوں نے علم طب
پر "نسخہ ادویات" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے جس میں اپنے تجربات اور
آزمودہ نسخوں کو قلم بند کیا ہے۔ اس کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں:-

"نسخہ ادویات بعضے از کتابہا و بعضے آزمودہ خود بندۂ درگاہ غلام
شاہ ولد غلام اللہ فقیر لغاری تجویز کردہ نوشتہ شد۔"

حضرت غلام شاہ لغاری کا وصال ۱۹ اپریل ۱۸۶۱ء مطابق ۱۲۷۸ھ
کو ہوا۔ آپ کو موسیقی سے خاص شغف تھا اور "سماع" سے بے حد ذوق رکھتے تھے
آخر میں ان پر سوز و سرمستی کا غلبہ رہتا تھا۔ آپ سندھی، سرائیکی اور اردو میں
زیادہ تر "کافیاں" ہی لکھتے تھے۔ آپ کے کلام پر مشتمل دو ضخیم بیاضیں آپ
کے خاندان میں محفوظ ہیں جن کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو اشعار میں

میں آپ سندھی اور ہندی الفاظ کافی استعمال کرتے ہیں اور غالباً اسی آمیزش
کی وجہ سے انھوں نے اپنے اردو کلام کو اپنی بیاض میں ہر جگہ "ریختہ" کا نام
دیا ہے۔ ان کے کلام میں عشق و محبت کی تپش بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے
اور تصوف و معرفت کے بہت سے اہم نکتوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ ان کا کچھ
اردو کلام جس کو بیاض میں "ریختہ کافی" کا عنوان دیا گیا ہے، درج ذیل ہے:-

آؤ رے سجن ہمارے پاس ۔۔۔ پریت لگی رے لگن گھنیری (بہت زیادہ)
تری تپش سوں خوش جگت ہے ۔۔۔ "لا" کی تیغ سوں سیس کٹت ہے (سر کٹتا ہے)
تم ری پی پیاس
غلام شاہ، من تار باجت ہے ۔۔۔ انحد گنگنا گہرا گاجت ہے
یار ملن کی آس

مردھنگ مرلی موہے من بجے بجے
باجت تار ستار
رفر ربانی روح باجت ہے ۔۔۔ ناد انحد گجے گجے
قلب رہیو گلزار
غلام شاہ کوں شاہ قلندر ۔۔۔ وائی دیو سائیں سچے سچے
پریم رس کو خمار

ساںجی کیجیے پریت صاحب سوں، ساںجی کیجیے پریت
کہے غلام شاہ تم جوش جگاؤ، عشق کی راکھو ریت

اکثر موقع پر اپنے پیر و مرشد حضرت فضل اللہ شاہ قلندر سے اپنی والہانہ محبت و عقیدت کا اظہار اِس طرح کرتے ہیں :-

شاہ قلندر پیر، پیر قلندر، موری لاج راکھو
تم ہیں جہاز سمنڈ کو ساجو، تم ہیں ہمارو سا گگو
اگوا
غلام شاہ کو سرن تمہاری، تار کرو تم تاگمھو
ٹھہرا اتھلا پانی

میرے دل رہیو صاحب تیرو نام
مطرب، ساقی، سہج خماری رہیو محو مدام
غلام شاہ نوں شاہ قلندر دیو بھر بھر جام

رکھیے یار، یگانگی، ایک سوں ایک ہو رہیے
حرف حقانی پریم کا پڑھیے، دل درد دھیان جو دھریے
کریے دور دوگانگی
تا رطلب سوں گوش ریجھیے، گگن منڈل کا ساز بجیے
بھیجیے بھول بیگانگی
غلام شاہ نوں شاہ قلندر، راہ بتائی مہر نظر کر
رکھیے من مستانگی

غلام شاہ کوں ملیو قلندر ⁖ پریم پیالو پیو جو بر کر
ہر دے میں "ھو" جو منگ بجت ہے
ہر دل

اب ذرا ان کے عشق و محبت کی تپش کو بھی محسوس کیجیے :-

داری رس بچ رہیو روح ہمارو

محبت مجھ کوں محو گیو	من ہمارے بیچ رہیو
انحد باجے بجت گھنیری	گگن ھس پر گنج رہیو
غلام شاہ نوں قلندر ملیو	نام صاحب کو بیچ رہیو

اے تن ہو یا گرم گداز	تیری تپش سوں موم گلت ہے
عشق صاحب کا شاہین ہو یا	تیز کرے پرواز
بحرِ وحدت کی موج جگائی	کیا نشیب و فراز
غلام شاہ کا حال حقیقی	من اندر ممتاز

عشقے ذات دیوانہ ہے، برہے ذات مستانہ ہے
حسن بن آوے آگ لگاوے
لوگ ھمن سوں مت مت ملئے، ہم مخفی خفقانہ ہے
کرتا یاد یگانہ ہے
شاہ قلندر شاہ ہمیں کا، فضل اللہ فرزانہ ہے۔
ہم حلقہ بگوش شہانہ ہے
ساقی صاف پیالہ دیا، من مورے میخانہ ہے
خاص خمر خمانہ ہے

غلام شاہ سر انحد باجے، کھلیا راز ربانہ ہے
دل اندر ددوانہ ہے

پی کی پیاس بجھے، نیناں نیند نہ آوے
پی بچھڑے ہم چین نہ کوئی، نیناں سوں جل جاوے
لوک سوتا ہم جوش جگاوت، سیس کاٹ پگ پاوے
انحد کی گھنگھور بجت ہے، دم دم گوش دلاوے
غلام شاہ کے تم انگن آوو، دل لوں سہج سماوے
رگ رگ میں

اے دل موری، تجھ کے دیکھن بن ہوئے دیوانی
باب طلب سوں دن رین گذرتے، ہو رگی موری تودی
سرمنڈل سیھ، انحد باجے، سن جر(کی) گنگھوری
لوک سوتا، سبھے سوتا، ہم جاگت چوری چوری
عالم
من موہن تم آنگن آوو، دور کرو تم دوری
غلام شاہ کے صاحب سمریو، نام نرنجن نوری

من مورے موں محبت لاگی، ساز سُجانی باجت تار
راز ربانی روح باجت ہے، انحد جوت کا پار
"ھو ھو" کرتا گوش آوازاں، سرمنڈل اسرار

غلام شاہ کا بیخود ہویا، "قلب رہیو کلتار
اب حقائق" کے موتی کا بھی نظارا کیجیے ۱ -
جاگ جاگ نیناں نیند نہ کیجیے، من بایا مستانا
عرش الٰہی قلب تمُارا، ہُویا تخت ربانا
"تار طلب" کی تن موں لادو، انحد کر استانا
نیچے نیچے نرت جو راکھو، سرت کھمد اسمانا
غلام شاہ کا عشق عجائب، راکھو دل دھیانا

جو بھن، جہاں، فانی مکاں، جگت نہ آوے کسی کام
چل گئے سکندر، چل گئے دارا، چل گئے خان جوان
نیناں نیند گنوا کے جاگو، جاگو موری جان
سرمنڈل تن تار بجادو، ذکر کرو یزدان
دوس کے دوارے دھن لگادو، تر دیچ کھلی ریحان
دوست
غلام شاہ سر پاویں دھرے، تجھیو قدم قدم قربان

صاحب سمرنا سہج سماوو، حرص بھلادو دن رات
علم کتاباں کام آوں، پڑھ کا برہ کی بات
فاذکرونی اذکرکم، تند بجا کر تا ت
غلام شاہ رکھ شوق دامی، پورا رہ پربھات

دلیں نقیری ناھیں کوئی، خیال فقیری کیجئے یار
(بھیس، لباس)
سرمنڈل تن تار بجادو، انحد راگ سوں ریجھے یار
غلام شاہ کا ھو کے رہیئے، صاحب نام جپیجئے یار
(ورد کیجیے)

مورے من کا ادھار، پاک پروردگار، توھیں ستّار
آپ رب عرب سے آیا، نور نبی کا بیت بنایا
پیچوں اپن اپار، رب غفّار
ذکر صاحب کا روح کی راحت، نام نورانی عجب نعمت
کاٹے کفر اندھار، دود آزاد
تن من لاگی تار طلب کی، قلندر کھولی کل قلب کی
لگ رہی پریم پکار دیوٹ کیلد
غلام شاہ کو سری تماری، روز شباں موں کرتا نادی
کرم کیجیے کلتار، سیر بجن ہار

چوٹی کے اوپر چنگ بجت ہے، چوٹ اپنگ سینگ بجت ہے
انحد عرفاں بے حد باجے، محبت دیتے صاحب سانچے
ساز فرنگ، سارنگ بجت ہے
گنگا گرجت برہ لگاوت، بوند بہار کو بدہ لبساوت
مرو، ار دھنگ بجت ہے

چل جاتی تیری عمر حیاتی، سمجھ سمجھ کچھ کرلے
دن بھی گذرا رین بھی گذری، دکھ بھی گذرا، چین بھی گذری
گذر گئی پربھاتی
غلام شاہ تن تار بجادو، بیخود ہو کے حق نوں پاوو
صفت سماوو ذاتی

لودی جاں موں کوئی جان ہے، جاناں جملہ جہاں ہے
موری سیس موں کوئی سیس ہے، اُس سیس سر ساماں ہے
موری روح موں کوئی روح ہے اُس روح موں رحماں ہے
موری بات موں کوئی بات ہے، اُس بات بے پایاں ہے
موری درد موں کوئی درد ہے اُس درد موں درماں ہے
کوئی غلام شاہ کوں شوق ہے اُس شوق موں سبحاں ہے

چلنا ہے، نہیں رہنا، خاک مٹی سوں رولنا
تار برہ دی تن، وجادو، سیس کاٹے پگ دھرنا
غلام شاہ کا ہو کے رہیے، صاحب نام سمرنا

گگنے کی گھنگھور، آنے انے گگنے کی گھنگھور
آپ درو، نے پی پد پایا

سرمنڈل سرساز جو باجے، باجے تار طنبور
چوٹ لگی جو تال جو باجے، باجے مروجنگ اور
انبر آب حیاتی پیا، من ہوا مخمور
غلام شاہ نے "قلندر پایا"، پایا پاک حضور

من کی مرلی اور بلاجے، "تار طلب طنبورہ باجے
دشیم (دشمن) ودارے دھن سن لاگے، الخد گگنا گاجے
غلام شاہ کو دھیان ذکر سموں، دیا "قلندر سانچے

دل مورے موں دوست کا ڈیرا، سائیں کا ڈیرا
قلب کے بیچ ہے کعبہ جو قبلہ، بیچ ہے گنگا بیچ بہے دجلہ
من ماہیں تیرتھ میرا
غلام شاہ کو قلندر دیا، پیالا پریم کا بھر کر پیا
باجے الخد گھیرا

بھلا یجیے دوجا (دوسرا) نام، نام نورانی سمرن مدام
نام صاحب سوں سبھ دکھ اترے، دیتا دل آرام
کیجیے یاد دہاگ کے ویلے، صبح و شام
(جب رات ڈھلتی ہے، تہجد کے وقت)
نین جگا کے نیند کو اوو، راکھو طلب تمام
عشق آواز سنو من مورے، بھیجو جگری جام
عمر بھی سبھ ہاتھ نہ آوے، جگت نہ آوے کام
غلام شاہ رہو سرن صاحب کے، دونے جگ بسرام

(۱۴۲) خلیفہ نبی بخش لغاری قاسم

۱۱۹۰ھ - ۱۲۸۰ھ
۱۷۷۶ء - ۶۴-۱۸۶۳ء

حضرت خلیفہ نبی بخش لغاری قاسم کے والد ملا لتح خاں لغاری تحصیل ٹنڈہ باگو، ضلع حیدرآباد کے ایک گاؤں میٹھی کے رہنے والے تھے۔ حضرت نبی بخش کی پیدائش ۱۱۹۰ھ میں اپنے گاؤں میں ہوئی۔ فارسی، عربی کی تعلیم حاصل کر لینے کے بعد اپنے گھر کے کاموں میں لگ گئے۔ پچیس ۲۵ سال کی عمر میں عشق کی لذت سے آشنا ہوئے، اور پھر یہی عشق مجازی، عشق حقیقی تک پہنچانے میں ان کا راہ نما ہوا۔ پچیس سال کی عمر میں ایک لڑکی سے ان کو محبت ہوگئی، اور انھوں نے اس سے شادی کر لی۔ کچھ ہی عرصہ کی رفاقت کے بعد ان کی محبوب بیوی ان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئیں۔ اور یہی ان کی زندگی کا اہم موڑ ثابت ہوا۔ دل دنیا سے اچاٹ ہوگیا، اور اس کی بے حقیقتی ان پر روشن ہوگئی۔ عشق مجازی نے جو آگ لگائی تھی، اس کی شعاع، عشق حقیقی کی راہ دکھانے میں ان کی معاون ہوئی اور وہ اپنی منزل کو پہنچ گئے۔ "پیاسا" "کوزہ" کھو کر اس کی تلاش میں "کوزہ گر" کی دوکان تک پہنچ گیا۔ اور پھر اسے کوزے کی فکر نہ رہی

اپنے خالہ زاد بھائی قاسم کی وساطت سے ۱۲۳۰ھ (۱۵-۱۸۱۴ء) میں وہ اس دور کے برگزیدہ عالم دین، صوفی باصفا اور ولی اللہ حضرت پیر صاحب محمد راشد

عرف روضے دھنی[1] حضرت پیر پگاڑو کے جدِ اعلیٰ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلسلۂ قادریہ میں ان کے دستِ حق پرست پر بیعت حاصل کی۔ عرصے تک ان کی خدمت میں حاضر رہ کر روحانی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے بعد عبادت و ریاضت اور تزکیۂ نفس میں مشغول ہو گئے۔ حضرت پیر صاحب محمد راشد نے ان کو روحانی فیض سے مالا مال کر دینے کے بعد خرقۂ خلافت اور اجازت نامہ سے نوازا۔ اپنے پیر و مرشد سے رخصت ہونے کے بعد وہ کاٹھیاواڑ، گجرات اور سندھ کے مختلف حصوں میں سفر کر کے سلسلۂ قادریہ کی اشاعت اور خدمتِ خلق کرتے رہے۔ ان کی بزرگی، تقدس، اور روحانیت نے عقیدت مندوں اور مریدوں کا بہت بڑا حلقہ ان کے گرد جمع کر دیا۔ اور وہ رشد و ہدایت میں مشغول رہے۔

۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳-۴۴ء میں سندھ پر انگریزوں کا غاصبانہ قبضہ ہونے کے بعد ان کو بعض وجوہ کی بنا پر اپنے آبائی گاؤں میٹھی کو چھوڑنا پڑا اور ٹنڈو باگو سے چھ میل دور مغرب کی طرف انھوں نے ایک غیر آباد جگہ میں اپنی کٹیا بنا لی۔ وہ بستی اب حضرت کے آبائی گاؤں کے نام پر "خلیفن جی میٹھی" کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت خلیفہ نبی بخش لغاری وہاں آخر وقت تک تبلیغِ دین اور خدمتِ

---

[1] پیر محمد راشد روضے دھنی ۱۱۷۰ھ میں پیدا ہوئے اور یکم شعبان ۱۲۳۳ھ کو وفات پائی حضرت پیر پاگارا کا سلسلۂ سجادگی ان ہی بزرگ سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت پیر محمد راشد صاحب؛ تصنیف بزرگ تھے اور سندھی اور فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے (تکملہ مقالات الشعراء ص ۲۴۴)

خلق میں مشغول رہ کر ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۳ء میں نوے سال کی عمر میں واصل بہ حق ہوئے اور وہ گاؤں آج بھی اپنے تقدس کی وجہ سے عوام میں عزت و عقیدت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

حضرت خلیفہ صاحب سندھی، سرائیکی، اور اردو زبان کے قادر الکلام شاعر تھے۔ چونکہ ان کے خالہ زاد بھائی قاسم نے عشقِ حقیقی کی منزل تک ان کی رہبری کی تھی۔ اس لئے اظہارِ ممنونیت کے طور پر انھوں نے شاعری میں اپنا تخلص قاسم ہی اختیار کیا۔ ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸-۳۹ء میں "سسی پنہوں" کی مشہور داستان کو انھوں نے مثنوی کی شکل میں بہ زبان سرائیکی منظوم کیا جو آج بھی سرائیکی ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور ان ہی کی تقلید میں اپنے سندھی کلام کے مجموعے کا نام انھوں نے "رسالو" رکھا۔ سندھی اور سرائیکی کے علاوہ حضرت خلیفہ صاحب نے اردو میں بھی مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی فرمائی ہے جو ان کے سندھی مجموعۂ کلام رسالو کے آخر میں اس عنوان کے تحت درج ہے،

"ایں خبر در زبانِ ہندوستان در سلوک و مناجات و غزلیات

(دوا سہاسے) در ریختہ (دوا گہاسے) وٹھہ دما سو وڑہ دسہر ادبھجی ہوری"

خلیفہ صاحب کے رسالو کو ڈاکٹر نبی بخش خاں صاحب بلوچ نے ایڈٹ کر کے سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے ۱۹۶۶ء میں شائع کرایا ہے اور ان کا اردو کلام بھی بعینہٖ آخر میں (ص ۲۴۳ تا ص ۲۶۴) شامل کر دیا ہے۔ اس طرح حضرت خلیفہ صاحب کا بائیس صفحات پر مشتمل اردو کلام بھی منظرِ عام پر آ گیا ہے۔ اور اس

کے لئے اُردو دنیا ڈاکٹر بلوچ کی احسان مند ہے۔ اس جگہ ہم اس مطبوعہ نسخہ سے حضرت خلیفہ صاحب کا کچھ اُردو کلام پیش کریں گے جو مطبوعہ کتاب رسالو کے صفحہ ۲۴۲ تا صفحہ ۲۶۳ میں موجود ہے۔

"نکتہ ہائے در سلوک و توحید" کے عنوان سے حضرت خلیفہ صاحب نے کچھ اشعار قطعہ کی شکل میں لکھے ہیں جس میں حقائق و معرفت کے موتی بکھرے گئے ہیں۔ زبان بھی حد درجہ رواں اور صاف ہے:۔

"نکتہ ہائے در سلوک و توحید"

ایا شاہ بیزنگ در باغ رنگ
لگی رنگ کی رنگ میں خوب جنگ

لگا عشق کا تب سے ڈنکا تمام
کیا ترک جنت کوں آدم امام

نہ کہتے ہیں آدم کا مادر پدر
کدھر کا چلا ہے پھر آیا کدھر

تو لیس ہیں دیکھ کن فیکون
کہ ہیا ہوا پل میں گونا دگوں

میں ماں باپ سیں بھی تو آگے ہوا
نہ دیکھا اسی دیس جیتا موا

کہاں سوں میں آیا کہاں جاؤں گا
کسی بات سوں ڈر کے پچھتاؤں گا

نہ مشرک، نہ مومن، نہ ایمان بر
نہ قاتل یزیدی، حسینی، نہ حر

نہ بامھن، نہ جوشی، نہ زنار پوش
نہ ملا، نہ قاضی نہ منکر کی مے نوش

نہ ذاکر، نہ شاکر، نہ غافل غرور
نہ جن و پری زاد، ملکی نہ حور

نہ خالق خدا، نہ خدا سے جدا
یہودی، نصارٰی، نہ قوم لدا

نہ میں رافضی ہوں، نہ سنی صحی
نہ پڑھتا ہوں پوتھی، نہ صرف و نحو

ثوابوں سے الفت نہ طالب خطا
مری ذات مجھ کوں کو دیوے بتا

نہ میں جانتا ہوں کہ میں کون ہوں
نہ لوہا، نہ پیتل، نہ میں سون ہوں

نہ ہاشم نہ قاسم محمد ملوک
نہ جھگڑا کسی سے نہ کرنا سلوک

اسی دیس میں چل کے آیا جبھی
مذاہب طریقے ہیں دیکھے تبھی

کیا موج رنگین آبِ حیات
حباب بھی ملیا، آپ سیں آپ آپ

دکھاتیاں ہیں موجاں طرح طور طور
سبھوں میں ہے پانی نہیں اور اور

وہ بھیدی پچھانے اسی بھید کوں
پچھانے کا جو شاہ ناپید کوں

بحر میں پڑی بوند ہو گئی بحر
بحر سے بحر ہے بحر سے بحر

بحر سے نکالے بھلا کون بوند
بحر سیں ملی بوند ہو گئی سمونڈ

نظر بیچ آئے عجب ایک کھیل
یہ ہے کھیت بویا نہ ساتھی نہ بیل

کہ آگے بھی تھا ان، پیچھے بھی ان
ملیا خاک سیں ایک ساتھی کا تن

رہیا پہنچ اپنی اصل سے اصل
نہ آیا ہماری نظر میں نقل

حضرت خلیفہ نبی بخش قاسم نے غزل میں بھی عشق، سرمستی کی کیفیات کو سمو کر تصوف کے رازہائے سربستہ کو بے نقاب کیا ہے۔ زبان قدیم ہونے کے باوجود خاصی رواں اور دلکش ہے۔ محبت کی تپش اُن کے ایک ایک شعر سے محسوس ہوتی ہے:۔

"غزلیات"

مجھ تشنگی کی آگ بجھانے کوں نہ آیا
پھر جام وصل جانی پلانے کوں نہ آیا

تجھ عشق کی آتش میں سدا جلتا رہا میں
ٹک میں بھی نینوں سے ملانے کوں نہ آیا

ہم عاجز و مسکیں کوں کب ہاتھ سے اپنے
یک بار سجن پان کھلانے کوں نہ آیا

صد سوال کیئے "قاسم" ہنس بول توں ہم سے
ٹک بھیکھ گدائی کا دلانے کوں نہ آیا

گلشن کی خبر خوب صبا باد سے پوچھو
تصویر قد سرو کی شمشاد سے پوچھو

بے درد کو معشوق سے کیا کام ہے یارو
شیریں کی حقیقت بھلا فرہاد سے پوچھو

کہتے ہو نہ جاتے ہو ستاتے ہو بھلا کیوں
تقصیر مری کیا ہے پریزاد سے پوچھو

نکلا ہے ستمگر وہ لے کر تیغ ادا کی
مجھ خوں کی خبر خنجر فولاد سے پوچھو

غم درد کی تصویر قاسم کن کوں بتاؤں
آواز مری آہ کا تم نماد سے پوچھو

اے مست شتابی آ میخانہ بلاتا ہے
سر کاٹ لے آ ہاتھ میں خمخانہ بلاتا ہے

شب روز صراحی کو لبریز کیا کیجیے
پھر جام لے آ ساقی مستانہ بلاتا ہے

حضرت خلیفہ صاحب کے کچھ اردو اشعار "ریختہ" کے عنوان کے تحت لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ اُن کی زبان نسبتاً زیادہ سندھی اور ہندی آمیز ہے اور یہ کافیوں کے انداز میں لکھے گئے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے ان اشعار کو ریختہ کا نام دیا گیا ہے۔ خیالات بڑے گہرے اور عارفانہ ہیں :-

جا ہونی سا ہو رہی، سُن بات یہی، میں سو رہی
انہونے کے ہونے خاطر کتنے عالم رو رہی
جو ہونا ہے سو ہو رہا، جو کھونا سو کھو رہی
ایک بھول تب پہچانی، انکھ دیکھ جب دو رہی
لاکھ سوار دوڑاتے گھوڑے، واں کے واں ساگو رہی

قاسم بن ٹھن عشق بقا سں، باغ بقا کا بو رہی

رہتی شب و روز پریزاد مرے دام سیں دور
لاؤں کس طرح اپنے پیا آغوش میں حور
کوئی بتلا دے مجھے تو نہ جاؤں میں کا مرد دیس
کروں فرماں میں اپنے بلا حور ضرور

سکھی رہی میں کیسے سنگ بھیجوں گی سندلیوا
پریم، رہے تم اب تو بدلیوا
آؤں کہہ گئے، انھوں نہ آئے، ڈھونڈھ رہی میں پورب دلیوا
اُٹھ چل قاسم پیا کوں لاؤں کرکے جوگن بیسوا

بچھڑں کی نہ کہو مات، پیا بات بری ہے
ہجرت گی مرے تن میں تری تیز چھری ہے
ایک لٹک سیں ہونٹ گیا شوق سیں اسرار
اس ناز پر کے نیچے، لب تیز تری ہے
یری رو کا من جگ میں مشکل ہنوز ہے
دوبارہ میں پایا نہیں سب خشک تری ہے
قاسم لٹک کے چمن میں کب سیر سرو چمن
شرمندہ اس کے آگے سو آج پری ہے

آپ نے رسول اللہ کی شان میں "سہرا" کے عنوان سے کچھ اشعار لکھے ہیں، جن سے ان کی والہانہ محبت اور سرمستی کا اندازہ ہوتا ہے: "نعتِ رسول" کا یہ بھی ایک دلکش انداز ہے، مثلاً:-

اللہ کے نام پر میں بل جاؤں
کبریٰ کے گھر احمد آیا سید کے سہرے گاؤں
پنجتن پاک، دوازدہ امام محمد کا درشن پاؤں

آج دھن دھن رے آج دھن دھن
میرے ہی مندروا آویں گے نوشاہ
شبھ دن شبھ گھڑی پر گھٹیو محمد
چین سیں بھری سب دھرتی گھن گھن
عبداللہ کے گھر آنند بدھائی
ناچت پری حور، پائل کی چھن چھن
گندے ری مالن، پھولوں کا سہرا
نبی کی مچی دھوم، قاسم بن بن

حضرت قاسم نے "بھجن" کے عنوان سے کچھ ایسے اشعار بھی کہے ہیں جن میں ہندی الفاظ کا بہت زیادہ غلبہ ہے اور انھیں پڑھ کر کبیر داس کی یاد آجاتی ہے:-

"بھجن"

مت بسیار و رے ہوا من میں ھری کی بات
بھائی بہن کٹم قبیلہ، کوئی نہ چلے گا ساتھ
رام نام کی سمرن جپنے، یہی چلے گا سنگات
گنگا جمنا کا ہے کوں جانا، گھٹ میں بسے تیرے ناتھ
صاحب کی بندگی کرے قاسم آنسوں بھری دن رات

رام کے سادھو رام جپو رے، اور سوں کیا تیرا کام
سب جگ چلنا تم بھی چلوگے کون کرت بسرام
گنگا قاسم کا ہے کوں جانا، رام بسے بس تیرے گام

"ھوری"

پھاگن کے دن چار سکھی ری، میں اپنا لال منگا نہ دوں گی
سونا بھی دوں گی، واری روپا بھی دوں گی، کنٹھ نہ دوں گی ادھار سکھی ری
ہیرا بھی دوں گی، واری موتی بھی دوں گی، دوں گی پھولوں کا ہار سکھی ری

"راسوڑہ"

ارے اڑ کاگا، کبھی آویں گے، خبر لے آ میرے جانی کی
آدن کہہ گیو نہیں آیو رے، میرے لالن کنے برما یو لیے
میرے یہ دکھ کٹ جاویں گے
کاگوا کہے میں اڑ جاؤں، تیرے پاس پیا کو لے آؤں

تجھے ہنس ہنس گرھو لگا دیں گے

نیر د لالن آیو ری گوری، تم کھیلو پیا سنگ اب ہوری

تیرے تن کی آگ بجھا دیں گے

قاسم جن کی ہوں میں داسی، میرے من کے اُن پر یہ آسی

مجھے کلمے سے پاس بلا دیں گے

---

(۱۵) حضرت قادر بخش بیدل

۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۴-۱۵ء — ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲-۷۳ء

حضرت قادر بخش بیدل کے والد ماجد محمد حسن، اولیاء اللہ کے مسکن شہر روہڑی کے ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ آپ نے جھوک شریف کے پیر طریقت حضرت شاہ عنایت اللہ صوفی شہید سے قادریہ سلسلہ میں بیعت کی تھی۔ پیشے کے لحاظ سے آپ پارچہ بافی کرتے تھے۔ ۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۴-۱۵ء میں اللہ نے آپ کو ایک فرزند بخشا جس کا نام قادر بخش رکھا گیا۔ یہی لڑکا آگے چل کر ایک بلند پایہ عالم، مرجع خلائق صوفی، قادر الکلام شاعر، اور صاحب طرز ادیب اور مصنف کی شکل میں دنیا کے سامنے رونما ہوا۔ ان کی وجہ سے نہ صرف ان کے خاندان اور ان کے شہر روہڑی کو چار چاند لگے۔ بلکہ ان کی تعلیمات اور رشد و ہدایت کے باعث سندھ کے عوام کو ہدایت نصیب ہوئی۔

حضرت قادر بخش بیدل کو شروع ہی سے تصوف کی طرف بہت زیادہ رغبت تھی۔ چنانچہ آپ نے اس وقت کے جید علماء سے علوم ظاہری کی تحصیل کے بعد روحانی فیض حاصل کرنے کے لیے سیوہن شریف کا رخ کیا اور وہاں عرصے تک حضرت قلندر شہباز[1] کی درگاہ کی جاروب کشی کرکے

۱۹۹

---

[1] حضرت قلندر شہباز، ولادت ۵۷۳ھ / ۱۱۷۷ء وفات ۶۷۳ھ / ۱۲۷۴ء مدفن سیوہن شریف (تذکرہ صوفیائے سندھ)

فیضان حاصل کرتے رہے، وہاں سے "پیر جو گوٹھ" (ضلع خیرپور) حضرت صبغۃ اللہ شاہ[1] پیر پگارو کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن سے روحانی تربیت حاصل کرتے رہے۔ حضرت صبغۃ اللہ شاہ صاحب نے اپنے صاحبزادے پیر علی گوہر شاہ کی نگرانی آپ کے سپرد کر دی تھی۔ آپ پیرزادے صاحب کو مولانا رومی کی مثنوی کا درس بھی دیتے تھے۔ وہاں سے رخصت ہو کر آپ "پریالوہ" (ضلع خیرپور) میں مخدوم محمد اسماعیل[2] کی درگاہ پر قیام پذیر ہو گئے، اور کچھ عرصہ وہاں ٹھہر کر کسبِ فیضانِ روحانی کرتے رہے۔ پھر اپنے وطن روہڑی واپس آ کر ایک دوکان لے کر بیٹھ گئے، اور تجارت ہی کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ ساری زندگی روہڑی میں ہی قیام کر کے رشد و ہدایت اور خدمتِ خلق میں مشغول رہے، اور

---

[1] پیر صبغت اللہ بن پیر سید محمد راشد اپنے والد کی وفات کے بعد مسند آرائے رُشد و ہدایت ہوئے۔ سید صبغۃ اللہ اول علم و عمل کا پیکر تھے، باشندگانِ سندھ کے نزدیک سارے ملک میں ان جیسا کوئی شیخ و مرشد نہیں تھا۔ تقریباً تین لاکھ بلوچ ان کے مرید تھے۔ ان ہی مریدوں سے سید پیر صبغت اللہ نے سرفروش اور جان باز مجاہدوں کی ایک جماعت تیار کی تھی، جو ملتِ اسلامیہ کے لیے اپنی جان کی بازی لگا سکیں۔ ان ہی مجاہدوں کو حُر کا لقب دیا گیا، اور یہی حُر تحریک پہلا نقطہ تھا۔ حضرت سید پیر صبغت اللہ اول نے ۵ رمضان ۱۲۴۶ھ کو وفات پائی۔ (تذکرہ صوفیائے سندھ تالیف اعجاز الحق قدوسی، ص ۲۷۳ و ۲۷۴)

[2] مخدوم محمد اسماعیل پریالوہ: وفات ۱۱۷۴ھ (تذکرہ صوفیائے سندھ، ص ۲۶۳، تالیف اعجاز الحق قدوسی)

۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲-۷۳ء میں وہیں انتقال فرمایا۔ آپ کا مزارِ مقدس روہڑی اسٹیشن کے قریب آج بھی مرجعِ خلائق ہے۔

حضرت قادر بخش بیدل فارسی، اُردو، سندھی اور سرائیکی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ فارسی میں آپ کی مندرجۂ ذیل متعدد کتابیں نظم و نثر میں مذہب اور تصوف پر موجود ہیں:-

(۱) رموز العارفین (نظم)، (۲) تقویت القلوب، (۳) پنج گنج، (۴) ریاض الفقر (۵) سلوک الطالبین، (۶) رموز قادری، (۷) منہاج الحقیقت، (۸) نہر البحر، (۹) الفوائد المعنوی، (۱۰) مصباح الطریقت، (۱۱) قرۃ العینین فی مناقب السبطین، (۱۲) فی لطن الاحادیث، (۱۳) لغات میزان الطب، (۱۴) وحدت نامہ، (۱۵) سیر نامہ،

حضرت قادر بخش بیدل اُردو کے بھی صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ آپ کی زبان تیرھویں صدی ہجری کے شعرائے اُردو کی طرح قدیم ضرور ہے لیکن اندازِ بیان میں بڑی بے ساختگی، پختگی، روانی، سادگی اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ پورے کلام میں عارفانہ سرمستیوں کی جھلک نمایاں ہے۔ اکثر مقامات پر تصوف کے باریک نکتوں کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ اُس دور کے صوفی شعراء کی طرح اُن کے اُردو اشعار میں ہندی اور سندھی الفاظ کی آمیزش ملتی ہے۔ سندھی الفاظ کی آمیزش تو فطری ہے کیونکہ اس سے ہمیں سندھی ریختہ "کے ارتقا کا پتا چلتا ہے۔ لیکن ہندی الفاظ کی آمیزش کا سبب غالباً سندھ کا ایک طرف بمبئی اور دوسری طرف پنجاب کے ہندوؤں سے بہت زیادہ خلط ملط ہو سکتا ہے۔

حضرت بیدل کو حضرت قلندر شہباز ؒ سے بڑی عقیدت تھی، چنانچہ ایک جگہ اس کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:۔

دلا مت ڈر ز ہولِ روزِ محشر
پکڑ لے دامن ابن پیمبر

شہِ شاہانِ عرفاں دین پرور
قطب ارشاد عشاقاں کا رہبر

مرا مرشد مکمل ہے قلندر
حسینی حیدری سلطان سرور

اُن کے نمونۂ کلام کے ضمن میں پہلے چند غزلیں درج ذیل ہیں:۔

"غزلیات"

دلِ وحدت طلب فارغ ز قیدِ جسم و جاں ہوگا
کہ بیٹھک عاشقاں دائم بہ ملکِ لامکاں ہوگا

اُٹھا اس فرشِ خاکی سے قدم چڑھ جا فلک اوپر
کہ سات آکاش ہمت کے اگے اک نردباں ہوگا

طلب مطلوب طالب کو احد کر جان وحدت میں
کہ بجز ذاتِ بے رنگی محیطِ بے کراں ہوگا

وہی اول، وہی آخر، وہی ظاہر، وہی باطن
خودی کے ترک میں مخفی جو ہے وہ سب عیاں ہوگا

دوئی کے وہم سے بیدل ترا دل گر ہوا فارغ
ظہور اس ذاتِ مطلق کا جہاں چاہیں وہاں ہوگا

جب سوں زاہد نے سُنی اُس رخ پُر نور کی بات
بھول گئی اُس سے کرے شوق سوں تب حور کی بات

محفلِ بحث میں ممتاز ہیں اربابِ علوم
محکمہ عشق میں منظور ہے منصور کی بات

مجلسِ وجد میں کیا کام ہے خود بینوں کا
بزمِ رنداں میں نہیں زاہدِ مستور کی بات

عقل اپنی سے ہو کیا سرِّ ہویّت کی سمجھ
جو اُسے کب نہ سنیں گے ایسے دستور کی بات

وہ جو محکم مجھے دیتا ہے تسلی بیدل
نحنُ اقرب سے فراموش ہوئی دُور کی بات

ہمیں اسرار وحدت کا نفی اثبات میں دیکھا
سراسر نور بے رنگی ظہورِ ذات میں دیکھا

نفی جب تک نہ ہو ہرگز نہ پاوے ذوقِ اثباتی
اسی شطرنج کا ہم جیتنا اب مات میں دیکھا

کوئی جو ہو رہا عاشق انکھ بیچوں منزہ پر
اروپ اور روپ کا اُس نے لقا لمعات میں دیکھا

نہ ہوئے بوالہوس! راغب پیالے کا بہ پنداری
کہ جام و تیغ ہم واللہ سجن کے ہاتھ میں دیکھا

کسی منصور سے پوچھا سبب انشائے معنی کا
کہا میں مطلبِ والا ابھی اسمات میں دیکھا

یہ بیدل سُن دنی انفسکو اس معشوق ہمدم سے
کہ ہم مصباح احدیت اسے مشکات میں دیکھا

دو جگ کا بادشاہ ہے مستِ شرابِ عشق
عالی ہے ہر جناب سے لا شک جنابِ عشق
شیرِ صفت نہ رہ توں ہوس کے حجاب میں
باہر نکل کے دیکھ رُخِ آفتابِ عشق
دوزخ کی آگ کب یہ جلاوے اسی کے تئیں
یہ جسمِ سوختہ کا ہوا کل کبابِ عشق
زاہد پہ نہیں سرِ وحدت کا منکشف
گر فتحِ باب چاہیں تو مت چھوڑ بابِ عشق
طنبورِ چرخ کا نہ بنایا حکیم قدر
جب سوں ہے بزمِ راز میں غلغل ربابِ عشق
تابع ہیں عاشقاں کے چہ ابر و چہ آفتاب
دوزخ بہشت جانتا ہے آب و تابِ عشق
جوں کہ پوچھتا ہے عشق کون چیز ہے
کہہ جو بیدل اس کے تئیں کہ ابھی سُن جوابِ عشق

حیران ہوں کہ قد کو تمہارے میں کیا کہوں — طوبیٰ کہوں کہ سرو کہ نخلِ وفا کہوں

ترے حُسن کی دیکھ تجلّی اے رشکِ حور — سورج کہوں کہ چاند کہ نورِ خدا کہوں
ابرو تمہارے کو جو ہے شکلِ ہلالِ عید — محراب سجدہ طاعتِ اہلِ صفا کہوں
ترے نین پُر خمار کو سرمستِ بادۂ ناز — یا بے خودی کا جام یا سحرِ بلا کہوں
مژگاں ترے کو جو کہ ہیں چنگل عقاب کے — ناوک کہوں کہ نوکِ سنانِ جفا کہوں
خال سیہ ترے کو جو ہے عکسِ داغِ دل — اسود حجر کہ دانۂ مرغِ ہوا کہوں
لب لعل ترے سے دُرِ دنداں چمکتے ہیں — میں اس شفق کے رنگ کو پروین نما کہوں
تیری گلی کی خاک کو بیدل کے واسطے
یا غالیہ عبیر کہوں تو تیا کہوں

[illegible] ۱۰۷-۱۰۸-۱۰۹

میں ہوں مشہور عشق بازی میں — خاصہ دردِ غمِ مجازی میں
نازنیں سب ہیں سنگدل لیکن — تو ہے ممتاز بے نیازی میں
آج گلشن میں جلوہ دیکھو کر چرچا او رہے — باغ میں گل رُخ کے آنے سے تماشا اور ہے
نکہتِ سنبل بنفشہ سے معطر ہیں دماغ — عطر بیزی شاخِ آس زلف چلیپا اور ہے
مرتا ہوں تیرے ناز کا آغاز ہے ہنوز — خوبی کفن یہ ناوک انداز اور ہے

رات تجھ لب پکار رکھتے ہیں — دن سبھو انتظار رکھتے ہیں
لعلِ لب کی قسم کہ گوہرِ اشک — محض سبھو نثار رکھتے ہیں
نزہتِ وصل یاد کر کے مدام — چشم کوں آبدار رکھتے ہیں
برقِ رخسار کے تماشا میں — دیدہ ابرِ بہار رکھتے ہیں

[illegible]

اُردو میں اُن کی ایک "کافی" بھی ملاحظہ ہو:-

وہ بے رنگی رنگ آپ آدم بن آیا
روپ کا اوڑھ نقاب اور وعید سڈ آیا

وہ اروپ سروپ ہو آیا — عشق و حسن کا کھیل کھلایا
وہ لول وہ القاب ساجن سر دھرایا
کہاں وہ پہنے پوش عرب کا — ہووے ساقی جام طرب کا
کہاں وہ دستِ رباب، گیت انا الحق گایا
کہاں فقیہہ، مشائخ، قاضی — ملّا، مومن نیک نمازی
کہاں وہ دوست خراب سبھی زنگ لگایا
خلق الاشیا سمجھ اشارت — فھو عینھا محض بشارت
بیدل شوق شتاب سر صحیح سمجھایا

(۱۶) "صوفی ابراہیم شاہ فقیر"

سنہ ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶-۲۷ء — سنہ ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۵-۷۶ء

حضرت صوفی ابراہیم شاہ فقیر جھوک شریف کے مشہور صوفی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کا نسبی تعلق حضرت شاہ عنایت اللہ شہید (سنہ ۱۱۳۰ھ / ۱۷۱۷-۱۸ء) سے ملتا ہے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۲۷ جمادی الاول سنہ ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء کو تحصیل میرپور بٹھورہ، ضلع ٹھٹھ کے قریب جھوک عرف میراں پور میں ہوئی تھی۔ اپنے بزرگوں کے زیرِ سایہ وہیں علوم ظاہری اور باطنی کی تکمیل کرتے رہے۔ اپنی وفات سے پہلے کچھ عرصے تک آپ درگاہ میراں پور کے سجادہ نشین کی حیثیت سے بھی رشد و ہدایت اور خدمتِ خلق میں مشغول رہے۔ ۸۰ ذی الحجہ سنہ ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۵ء کو انچاس برس کی عمر میں واصل بہ حق ہوئے۔

آپ سندھی اور اُردو دونوں زبانوں میں اشعار موزوں فرماتے تھے، تخلص کبھی صوفی اور کبھی فقیر کرتے تھے۔ آپ کا اُردو کلام بہت کم دستیاب ہے۔ اُردو میں زیادہ تر اشعار کافی کے ڈھنگ پر کہتے تھے۔ آپ کی زبان بہت قدیم اور سندھی آمیز ہوتی ہے لیکن خیالات بہت بلند اور معرفت میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ کچھ اشعار آپ کے بطور نمونہ درج ذیل ہیں:-

دیکھ یار کا دیدار جو جسنار بنا ہے — دستور کنوں نور جو اسرار بنا ہے

جدائی میں جیون مشکل، سجن بن حال حیراں ہے،
جس دن موں سجن بچھڑا، مری دل تب دہی جل جل
وداع کی آگ بجلی جیوں، ابر چشماں جوں باراں ہے
لگا ہے عشق موں دل سوں نہیں سونا، صحی اک پل
غذا ہے طعام خوں خوردن، لباطی سیج خاراں ہے
بڑھے تیرے عشق کے امراض جن کا ہوا نہیں درماں
شفائے درد سودایاں، بدستِ غم گساراں ہے
چڑھیاں تیرے چشم کیاں فوجاں آیاں سر پر فقیراں چل
کیا بند قید زلفاں سوں، اچھے لبیں دل بیکاراں ہے

حُسن کی فوج لوٹے موں کہاں جاداں میں فریادی
ہجر کی تیغ کو ٹے ہوں، دیکھو سجناں کی بیداری
گدا ہوں وہ پیا درکے، خزاں ساماں سکندر کے
بجز دیدار دلبر کے، عمر جاندی ہے افرادی
پیالہ مئے الستی کا، دیا یہ یار مستی کا
ھٹیا کل وہم ہستی کا، کیا از قید آزادی
صفا صوفی جو ہستے ہوں، جگر کا خوں کھاتے ہوں
سجن کے پاس جاتے ہوں نہ کر مجھ سوں تو بیدادی

---

(۱۷) "حضرت فتح دین شاہ جہانیاں پوٹہ"

سنہ ۱۲۰۵ - سنہ ۱۲۹۱ھ

آٹھویں صدی ہجری کے مشہور ولی اللہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی اولاد میں سے ایک بزرگ اُچ سے حیدرآباد (سندھ) آکر بسے۔ وہ محلہ جہاں یہ خاندان آباد ہے "ٹنڈو جہانیاں" کہلاتا ہے، اور اس خاندان کے افراد "جہانیاں پوٹہ" (یعنی مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی اولاد) کے نام سے مشہور ہیں۔

حضرت فتح دین شاہ جہانیاں پوٹہ کے والدماجد حضرت دیدھل شاہ جہانیاں پوٹہ بھی روشن ضمیر بزرگ تھے۔ اپنے ہونہار فرزند کی تعلیم و تربیت پر خاص دھیان دیا اور عربی فارسی کی اچھی تعلیم دلائی۔ سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد حضرت فتح دین شاہ روحانی تعلیم و تربیت کے لیے جھوک عرف میراں پور کے خدارسیدہ بزرگ حضرت فضل اللہ شاہ قلندر (المتوفی ۲۷ جمادی الآخر سنہ ۱۲۴۳ھ ۲۸-۱۲-۱۸۲۷ء) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوکر عبادت و ریاضت اور خدمتِ خلق میں مشغول ہوگئے۔ آپ کا وصال اپنے آبائی گاؤں میں ۲۶ محرم الحرام سنہ ۱۲۹۱ھ کو ہوا

حضرت فتح دین شاہ فارسی، اردو اور سندھی کے قادرالکلام شاعر تھے

تخلص فتح اور کبھی پُورا نام فتح دین کرتے تھے. فارسی میں ان کا ایک مختصر سا دیوان موجود ہے. ان کا فارسی کلام عارفانہ اور صوفیانہ رمز و اشارات سے پُر ہوتا ہے. مثلاً :-

درمیان تاب وحدت فتح دیں را یافتم
از نفی اثبات دیدم شعلۂ اسرار را

چشنیدم مغز معنی جزو و کل را — بہ فتح الدین عیاں اسرار باشد
خندہ روشن دو عالم فتح دیں را — بہ تیغ ہمت مشکل کشائی

اُردو میں ان کا کلام بہت کم دستیاب ہے، اور جو ہے وہ "کافی" کے رنگ پر، لیکن زبان صاف اور رواں پائی جاتی ہے :- مثلاً

ہوئیا مخمور معنی میں، کہ ہادی حق بتایا ہے
ملامت کوں سلامت کر، ایس آپے چھپایا ہے
نہیں درکار عیسیٰ کی، مسیحا دم ہمارا ہے
الٹ پٹی 'الف' کی جیانی کہ جس میں کل سمایا ہے
محمد شرف زندانی، 'الست' اسرار آیا ہے
دونوں جگ میں برق بن کر، ابر رحمت بسایا ہے
ہوائے بے خودی آئے، خودی کی دھول اُڑ جائے
صدف کر سینہ کو اپنا عجب گوہر چھپایا ہے
جلالی جوش کے جذبے جسم کوں خود جلایا ہے
فتح ہے دین، کی ہردم کفر کو مٹایا ہے

(۱۸) حضرت قطب شاہ جہانیاں لوہٹہ"

۱۲۲۹ھ - ۱۳۲۸ھ
۱۸۱۳-۱۴ء - ۱۹۱۰-۱۱ء

حضرت قطب الدین شاہ جہانیاں لوہٹہ، مشہور صوفی بزرگ اور پیرِ طریقت حضرت فتح دین شاہ جہانیاں لوہٹہ کے فرزند تھے. اپنے آبائی گاؤں "ٹنڈو جہانیاں" میں ۱۶ ررمضان المبارک ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۳-۱۴ء) کو پیدا ہوئے. اپنے والد ماجد سے علوم ظاہری و باطنی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان ہی کے دستِ حق پرست پر بیعت حاصل کیا اور خلافت و اجازت حاصل کرکے عبادت و ریاضت میں مشغول ہوگئے اپنے والد کے وصال کے بعد اُن کی جگہ سجادہ نشین ہوئے، اور اپنی آخری زندگی تک رشد و ہدایت اور خدمتِ خلق میں مشغول رہے. حضرت مخدوم جلال الدین جہانیاں جہاں گشت سے نسبی تعلق رکھنے کے باعث آپ کا خاندان سندھ میں بہت معزز اور محترم سمجھا جاتا تھا. ۱۶ ر ذی الحجہ ۱۳۲۸ھ مطابق ۲۳ ر دسمبر ۱۹۱۰ء کو ۹۹ سال کی عمر پاکر آپ کا وصال ہوا. "ٹنڈو جہانیاں" (حیدر آباد) میں سپرد خاک کیے گئے. آپ کا مقبرہ مقدس آج بھی زیارت گاہ خاص و عام ہے.

حضرت قطب الدین شاہ سندھی کے بہت اچھے شاعر تھے اور قطب تخلص فرماتے تھے. اُردو میں بھی ان کے کچھ اشعار "کافی" کے رنگ میں ملتے ہیں،

زبان قدیم ہونے کے ساتھ ساتھ ہندی اور سندھی آمیز ہے لیکن تخیل کے لحاظ سے ان کا کلام بہت بلند اور معرفت کی چاشنی لیئے ہوئے ہے۔ بہ طور نمونہ کچھ اشعار درج ذیل ہیں

ست گور ایسا پریم لگایا ہے

پریم لگتے اکھیاں کھلیاں ہر جا درشن پایا ہے

ست گور ایسی طاقی (دریچہ) کھولی، بسر گئی ہے (بھلا گئی) بی سبھ (دوسری سب) بولی

ہر جا ھو ھو پایا ہے

ست گور ایسی کنجی پھیری، بسر گئی ہے تیری میری

ھکو (ایک ہی) نام سمایا ہے

ست گور ایسی کنجی لائی نام، بتا گئی بسر سبھائی

ہر جائے حق سمایا ہے

قطب کیتا دلا، جگ سارا، باقی رہ گیا "نام" نیارا

اہا ستگور رمز رلائی ہے

ایک نام سے کام رے بھائی، اور کام سمجھ جھوٹا رے

پیتی بھنبیر امول دانہ "نام" بنا سبھ پھوٹا رے

من له المولیٰ فله الکل سخن سبھے کا جھوٹا رے

قطب اپنا آپ پہچانا، گھر ہوئے کا لوٹا رے

"شبد": ست گور ایسی بھگتی لائی ہے جس نے لوں لوں نام دھائی ہے

نابھ کنول کوں نام اٹھایا کنٹھ کنول میں پانی لایا

ہندو زور اور زوری کھوں لوٹی ہے دل موری

(۱۹) "حضرت حمل خاں لغاری"

۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰-۱۱ء - ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۸-۷۹ء

حضرت حمل خاں لغاری کا تعلق بلوچوں کے "سیرکانی" قبیلے سے تھا آپ کے والد کا نام رحیم خاں لغاری تھا۔ آپ کی ولادت ریاست خیرپور کے ایک گاؤں میں، جہاں آپ کا خاندان آباد تھا، ۱۲۲۵ھ / ۱۸۰۹ء میں ہوئی تھی۔ سندھی، فارسی، اردو کی تعلیم گھر پر حاصل کی، جوان ہونے پر تعلقہ "سکرنڈ" ضلع نواب شاہ میں "میرخاں لغاری" گاؤں کے متصل مستقل سکونت اختیار کرلی، اور وہیں ایک مدرسہ قائم کرکے درس و تدریس میں مشغول ہوگئے پیر صاحب پگارڑو کے خاندان سے آپ کے خاندان والوں کو ارادت اور عقیدت حاصل تھی لیکن حضرت حمل خاں لغاری نے نقشبندیہ سلسلے میں لواری کی درگاہ کے سجادہ نشین حضرت خواجہ محمد حسن مدنی کے دست حق پرست پر بیعت کی تھی۔ مرید ہونے کے بعد آپ نے اپنی زندگی عبادت و ریاضت اور درس و تدریس میں لگادی۔ اور اسی کے ذریعہ علم حق کی اشاعت میں مشغول رہے۔ ریاست خیرپور کے حکمراں میر علی مراد خاں تالپور ان کے بڑے قدرشناس تھے۔ اور انھوں نے باقاعدہ ان کے اور ان کے مدرسہ کے لیئے وظیفہ مقرر کردیا تھا۔

حضرت حمل خاں لغاری ایک ذہین، سنجیدہ اور ذی علم بزرگ تھے، وہ سندھی اور سرائیکی زبانوں کے بڑے مقبول اور بلند پایہ شاعر تھے۔ ملح معجزہ، منقبت، مثنوی، سہ حرفی، غزل، بیت، کافی اور معما وغیرہ اصنافِ سخن پر مشتمل ان کی کلیات جناب ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ نے مرتب کرکے سندھی ادبی بورڈ سے شائع کرا دیا ہے، اس میں ان کا کچھ اردو کلام بھی شامل ہے۔ جس سے اُن کی اُردو شاعری میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے، قیاس غالب ہے کہ انھوں نے اُردو میں بہت زیادہ اشعار کہے ہوں گے جو ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آسکے ہیں۔ آپ کا وصال ۱۲۹۶ھ ۱۸۷۹ء میں ہوا بہ طور نمونہ کچھ اُردو اشعار درج ذیل ہیں:۔

جس کو ہے داغ جگر اس کو نہیں آرام دل
عشق میں یکتا نہیں وہ بے خبر ہے خام دل
جس کے دل کا یار کی زلفوں میں ہردم تھا گذر
اس کا مشکل چھوٹنا ہے جا پڑا در دامِ دل
جو سجن دل لوٹ لے گیا وہ کبھی آتا نہیں
رات دن وہ ڈھونڈھتا ہے گلبدن گلفام دل
ایک پل مجھ سے جدا ہووے نہیں او ماہرو
دیکھ دل کے درد کا ڈل یہ میرا ہے کام دل
ہر گھڑی ہر وقت مجھ کو یاد ہے وہ دلربا
دم بہ دم کر کے لیا ہے درد اس کا نام دل

دین دنیا، عیش و عشرت اس کے دل سوں اترا ہے
جس سنجی ساقی کے ہاتھوں پر پیا ہے جام دل
ہور حمل کی نہیں کچھ آرزو اس یار بین
اس کا ملنا مانگتے ہیں ہر صبح ہر شام دل

دل رام نہ آوے تو دل آرام نہ آوے
دل رام نہ آوے تو صبح و شام نہ آوے
جس وقت مجھے یار ملے، وقت اس رقیب
بدنام وہ فرخام سیہ خام نہ آوے
گر مطرب و مرغ و مئے ہو دیں حمل حاضر
بے دوست دل آرام کسے کام نہ آوے

(۲۰) "حضرت مہدی شاہ بخاری"

سنہ ۱۲۳۰ھ تا ۱۲۹۷ھ

حضرت سید مہدی شاہ بخاری کے مورث اعلیٰ بخارا سے میرپور خاص ضلع تھرپارکر کے قصبہ "میرواہ گورجانی" میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ آپ کی پیدائش یہیں اپنے آبائی گاؤں میں سنہ ۱۲۳۰ھ کے لگ بھگ ہوئی تھی۔ آپ کے والد جڑمل شاہ اور دادا علی محمد شاہ بخاری اس قصبہ کے متوسط الحال ذی عزت لوگوں میں شمار کیئے جاتے تھے۔ آپ کی تعلیم فارسی، عربی اور سندھی میں اس وقت کے شرفا کے مطابق گھر ہی پر ہوئی تھی۔ آپ کا خاندان پیر صاحب پگاڑو کا معتقد تھا اس لیے آپ بھی سنِ شعور پر آنے کے بعد حضرت حزب اللہ شاہ پیر پگاڑو کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو کر عبادت و ریاضت اور خدمتِ خلق میں مشغول ہو گئے۔ آپ سندھی اور اُردو کے اچھے شاعر تھے، اور علمِ موسیقی سے بھی شغف رکھتے تھے۔ سندھی میں آپ کی کافیاں بہت مشہور ہیں۔ اکثر اپنے سندھی زبان کی "کافیوں" میں اُردو کے مصرعے لگا دیتے تھے۔ کافی کے طرز پر انھوں نے اُردو میں کچھ اشعار بھی کہے ہیں، لیکن ان میں سندھی، پنجابی اور سرائیکی الفاظ جیسے ہِک (ایک) تھئی (ہوئی) گھٹانا (کم کرنا) گل (بات) وغیرہ کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔ اردو میں بھی تخلص مہدی لکھتے تھے۔ آپ کا وصال بہ ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۲۹۷ھ

میں اپنے گاؤں "میرواہ گورجانی" ہی میں ہوا، وہیں "ولی ملوک شاہ" کے قبرستان میں سپردِ خاک کیئے گئے۔ نمونہ کے طور پر آپ کے کچھ اُردو اشعار درج ذیل ہیں:-

"کافی"

وہ جلوہ کا جھلکار، رنگی رخسار، اس جنّات عدنی کا
من تحتہا الانہار، دیکھو اسرار سہیل یمنی کا
کج نرگس چشم خمار، کج کار غلامان کاری
کوہ طور موسیٰ تکراری
غمزہ ہے غم خوار، تجلی وار، گوہر گل مدنی کا
کج زلف لیلۃ القدر، کج کار غلامان کثرت
کج ابرو سنبل شجرت
کج ظاہر ہے زنہار، زلف کی تار، رفتار ب ارنی کا
لب احمر سرخ اناری، کیا لعل موتی مواری
کیا نخل بید چناری
کیا چہرے کا چمکار، جھومک کی تار، ہیرا کیا کدنی کا
جا مہدی اس جام پیئے، سرتیش دولہ کے دھریئے
خونِ ناں ڈریئے، آہ نہ کریئے
سردار ادپر سنوار، قتل کی کار، حسینی حسنی کا

"کافی"

ایسے بادل سنجی سواپر، جواں موہن متوالے رے

ھِک ھِک احسن، ھِک ھِک افضل، ھِک ھِک بے مثالے رے
ھِک ھِک ابر مجرد دریا، ھِک ھِک نور نرالے رے
آل غوث دھروا ہویا، بہاؤ الدین بجالے رے
صدر الدین رکن کا پوتا، صاحب جوش جلالے رے

ایک گل موری ماں، تو اے میری جان، پیاری داہ
مشک و عنبر مرگھ کے ماہیں، جھاڑ جھپٹ سونگھے پھول بن جائیں

ہور رھیا حیران
مہدی روپ نہ رنجن درشن، کسی گوپی لاکھوں کرشن
دل بھر تھئی مستان

تجھ بن دنیا کی دولت لٹا کون سکے گا
ہفت کشور کی مایا، سرکار سلیمانی
سکندری خزانے کوں، کھٹا کون سکے گا

چاہ زنج کا قیدی درغب غب رھیا
یوسف جیسے بندہ کون، چھٹا کون سکے گا
اژدھا زلف کی عاصا، موسیٰ کی کرامات
اس کاکل کی ناگن کوں، اٹھا کون سکے گا
عیسیٰ، موسیٰ، نبی میرا محمد علیہ السلام
اسی مہدی شجاع شاہی کوں ھٹا کون سکے گا

---

(۲۱) "حضرت فقیر محمد محسن بیکس"

سنہ ۱۲۷۵ھ - سنہ ۱۲۹۸ھ
۱۸۵۸ء - ۱۸۸۱ء

حضرت محمد محسن بیکس مشہور صوفی شاعر حضرت قادر بخش بیدل کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ کی ولادت اپنے آبائی گاؤں روہڑی میں ۲۶ر جمادی الثانی سنہ ۱۲۷۵ھ (۱۸۵۸ء) کو ہوئی تھی۔ حضرت قادر بخش بیدل نے اپنے فرزند کی ولادت پر یہ تاریخ ولادت لکھی تھی:-

بست و ششم جمادثانی زاد   محسن و مولدش مبارک باد
پنج و ہفتاد و یک ہزار دو صد   بُد ز ہجری رسول شاہ رشاد
حق تعالیٰ بہ حق حسنینش   از حوادث زماں دمصئوں دارد

آپ نے ابتدائی تعلیم عربی فارسی کی گھر ہی پر اخوند عبداللہ سے حاصل کی آپ کے والد کا انتقال ۱۲۸۹ھ میں اس وقت ہوا جب آپ صرف چودہ برس کے تھے طبیعت ابتدا ہی سے درویشی اور فقر کی طرف مائل تھی۔ اپنے صوفی اور درویش والد کی صحبت میں اس پر اور جلا ہوتی رہی۔ اپنے والد کے انتقال کے ایک سال بعد یعنی سنہ ۱۲۹۰ھ میں سیوہن شریف حضرت قلندر شہباز کی درگاہ پر حاضری دی اور وہاں سے فیضان حاصل کرنے کے بعد کوس انا الحق بجاتے واپس ہوئے:-

من نعرۂ انا الحق دم دم زنم بہ سوزی
من کوس ذات مطلق دم دم زنم بہ سوزی

شعر و شاعری کا ذوق والد سے ورثے میں پایا تھا عشقِ آلٰہی کی آگ نے اس صلاحیت میں چار چاند لگا دیئے۔ فارسی، اُردو اور سندھی میں شعر کہنے لگے۔ اور بہت جلد اس وقت کے مقبول شعرا میں شمار ہوئے اشعار میں درد، سوز اور معرفتِ آلٰہی کا غلبہ پایا جاتا ہے۔ حضرت قلندر شہباز سے حد درجہ عقیدت اور ارادت تھی۔ ایک جگہ اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:-

شہنشہِ قلندر! توں ہی ھادی میرا
سوا تیرے صاحب نہیں اور میرا
ملایا مجھ کوں، جو ہے خود جنابی
بہ ہر دل ہے جاری شہا حکم تیرا

عمر نے وفا نہ کی اور عین عالمِ جوانی تیئیس ۲۳ برس کے سن میں ۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۱ء میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ اپنے والد کی قبر کے نزدیک ہی روڈھری میں دفن ہوئے اور مرجع خلائق ہوئے، کسی نے آپ کا سنہ وفات اس طرح لکھا ہے:-

آں یارِ نوجواں کہ خوش بود صحبتش
رفت از جہاں، بماند از و داغِ حسرتش
سالِ رحیل آں زخرد جست گفت آں
با وصف پاک محمد محسن شہید شوقش

۱۲۹۸ھ

سندھی میں کافی بہت اچھی کہتے تھے اور مستی میں خود گاتے بھی تھے۔ علم موسیقی میں خاصی واقفیت تھی؛ اُردو میں بھی کافی ہی کے طرز پر اشعار کہتے تھے۔ سندھی اور اُردو دونوں میں بیکس تخلص کرتے تھے۔ کچھ اُردو اشعار بہ طور نمونہ درج ذیل ہیں:-

تری تصویر مجھ کو یاد تا محشر سجن ہوگا
کہاں محشر رہیا اے دل ہدا ہی دن بدن ہوگا
کہاں لیلیٰ کہاتا ہو، کہاں مجنوں بتاتا ہو
کہاں دھڑ ھیڑ، کا نالا، کہاں شیدا، رنجھن ہوگا
کہاں شیریں کہاں فرھاد، کب مشتاق کب معشوق
کبھی تم زیر، کب بالا، کبھی عرش و زمین ہوگا
کہاں بیدل مرا مرشد، قلندر شاہ عالم کا
کہاں طالب، کہاں مطلوب، کہاں خار و سمن ہوگا

جنازہ لے چلو یارو سجن کے کوچے میں میرا
جیتے مرتے گلی اس میں، مرا ہے رین دن پھیرا
دیکھیں گے جب فراقی دل، اسی دروازہ دلبر کو
کریں گے سجدہ اور بولیں گے، ہوں زخمی میا تیرا
اگر چاہے سجن میرا کہ اُٹھ بیٹھے یہ مُردہ عاشق
ہزاراں شکر کر اٹھوں، دیکھوں کعبہ، دیو دل پھیرا

ملاّ تم نا جنازہ پڑھ، جنازہ بھی پڑھے دلبر
جسی کا میرے دل اندر ہوا ہے رین دن دیرا
پُچھو اس سے بجکیس بے وس کیسی تقصیر کیتی ہے
بوجھو بے کس کون سی تقصیر کی ہے
جواس کوں تم چھوڑا ہے دل اس کی میں ترا دیرا
ٹھکانا

"(۲۲) حضرت مخدوم امین محمد امین"

۱۲۵۴ھ - ۱۳۰۳ھ
۱۸۳۸ء ۱۸۸۶ء

حضرت مخدوم امین محمد امین سندھ کے مشہور ولی اور صوفی باصفا حضرت مخدوم نوح صدیقی سہروردی قدس اللہ سرہٗ کے خاندان سے تھے۔ اور اپنے والد ماجد حضرت مخدوم محمد زماں قدس اللہ سرہٗ کے وصال کے بعد ان کی جگہ درگاہ ھالا کے سجادہ نشین بھی ہوئے۔ آپ کی ولادت ۷ شعبان المعظم ۱۲۵۴ھ ۱۸۳۸ء کو ھالا شریف میں ہوئی۔ عربی۔ فارسی کی تعلیم گھر پر اخوند محمد قاسم سے حاصل کی اور علومِ باطنی کی تعلیم و تربیت اپنے والد ماجد سے پائی اور سہروردیہ سلسلے میں اُن ہی سے مرید بھی ہوئے۔ آپ کا وصال ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۰۳ھ مطابق ۲۹ جون ۱۸۸۶ء کو ہوا۔ اپنے والد کے وصال کے بعد آپ پندرہ سال کی عمر سے ہی درگاہ شریف ھالا کے سجادہ نشین کی حیثیت سے رشد و ہدایت اور خدمت خلق میں مشغول رہے۔

حضرت مخدوم امین سندھی اور اُردو کے قادر الکلام شاعر تھے۔ امین تخلص کرتے تھے۔ سندھی میں آپ کی کافیاں بہت مشہور ہیں۔ اُردو میں کچھ اشعار آپ نے حضرت بابا فرید گنج شکر اور حضرت امیر خسروؒ کے طرز پر فارسی آمیز بھی لکھے ہیں۔ آپ کے کلام میں "مجاز و حقیقت" اور "وحدت و کثرت" کے صوفیانہ نکات بھرے

عارفانہ انداز میں پیش کیے گئے ہیں کچھ اُردو اشعار بہ طور نمونہ درج ذیل ہیں :-

آہ و فریاد و فغاں پر میرے یہ ہنستے ہیں لوگ
کوئی کہتا ہے کہ جی اور جان سے بھی مر رہا
عشق میرا ہے، تمہاری عقل ہے افراسیاب
دل کے میداں مظفر رستم رن بیر رہا
اے آمیں اس بات پر انصاف ہے اس ان میں
سیکڑوں سرگم ہوئے گمراہ کا رہبر رہا

تجھ دام سے مجھ دل کو چھڑا کون سکے گا
تقدیر کے لکھے کو مٹا کون سکے گا
وہ لائے مرے حق میں چھری سینے پہ میرے
اس ہاتھ حنائی کو ہٹا کون سکے گا
مژگان کے تیروں سے تو زخمی ہیں ہزاروں
گھائل کو ترے دیکھ بچا کون سکے گا
افسوں گری کرتے ہیں خود وہ مرے دل پہ
پیچوں سے مجھے اُس کے چھڑا کون سکے گا
گر آپ چلن ہار ہو، اے میرے پیارے
اُس داغ جدائی کو مٹا کون سکے گا
ہردم ہے آمیں میری شفاعت پہ محمدؐ — گردش میں زمانے کے مٹا کون سکے گا

یار مست و خراب آیا ہے — ساغر سرخ ناب آیا ہے
جو مزہ دائمی تھا پایا ہے — دست در دست بادہ نوشاں نوش
من کی میں نے مراد پائی ہے — عالم افلاک سے صدا آئی
حال بدمست زلف لہرائی — بانگ بوسے کی گرم گوشا گوش
آملا جسم و جان کا جانی — جان میری تھی جس کی مہمانی
دیکھ دلبر مرا ہے لاثانی — گئے رقیبوں کے حال ہوشاں ہوش
لوگو محفل میں کیا کروں اظہار — میں نے دیکھا وہ دلربا دلدار
اب تو اک بات سے بھی ہوں لاچار — یار کہتا ہے، ہو خموش خموش

یار کیوں ہوتے خفا پھر ہو دوبارہ ہم سے — آج کیوں الٹ گیا میرا ستارا ہم سے
شعلۂ دل سے ترے سماں بھی جلتا ہے — آگ تو بجھتی نہیں میرے چشم کے نم سے
خنجر دست خفائی کے ہزاروں کشتہ — بستہ ہیں تیرے بجن زلف کے ہر ہر خم سے

(۲۳) حضرت غلام اللہ خاں لغاری مسکین

سنہ ۱۲۵۴ھ - سنہ ۱۳۰۳ھ

حضرت غلام اللہ خاں لغاری، نواب جان محمد خاں اول کے فرزند ارجمند تھے۔ سنہ ۱۲۵۴ھ میں پیدا ہوئے تو دولت و حشمت ہاتھ باندھے کھڑی تھی لیکن آپ نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، اور آگے بڑھ کر فقر کو گلے سے لگا لیا۔ اس دور کے بہترین علما اور فضلا سے گھر پر عربی، فارسی تعلیم حاصل کی، اور پھر عبادت و ریاضت کی طرف راغب ہو گئے۔ بچپن ہی سے طبیعت فقر اور درویشی کی طرف مائل تھی۔ اور اکثر تصوف اور معرفت کے رازہائے سربستہ کو سلجھاتے رہتے۔ سلسلۂ قادریہ میں مرید ہونے کے بعد رشد و ہدایت اور خدمت خلق میں مشغول ہو گئے۔ آپ کی بزرگی اور تقدس کی وجہ سے مریدین کا ایک بہت بڑا حلقہ جس میں کثیر تعداد ہندوؤں کی بھی تھی آپ کے گرد جمع ہو گئی۔ اور آپ برابر ان کی روحانی تعلیم و تربیت اور تزکیۂ نفس میں اپنے کو مشغول رکھتے۔ آپ اپنے کو "فقرائے غلام الہیان سبز پوش" میں شمار کرتے تھے، اور اکثر اپنا نام "غلام اللہ فقیر صانی العلوی سبز پوش صوفی القادری" لکھتے تھے۔ اپنا قیام برابر اپنی آبائی جاگیر سفیاری "تعلقہ شہداد پور" میں ہی رکھا، اور وہیں سنہ ۱۳۰۳ھ ۱۸۸۶ء میں وفات پائی اور مدفون ہوئے۔ آپ کے وصال کے بعد آپ کے معتقدین

نے آپ کے مزار مقدس پر ایک شان دار مقبرہ تعمیر کر کے اپنی عقیدت اور محبت کا ثبوت پیش کیا ہے، جو آج بھی مرجع خلائق ہے۔

آپ کا خاندان شعر و ادب کی سرپرستی کے لیے ابتدا ہی سے مشہور رہا۔ آپ کے والد نواب جان محمد خاں اول خود بھی اچھے شاعر تھے، اس لیے شاعری آپ کو ورثے میں ملی تھی، تصوف نے اسے اور بھی جلا بخشی۔ آپ نے اپنے مریدوں کی تعلیم و ہدایت کے لیے شاعری ہی کو ذریعہ بنایا۔ فارسی، اردو، سندھی، سرائیکی اور کبھی کبھی عربی میں بھی شاعری کرتے اور حقائق کے موتی بکھیرتے تھے۔ مسکین تخلص کرتے تھے۔ سندھی، سرائیکی اور اردو میں آپ کا اچھا خاصا کلام مخطوطہ کی شکل میں موجود ہے۔ شاعری سے آپ کا دراصل مقصد غیر مسلم عوام اور اپنے مریدین کو ہدائت اور حقائق الٰہی سے آشنا کرنا تھا۔ اس لیے آپ نے اپنی اردو شاعری کے لیے وہی زبان اور صنف اختیار کی جس سے ہنود مانوس تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے اردو کلام میں ہندی الفاظ کا غلبہ ہے، اور صنف کے لحاظ سے بھی آپ نے "اشلوک"، "شبد" اور "دوہا" ہی کو پسند کیا۔ ان شبدوں اور اشلوکوں میں انسانی اخلاق کی بلندی اور تزکیۂ نفس کی تبلیغ کی گئی ہے۔ ساتھ ہی تصوف و معرفت کے اہم مسائل جیسے توحید الٰہی اور وجود باری کو بھی بڑے دل کش پیرائے میں ذہن نشین کرایا گیا ہے۔ کچھ اشعار بہ طور نمونہ درج ذیل ہیں:-

مسکیں ممتا روگ ہے، سب سے بڑا روگن کی چھاپ
جو بن ممتا چھالیا، اس جنم گوایا آپ

مسکیں ممتا ادگنی، جیسی ہوئی گن ناہنہ
جوجن سنت سروپ ہے، کیوں بھٹکے کاہنہ

مسکیں مایا موہنی، سندر روپی نار
لاکھ چھلاوے ہر جناں بھٹکاوے سنسار

مسکیں مارگ چال لے، بن مارگ مت چال
جو نر مارگ نا چلے، کرس ہوت کنگال

نیناں بادل برستا، کرتا نت بہار
رین دناں رُت میگھ ہے، آتم دیکھو یار

نت نت لاگے پریم کا جان ہماری کان
اس شہادت عشق کی ناکو نام نشان

صوفی نام کہاون ایسا جیسا نام ھری کا
ناکو نام ٹھام اہن حسن کا، ناکو ھندھ پری کا

لا آکہہ نفی سول نرگیا، اس اُس جنم مٹایا
الا اللہ کیا استھانا، آواگون گنوایا

لاگی چھاپ ہری ستگر کی، مٹیا سکل گمان
انحد کی گھنگھور سیں پایا پریم گیان

من بھر مرپا ہو منا، محرم من کا میت
کہدھیا میں ڈوبتی، ساجاؤں کی پریت

ھر کا بھید پہچانیئے، اور نہ کیجیے آس
اِک دن کا یاہو لیسے تب لگ آس نراس

(۲۴) حضرت غلام حیدر فقیر گرناریؒ

۱۲۲۵ھ - ۱۳۱۰ھ

حضرت غلام حیدر فقیر گرناریؒ بچپن ہی سے فقر و درویشی کی طرف مائل تھے۔ ۱۲۲۵ھ میں پیدا ہوئے۔ عربی۔ فارسی کی تعلیم مدرسہ میں حاصل کرنے کے بعد حقیقت الٰہی کی جستجو میں صحرا نوردی اختیار کی۔ بھٹکتے بھٹکاتے جوناگڑھ کے مشہور پہاڑ "گرنار" کے ایک گپھے میں گوشہ نشین ہو گئے۔ اور ایک عرصے تک وہاں رہ کر تزکیہ نفس اور یاد الٰہی میں مشغول رہے۔ وہاں بھی عبادت و ریاضت سے اُن کی تشفی نہ ہوئی تو مرشد کامل کی تلاش میں نکلے اور بالآخر قدرت نے ان کو حضرت قنبر علی شاہ بھاڈائی کی خدمت میں پہنچا دیا۔ وہاں ان کی صحبت اور روحانی تربیت میں ان کو بڑی تسکین ملی۔ اور وہ ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو کر کسبِ فیض کرتے رہے۔ حضرت سید قنبر علی شاہ نے ان کی تربیت پر خاص توجہ فرمائی۔ اور خرقۂ خلافت و اجازت سے نوازا۔ ۱۲۶۲ھ میں حضرت قنبر علی شاہ کا وصال ہوا تو حضرت غلام حیدر گرناریؒ نے اپنے پیر روشن ضمیر کے مزار اقدس کی جاروب کشی کو اپنی زندگی کا معمول بنا لیا۔ اور "گنبا لی" میں آخر وقت تک مقیم رہ کر اس سعادت سے بہرہ مند ہوتے رہے۔

حضرت غلام حیدر گرناری ایک ولیِ کامل، اور صوفیِ باصفا بزرگ تھے، سندھی، سرائیکی اور اردو کے اچھے شاعر تھے۔ "نیرھا" (یعنی شہباز) تخلص فرماتے تھے، اور اپنے پیر و مرشد حضرت سید قنبر علی شاہ کی متابعت میں زیادہ تر "بیت" اور "دائیاں" لکھتے تھے۔ حضرت سید قنبر علی شاہ نے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی تقلید میں اپنے مجموعۂ کلام کا نام "رسالو" رکھا تھا۔ حضرت غلام حیدر نیرھا گرناری نے اپنے پیر کی متابعت میں اپنے مجموعۂ کلام کا نام بھی "رسالہ" ہی رکھا۔ ان کا کلام بہت کم دستیاب ہے۔ اردو میں آپ کا کلام بھی اس دور کے سندھی صوفیا کی طرح سندھی اور ہندی الفاظ پر مشتمل ملتا ہے۔ آپ کا وصال سنہ ۱۳۱۱ھ میں ہوا۔ آپ کے کچھ اشعار نمونتاً درج ذیل ہیں:۔

دیکھے جب چشم پیارے کے تو ہم مستان ہو جاتے
سر و پا کوں برہنہ کر اگر عریان ہو جاتے

نہ دے آزار مجھ دل کو تو اے آرام جاں سمجھو
یہ خوبی کچھ نہیں رہتی سدا اے مہرباں سمجھو

مرا محبوب اب آیا ہمارے کول، آ دیکھو
کلی دل کی صفا کر کے گھگھٹ کیوں کھول آ دیکھو

دمیں کسی کے سنگ ہوں نہ کوئی میرا سنگھی
میں جس کے سنگ ہوں وہ ہمارا سنگی

موکوں مورے گرد کا ہے بھروسا
ایسا گرد میں پورن پایا

ہوں میں جنم جنم کا جس کا داسا
جس نے میٹھی تن کی تاسا مٹایا

دھن تو نام سبحان کوں، دھن تو محمد میر
دھن تو شہ مرداں کوں دھن تو شبر شبیر

پیر میرا پاک ہے سرتاجوں کا تاج
سر ما ہر کوئی کاج جو مرے اندر آئیا
سب کام انجام ہو گئے

---

(۲۵) "حضرت پیر شاہ نصیر الدین نقشبندیؒ" (المتوفی سنہ ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۹ء)

حضرت پیر شاہ نصیر الدین نقشبندی کے والد ماجد حضرت پیر عبدالحئیؒ نقشبندی نوشہرہ فیروز ضلع نواب شاہ کے ایک روشن ضمیر بزرگ تھے۔ آپ کی ولادت یہیں ہوئی لیکن سنہ ولادت کا پتا نہ چل سکا۔ علوم ظاہری و باطنی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور نقشبندیہ سلسلے میں مرید ہو کر رشد و ہدایت اور خدمت خلق میں مشغول رہے۔ جھوک عرف میراں پور کے صوفی خانوادے سے آپ کے گھرانے بہت زیادہ عقیدت رکھتے تھے۔ اس لیے قیاس ہے کہ آپ نے وہیں سے کسب فیض کیا ہوگا۔ آپ کی بزرگی اور تقدس کے اس دور میں بہت زیادہ لوگ معتقد تھے۔ اور آپ کے مریدوں کے حلقے میں بڑی بڑی شخصیتیں شامل تھیں۔ آپ کا وصال سنہ ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۹ء کے لگ بھگ ہوا۔ فارسی اور سندھی کے علاوہ اُردو میں بھی آپ کا کلام ملتا ہے۔ سندھی میں "کافیاں" اور اُردو میں "غزل" کہتے تھے۔ اُردو اشعار میں آپ کی زبان صاف اور شستہ ہے، تبرکاً ایک غزل درج ذیل ہے:۔

قامت سے ترے سرو خراماں ہے حیراں — لعلوں سے ترے لعل بدخشاں ہے حیراں
مرجان بھی مرجان سے بے جان رہی ہے — پنجے کی حنا دیکھ کے غلطاں ہے حیراں
روتا ہوں ترے ہجر سے شب روز اے دلبر — آنکھوں سے مرے قلزم عمان ہے حیراں

نالہ جو کرو دل ہجر میں شب روز نصیرا
نالوں سے مرے رعد پریشاں ہے حیراں

(۲۶) "پیر حزب اللہ شاہ تخت والا" (سنہ ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء - سنہ ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۰ء)

حضرت پیر حزب اللہ شاہ تخت والا بڑے خدا رسیدہ اور صوفی باصفا بزرگ تھے۔ "سندھ کے جدید اردو شعراء" کے مصنف نے ان کا مختصر سا تذکرہ کیا ہے۔ آپ کی سنہ پیدائش سنہ ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء اور وفات سنہ ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۰ء ہے۔ فارسی اور عربی زبان کے بہت بڑے عالم تھے۔ فارسی اور اُردو میں اشعار بھی موزوں فرماتے تھے۔ مسکین تخلص کرتے تھے۔ مصنف "سندھ کے جدید اردو شعراء" نے فارسی میں ان کے دیوان کی نشاندہی کی ہے، اور اُردو کے بھی چند اشعار دیئے ہیں۔ ان کے حوالے سے چند اشعار درج ذیل ہیں:۔

آتا ہے چمن میں بت گلفام ہمارا
ساقی یہ خدا بھر دے مجھے جام ہمارا
گر میں نے کیا اُس بت طناز کو سجدہ
آئے گا کسی کام یہ اسلام ہمارا

حضرت امیر خسرو کے رنگ میں آپ نے کچھ ایسے اشعار بھی کہے ہیں جنہیں فارسی تراکیب اور اُردو الفاظ کی آمیزش سے "گنگا جمنی" بنایا گیا ہے، اور یہ اختلاط بڑا پیارا معلوم ہوتا ہے، مثلاً:۔

من بہ ہیبت رقیب در وصلت — برقیباں چنیں کرم مت کر
گرچہ ما خاطیم ہمہ گنہیم — مجھ گنہگار نیم، ہم مت کر
بندہ درگاہ تو ام اے سلطاں — اب تو مسکین را جدا مت کر

(۲۷) حضرت سید غلام محمد شاہ گدا

سنہ ۱۲۵۳ھ - سنہ ۱۳۲۳ھ

حضرت سید غلام محمد شاہ گدا کا نسبی تعلق مشہدی سادات سے تھا
ان کا سلسلۂ نسب میر مرتضائی نے مثنوی یوسف زلیخا میں اس طرح لکھا ہے:-
سید غلام محمد شاہ گدا ابن سید حسن علی شاہ بن سید بچل شاہ بن سید کرم
علی شاہ، آخر میں ان کا نسب حضرت امام علی بن موسیٰ رضا پر منتہی ہوتا ہے،
آپ کا خاندان وہاں سے پہلے قندھار آکر بسا پھر کلہوڑا حکمرانوں کے
دور میں سندھ کے پایۂ تخت خدا آباد ضلع دادو میں آباد ہوا بعد ازاں آپ
کے والد ماجد سید حسن علی شاہ میران تالپور کے عہدِ حکومت میں حیدرآباد چلے
آگئے، جہاں اُن کی بڑی قدر و منزلت کی گئی۔ حضرت غلام محمد شاہ گدا کی ولادت
شہر حیدرآباد میں میرانِ تالپور کے زوال کے بعد ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں ہوئی۔ ان
کی تاریخ ولادت "مظہر حق" سے نکلتی ہے۔ فارسی عربی، اور سندھی کی تعلیم
اخوند احمد بن عبدالعلیم ہالائی سے حاصل کی طبیعت بچپن ہی سے تصوف
اور فقر کی طرف مائل تھی، ہوش سنبھالتے ہی انھوں نے انقلابِ سلطنت
کے اثرات دیکھے۔ سندھ پر غیر ملکی فرنگیوں کا تسلط، اپنی اور اپنے ہم وطنوں
کی غلامی اور تالپور حکمرانوں کی کس مپرسی اور ذلت نے دنیا کی بے ثباتی کا

نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا، اور اس نے ان کا دل دنیا سے اُچاٹ
کر کے فقر و درویشی کی طرف لگا دیا۔ قادریہ سلسلہ میں مرید ہو کر عبادت و
ریاضت اور علمی مشغلوں میں منہمک رہنے لگے۔

فارسی، اُردو اور سندھی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ گدا تخلص فرماتے تھے
شعر گوئی میں محمد روشن حیدرآبادی (متوفی ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء)) سے اصلاح
لی تھی۔ علم و فضل اور بندگی کی بنا پر تالپوری شاہزادے جیسے میر شاہنواز
خاں، میر بہرام خاں ولس بیلہ کے جام میر خاں اور عبدالحسین خاں سانگی
ان کے بڑے قدردان تھے۔ خاص کر علم نواز اور شاعر شاہزادے عبدالحسین
خاں سانگی ان کی اپنے استاد کی طرح قدر و منزلت کرتے تھے، اور ان کی
ہر طرح کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔ اُردو شاعری میں سانگی ان کو
آتش ثانی کہتے تھے جیسا کہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہے:-

فارسی شعر شد بہ فرمائش — آہ اُردو میں آتش ثانی

حضرت گدا بھی میر عبدالحسین سانگی کی فیاضی اور علم دوستی سے
بہت متاثر تھے۔ اور اکثر اپنے اشعار میں ان کا ذکر ایک مربی کی حیثیت
سے کیا ہے:-

امیر ذوالکرم عبدالحسین خان — گل باغ سخا ہے قدرداں ہے

امیرِ زماں میر عبدالحسین — گدا کو سخا سے بھلاتا نہیں

میر عبدالحسین خاں صاحب — فیض بخشی میں رشک دریا ہے

ہندوستان کے مختلف شہروں میں گھومنے کے علاوہ حضرت غلام محمد شاہ گدا نے دربارِ دہلی کا سفر کیا تھا اور عرصے تک وہاں مقیم بھی رہے تھے اور شعر و شاعری کا اعلیٰ مذاق ان کو دہلی ہی میں پیدا ہوا اور وہاں کے مستند استادانِ سخن سے ملنے جلنے کے مواقع نے ان کی زبان اور اندازِ فکر میں بہت بڑی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ وہ ناسخ اور آتش سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اُن کے دواوین کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اُردو اور فارسی میں اعلیٰ لیاقت اور شعر گوئی کو علم و فضل کی نشانی سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ اکثر اپنے سندھی اشعار میں وہ فارسی، اُردو کے مصرعے جوڑ دینے میں نہیں ہچکچاتے تھے۔ مثلاً:۔

دسی منھنجا اچا مونکی جیئو ھک دلبر سندی
اگر سچ پوچھئے تیرا تو ہے سارا چمن بگڑا

تکملہ مقالات الشعرا کے مؤلف جناب ابراہیم خلیل حضرت گدا کے ہم عصر اور ان کے علم و فضل اور تقدس کے معترف تھے۔ ایک جگہ ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:[1]

"درکلام ہندی نہایت صاحب دستگاہ است و در کلام ہندی بغاتت مہارت و نہایت خبرت دارد۔"

سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد نے ۱۹۵۷ء میں رشید احمد لاشاری سے ایڈٹ کرا کر اُن کے مقدمے کے ساتھ "کلیاتِ گدا" کو شائع کر دیا ہے۔ اس میں آپ کے اُردو کلام کے ذیل میں تین منقبتیں، اٹھائیس غزلیں، ایک قطعہ، ایک فرد، اور دو رباعیاں

---

[1] تکملہ مقالات الشعرا مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ۔ ص ۵۲۳

موجود ہیں۔ لیکن بلاشبہ حضرت گدا کے اُردو کلام کا اتنا مختصر سا سرمایہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اتنا پُرگو اور ریختہ کا رشاعر اپنی ساری زندگی میں صرف اتنا سا کلام چھوڑے یہ ممکن نہیں۔ ان کا مزید اُردو کلام یا تو دبا ہوا ہے یا ضائع ہوا۔ اس بات کا ثبوت ہمیں اس سے بھی ملتا ہے کہ تکملہ میں جناب ابراہیم خلیل نے جو غزل آپ کی نمونتہً نقل کی ہے وہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد کے مطبوعہ کلیات میں شامل نہیں ہے۔ یعنی تکملہ میں جس نسخے سے غزل لی گئی ہے وہ مخطوطہ کہیں دبا ہوا ہے۔

آپ کا وصال پچھتر برس کی عمر میں ۱۱ جنوری ۱۹۰۵ء مطابق ۱۳۲۲ھ کو حیدرآباد میں ہوا اور وہیں سپردِ خاک کیے گئے۔ تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ گدا نہایت خوبصورت اور وجیہہ تھے۔ ان کے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی لڑکوں نے عنفوانِ شباب میں وفات پائی اور گدا تنہا رہ گئے۔

آپ کا اُردو کلام بہت پاکیزہ، شگفتہ اور زوردار ہوتا ہے، زبان میں اہلِ زبان کی سی صفائی، روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ تصوف اور معرفت کی چاشنی نے ان کی غزلوں کو اور دلکش بنا دیا ہے۔ فارسی اور عربی پر قدرت ہونے کے باعث عربی اور فارسی کے ٹکڑے بہت مہارت سے چسپاں کرتے ہیں۔ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اُردو میں ایک زوردار مخمس لکھا ہے جس میں فارسی کے مشہور شاعر قدسی کے اشعار کو بطور تضمین استعمال کیا ہے۔ اس کے ایک ایک مصرعے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی والہانہ محبت، شیفتگی اور عشق کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً:۔

ختم ہے تجھ پہ نبوت اے بشرِ مطلبی
تیرے محتاج ہیں سب شاہ و گدا شیخ و نبی

ہے مجھے تیری ثنا سے ہی صفائے قلبی
مرحبا! سیدِ مکی مدنی العربی

دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

سیدا مجھ کو تری ذاتِ مقدس کی قسم
واسطے تیرے بنے ارض و سما لوح و قلم

نور تیرے سے منور ہوئے دونوں عالم
من بیدل بہ جمالِ تو عجب حیرانم

اللہ اللہ چہ جمال ست بدیں بوالعجبی

ذاتِ اطہر ہے شفاخواہ ہمہ پیر و نبی
ہے شفاعت کی قبا جسمِ مطہر پہ سجی

مثلِ قدسی کے ہے کہتا یہ گدا تشنہ لبی
سیدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی

آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی

روحانیت کے منبع، صوفیوں کے پیشوا اور رسولِ عربی کے علوم کے امین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں جس مستی اور عقیدت سے اشعار کہے گئے ہیں وہ قابلِ دید ہیں :-

علی ہے آبِ رنگ و بوئے گلزارِ الٰہی کا
علی ہے لولوئے لالائے عمانِ خدائی کا

علی ہے مصدر الانوار نورِ کبریائی کا
علی ہے مظہر الاسرار سرِ مصطفائی کا

علی کا نام ہے رہبر رہِ صدق و صفائی کا
لڑکپن میں شہا تو نے دہن چیرا تھا اژدر کا

تجھے بخشا مرے مولیٰ! خدا نے حوضِ کوثر کا
کیا تجھ شاہ کی جرأت نے زہرہ آب عنتر کا

گدا ہے مدح گو گلشن فقط اک آپ کے در کا
کرم اس پر کرو صدقہ شہیدِ کربلائی کا

اب کچھ غزلیں ان کی بطور نمونہ اُن کی کلیات سے درج ذیل ہیں :-

(۱)

اسیر کر کے مجھے ہو گیا نہاں صیاد
خدا کے نام بتا دو کہ ہے کہاں صیاد

عبث تو میری طرف سے ہے بدگماں صیاد
ہے ڈر کہ گر نہ پڑے تجھ پہ آسماں صیاد

بھلا میں جاؤں قفس چھوڑ کر کہاں صیاد
اگر گماں ہے تجھے کر لے امتحاں صیاد

نہ آب و دانہ کا مجھ کو خیال ہے دل میں
گلا یہ ہے کہ ہے غیروں پہ مہرباں صیاد

کبھی کرے نہ کسی کو اسیرِ کنجِ قفس
اگر سنے مری اک بار داستاں صیاد

یہ عندلیب نے رو رو کے ہجرِ گل میں کہا
کرا دو چل کے مجھے سیرِ بوستاں صیاد

کمالِ شوق سے اڑتے ہی دام میں آ پھنسا
نظر جو دور سے آیا وہ باغباں صیاد

جو آ کے دل میں ترے کر دہی جفا و ستم
میں ایک لمحہ کا تیرا ہوں میہماں صیاد

کبھی کبھی تو وہ سنتا ہے حالِ دل میرا
خدا کا شکر ملا مجھ کو قدرداں صیاد

(۲)

بارک اللہ مہرِ مولیٰ کی یہ کیا ایجاد ہے
دل مرا قمری ہے قدِ یار گر شمشاد ہے

گرچہ ہر بے رنگ رنگِ عرض و جوہر ہے مگر
رنگ سے اس گل کے رنگینِ گلشنِ ایجاد ہے

کیا کروں تعریف اس کی جس کی صورت دیکھ کر
صورتِ تصویر حیراں مانی و بہزاد ہے

گرچہ ہے مشہورِ عالم شہرِ حسن آبادِ ہند
کوٹری بھی سندھ میں اک شہرِ حسن آباد ہے

میں گدا روزِ ازل سے ہوں محمد کا غلام
دل میں حبِ شاہِ مرداں قلعۂ فولاد ہے

(۳)

سماں باغ کا مجھ کو بھاتا نہیں
بجز تیرے کچھ دل میں آتا نہیں

جہاں میں جو چرچا محبت کا ہے
بجز میرے کوئی دکھاتا نہیں

بتانِ جہاں سے ہے کیا واسطہ
صنم کوئی تجھ سا تو بھاتا نہیں

کتابت میں کس کے حوالے کردوں
کوئی یار تک لے کے جاتا نہیں

پرندوں کو بھی مجھ سے ہے دشمنی
کبوتر خطِ یار لاتا نہیں

کرے گا مرے گھر کو روشن وہ ماہ
جیسے کوئی بادل چھپاتا نہیں

لبِ بام آیا ہے شاید وہ ماہ
نکلنے کو اب چاند آتا نہیں

ابھی باہر آنے کو ہے شوقِ دل
وہ اب پیرہن میں سماتا نہیں

امیرِ زماں میر عبدالحسین
گدا کو سخا سے بھلاتا نہیں

(۴)

قدِ جاناں ہے یا سروِ رواں ہے
رُخِ زیبا بہارِ بے خزاں ہے

مری آنکھوں کے خونی آنسوؤں سے
فراقِ یار میں دریا رواں ہے

یہ میری آہ کی ہے گر نہ تاثیر
تو پھر چکر میں کیوں کر آسماں ہے

غمِ دوری سے دلبر کے شب و روز
لبوں پر میرے فریاد و فغاں ہے

کیا بے خود مجھے ساغر پلا کر
یہ فیضِ صحبتِ پیرِ مغاں ہے

مجھے کیا فکر ہے روزِ جزا کا
رسول اللہ شفیعِ عاصیاں ہے

(۵)

جب وہ دلبر دوش سے ہم دوش تھا
بادۂ عشرت کا تب اک جوش تھا

بحرِ غم میں غیر ہوتا کیوں نہ غرق
جب کہ مجھ سے یار ہم آغوش تھا

سنتے ہی اس گل کی خوش الحاں صدا
ہر گلِ رنگیں ہمہ تن گوش تھا

جن کی ہر لحظہ تمنا تھی مجھے
اس کے لعلِ لب کا بس مئے نوش تھا

دیکھ کر اس ماہ کا حسن و جمال
شکوۂ فرقت سے میں خاموش تھا

عالمِ فانی کا سب عیش و نشاط
جاگنے پر خواب کے روپوش تھا

عشقِ مولیٰ میں تھا جب بے خود گدا
عشقِ دنیا کا نہ اس کو ہوش تھا

(۶)

تری بزم میں ہم ہیں آنے کے قابل
ہیں اغیار مردود جانے کے قابل

بجز میرے ہے کون اے ماہِ پیکر
قدم پر ترے سر جھکانے کے قابل

اشارہ کریں گے ترے سامنے کیا
نہیں جب کہ ہم سر ہلانے کے قابل

اگر حق کے طالب ہو، باطل کو چھوڑو
کہ ہے حرفِ باطل مٹانے کے قابل

ملو مجھ سے آکر کہ اے راحتِ جاں
شکر شیر سے ہے ملانے کے قابل

ترے عاشقوں میں نہیں کوئی مجھ سا
غمِ ہجر میں زہر کھانے کے قابل

غزل مجھ غلام محمد گدا کی
زمانے میں ہے داد پانے کے قابل

(۷)

خوش کیا تم نے اس ستمگر کو
توڑ کر اپنے کاسۂ سر کو

کیا عجب کردیں لحظہ میں غرقاب
چشمِ گریاں سے شہر کو بر کر

یہ تمنا ہے میری جا کے دھروں
اُس کے قدموں میں کاٹ کر سر کو

اُس پری رو نے کر دیا بے قدر / لب و دنداں سے لعل و گوہر کو

دیکھ کر قامتِ بلندیِ دوست / کیوں خجالت نہ ہو صنوبر کو

لبِ شیریں سے اس کو کیا تشبیہ / قند کو انگبیں کو، شکر کو

یا الٰہی تو پھر حکومت دے / جام صاحب غریب پرور کو

فتح و نصرت نصیب ہو دائم / اس عظیم الوقار سرور کو

مجھ کو حاصل ہو دولتِ دیدار
ہے گدا کی صدا یہ حیدر کو

(۸)

جس کا میں بلبل ہوں، وہ رشکِ چمن ملتا نہیں
جس کا میں کمخواب ہوں وہ گل بدن ملتا نہیں

کوہ کن سا کوہ کن ہوں مثلِ مجنوں دشت زار
پھر بھی رشکِ لیلیٰ شیریں سخن ملتا نہیں

بادشاہت جن کی تھی وہ آج ہیں مثلِ گدا
آدمی کو دائماً عیشِ زمن ملتا نہیں

روضۂ رشکِ جناں پر جن کو ہر دم ناز تھا
ہائے ان کے واسطے گور و کفن ملتا نہیں

اے گدا مُہرِ خموشی اپنے منہ پر تو لگا
آہ و زاری سے کبھی غنچہ دہن ملتا نہیں

(۹)

کل جو آیا وہ گل اندام گلستاں کے قریب / آ گئی جان میں جاں بلبلِ بے جاں کے قریب

مرغِ دل جا کے پھنسا زلفِ پریشاں کے قریب / جیسے بلبل ہو کوئی سنبلِ ریحاں کے قریب

آنکھیں پھرتی ہیں مرے سامنے دلِ ویراں کے قریب / مست جس طرح سے ہو ہو بیاباں کے قریب

(۱۰)

کل جو اُس گل کا گزر جانبِ گلزار ہوا / اس کے عارض کی طرف دیکھ کے گل زار ہوا

مرغِ دل دامِ محبت میں گرفتار ہوا / پھر نئی طرح عطا عشق کا آزار ہوا

جو کوئی نشۂ توحید میں سرشار ہوا / بے گماں ہر دو جہاں میں وہی سردار ہوا

عیش و عشرت میں گزارے گا وہاں صبح و مسا / خوابِ غفلت سے یہاں جو کوئی بیدار ہوا

ہفت افلاک کی زمیں میں ہے جو نہاں و عیاں / کلمۂ کُن سے خدا کے ہے وہ اظہار ہوا

آلِ احمد کا دل و جاں سے گدا ہوں اے گدا
روزِ اول سے یہ اس بندے کا اقرار ہوا

(۱۱)

زلفِ دلدار زنگباری ہے / یا فرنگی ہے یا تتاری ہے

چشمِ جاناں سے ہو چکے ہم قتل / تیغ ہے تیر ہے کٹاری ہے

قدِ جاناں ہے سروِ باغِ جمال / روئے دلدار گل بہاری ہے

دردِ ہجراں میں تیرے اے گل رو / میری شب روز آہ و زاری ہے

تم نے وہ خواب میں نہیں دیکھی / جو کہ اس دل میں بے قراری ہے

دشمنوں کو بھی رب دکھائے نہیں / جس طرح مجھ کو انتظاری ہے

روز و شب، صبح و شام بلکہ مدام   تیرے در پہ گدا بھکاری ہے

(۱۲)

اسی محبوب کو دیکھا کہ ھا ھا ھا کہ ھو ھو ھو
سراپا نورِ وحدت تھا کہ ھا ھا ھا کہ ھو ھو ھو
عرق تھا اس کے عارض پہ گری شبنم تھی لالہ پر
طلا تھا، یا کوئی ہیرا کہ ھا ھا ھا کہ ھو ھو ھو
وہ آنکھیں اس کی شیر افگن کہ جس کے خوف سے آہو
بیاباں کی طرف بھاگا کہ ھا ھا ھا کہ ھو ھو ھو
خیالِ زلف نے دل کو ڈسا تھا مار کی مانند
بلا سے بھی وہ تھی بالا کہ ھا ھا ھا کہ ھو ھو ھو
گدا اس شمع رو کا ہوں دل و جاں سے میں پروانہ
ہے عالم جس کا دیوانہ کہ ھا ھا ھا کہ ھو ھو ھو

(۱۳)

تجھ سا کوئی اے نازنیں دیکھا نہیں ناز آفریں
دیکھا نہیں ناز آفریں تجھ سا کوئی اے نازنیں
تیری گلی خلدِ بریں میرے لیئے ہے اے پری!
میرے لیئے ہے اے پری! "تیری گلی خلدِ بریں"
دل پر مرے نقشِ نگیں ہے مہر تیری اے صنم
ہے مہر تیری اے صنم دل پر مرے نقشِ نگیں

ہجراں میں ہوں زار و حزیں مجھ کو ہے سوگندِ حزیں
مجھ کو ہے سوگندِ حزیں ہجراں میں ہوں زار و حزیں
یا سرورِ دنیا و دیں، تو ہی تو سیّد ہے مرا
تو ہی تو سیّد ہے مرا یا سرورِ دنیا و دیں

(۱۴)

دیکھ کر تیرے رخِ درخشاں کو   داغ ہے دل میں ماہِ تاباں کو
اپنی زلفیں نہ چھیڑ تو ہر بار   کر پریشاں نہ مجھ پریشاں کو
تیرے یاقوتِ لب سے ہے بھاری   سنگ سینہ پہ لعلِ تاباں کو
شوخیِ چشمِ یار سے اس بار   بھاگے ہیں سب ہرن بیاباں کو
جب نہ دیکھوں میں اپنا گل رخسار   خار جانوں میں تب گلستاں کو
دُر ہوا سینۂ صدف میں نہاں   دیکھ کر اس کے دُرِّ دنداں کو
اے گدا! مورِ عشق نے سمجھا
اپنے رتبے سے کم سلیماں کو

(۱۵)

بغل میں جب نہ ہو دلبر تو پھر کیا ذوق جینے کا
نہ ہو مجلس میں جب ساقی تو کیا حظ مئے کے پینے کا
ہوا ہے دستِ غم سے پارہ پارہ تیرے ہجراں میں
رفو ہوگا بھلا کیوں کر یہ میرا چاک سینے کا
ستارہ چاند کے اوپر ہے یا شبنم ہے لالہ پر

نہیں تیری جبیں پہ ہے یہ اک قطرہ پسینے کا

نہیں اس کے سوا کچھ فخر مجھ کو ہر دو عالم میں
کہوں میں خاکِ پا آلِ شہنشاہِ مدینے کا
گدا صبح و مسا، سائل ہے شاہا! آپ کے در پر
سنو اے منبعِ احساں! سوال اپنے کمینے کا

(۱۶)

جو رہے درخشاں میں ترے تاب ہے واللہ — مہتاب ہے مہتاب ہے، مہتاب ہے واللہ
آگے ترے دانتوں کے صنم لوئے لالا — بے آب ہے بے آب ہے، بے آب ہے واللہ
ہر وقت ہے مایوس ترے ہجر میں ہر رات — بے خواب ہے بے خواب ہے، بے خواب ہے واللہ
سیماب سے بڑھ کر تری فرقت میں مرا دل — بے تاب ہے بے تاب ہے، بے تاب ہے واللہ

(۱۷)

کون ہے جو تری چشم کا بیمار نہیں — یا تری زلف کے پھندے میں گرفتار نہیں
یا رسولِ عربی! شاہِ امم تیرے سوا — کوئی اس عاجزِ بیکس کا مددگار نہیں
منع کرتا ہے مجھے عشقِ بتاں سے زاہد — کیا کہوں اس کو کہ وہ واقفِ اسرار نہیں

اس زمانے میں جو دانا ہے وہی ہے حیراں
عیش و عشرت ہے اسے جو کوئی ہشیار نہیں

(۱۸)

ہوئے ہو آج جو تم اس قدر خفا ہم سے — بتاؤ کون سی ایسی ہوئی خطا ہم سے
امیدوارِ عنایات خسروی ہے گدا — کرم سے کیجیئے وعدے کو اب وفا ہم سے

(۱۹)

نہ مجھے حور نے مارا، نہ پری نے مارا — ہاں مگر یار کی کم نظری نے مارا
وہ قدمِ ناز سے چل کر اسے پامال کرو — دم رفتار جو ہے کبک دری نے مارا
دین و دنیا، دل و جاں، و قرار و آرام — لے کے کہتے ہو تجھے کیسی پری نے مارا
اٹھ کے اس باغ کی ہم بھی تو کبھی کرتے سیر — کیا کہیں ہم کہ ہے بے بال و پری نے مارا

انقلاباتِ زمانہ اور گردشِ دوراں پر حضرت گدا کا یہ قطعہ بھی نہایت دل آویز ہے:-

"قطعہ"

وہ جس محفل میں کل مستوں کا برپا شور اور غل تھا
عجب تھا دورِ ساغر کا عجب مینا کا قلقل تھا
وہاں دیکھا جو میں نے آج اک گردش سے گردوں کے
نہ وہ مجلس، نہ وہ ساقی، نہ ویسا کچھ تجمل تھا

صاحبِ مقالات الشعرا مخدوم ابراہیم خلیل ٹھٹھوی نے اُن کی اُردو کی حسبِ ذیل غزل نقل کرتے ہوئے لکھا کہ:-

"در کلام ہندی بغایت مہارت و نہایت شہرت دارد
انموذجی از آں می آرد۔"

گلے میں یار کے شب کو جو ہم نے درغ کیا
دو چار جب ہوا اغیار تب دروغ کیا

بزنگِ کرمکِ شب تاب ہو گیا مہتاب
جمالِ عارضِ جاناں نے جب فروغ کیا
شبِ فراق بھی منظور ہم کوں تھی شوکت
سیاہ غم کے لیے ہم نے آہ طوغ کیا
صفائے قلب کی ہر لحظہ کیوں نہ ہو لازم
خدا نے قوت ہماری جو شیر و دوغ کیا
نہ ایک رات بھی وہ ماہ رُو ہوا باہر
گدا کے دل نے ہزار اس کے غم کا سوغ کیا[1]

[1] تکملہ مقالات الشعراء - ص ۵۲۵

(۲۸) حضرت سوبھا فقیر لغاری

۱۲۳۵ھ - ۱۳۲۵ھ
۱۸۲۰ء - ۱۹۰۷ء

حضرت سوبھا فقیر کے والد احمد لغاری داؤد والا گاؤں میں رہتے تھے جو ضلع سکھر میں واقع ہے۔ حضرت سوبھا فقیر کی پیدائش اسی گاؤں میں ہوئی تھی۔ آپ کی پیدائش کے بعد آپ کے خاندان والے اس گاؤں کو چھوڑ کر تعلقہ میرپور ماتھیلو ضلع سکھر کے ایک گاؤں داد لغاری میں آباد ہو گئے تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ روحانیت کی طرف مائل ہوئے اور حضرت پیر محمد عارف سجادہ نشین حضرت پیر صاحب اسیر محکم الدین سیلانی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے، اور ان ہی سے کسبِ فیض کے بعد عبادت و ریاضت اور خدمتِ خلق میں مشغول ہو گئے۔

آپ سماع کے بہت شوقین تھے اور اُسے عبادت سمجھتے تھے۔ اکثر مجلسِ سماع منعقد کرتے۔ مستی میں آکر خود بھی گانے لگتے۔ آپ کو علمِ موسیقی میں خاصا درک حاصل تھا۔ آواز میں کشش اور درد تھا۔ جو سنتا عالمِ تحیر میں مبتلا ہو جاتا۔ مجلسِ سماع کے دوران آپ زیادہ تر گریاں رہتے۔ عمر بھر مجرد رہے۔ خدمتِ خلق کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا تھا۔ نوے برس کی عمر میں ۲۱ ذیقعدہ ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء کو واصل بحق ہوئے۔ آپ کا مزار مقدس شہر میرپور ماتھیلو سے ۱۶ میل

جنوب مشرق کی طرف "گوٹھ عالمانی" میں آج بھی مرجع خلائق ہے۔

حضرت سوبھا فقیر سندھی اور سرائیکی کے اچھے شاعر تھے۔ آپ کا مجموعۂ کلام "دیوان درد عشق" کے نام سے سندھی اور سرائیکی کافیوں اور دوسری نظموں پر مشتمل چھپ چکا ہے۔ اردو میں گرچہ باقاعدہ کوئی غزل یا نظم ان کی دستیاب نہیں ہوئی ہے لیکن اپنی سندھی اور سرائیکی کافیوں میں جس مہارت سے انھوں نے اپنے اردو مصرعے جوڑے ہیں وہ اردو میں ان کی شعرگوئی کی صلاحیت کی غمازی کرتے ہیں۔ ان کے چند اردو مصرعے جو سندھی اور سرائیکی کافیوں میں چسپاں ملتے ہیں، درج ذیل ہیں:-

ع سدا دل یاد پنجتن ہے، علی ہادی ہمارا ہے،

ع سوبھا عشق جنہیں سر آیا، سمجھو ساجن پاوے گا۔

ع عارف سر سلطان، آنگن میرے آیا،

(۲۹) حضرت پیر کمال الدین "کمال"

۱۲۹۴ھ - ۱۳۲۸ھ
۱۸۷۷ء - ۱۹۱۰ء

حضرت پیر کمال الدین کمال کی پیدائش ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں نوشہرہ فیروز ضلع نواب شاہ میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم سندھی، فارسی اور انگریزی کی حاصل کرنے کے بعد دینی تعلیم کے لیے مولوی فضل محمد کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ مولوی فضل محمد صاحب، نوشہرہ فیروز کے ایک جید عالم دین تھے۔ اور اپنے علم و فضل کی وجہ سے عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ علوم ظاہری کی تحصیل کے بعد علوم باطنی کی طرف راغب ہوئے اور درگاہ شریف ہالا کے حضرت مخدوم نوح قدس اللہ سرہ العزیز کے سلسلے میں مرید ہو گئے۔ اور برابر عبادت و ریاضت اور رشد و ہدایت میں مشغول رہ کر ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ آپ کا مزار مقدس نوشہرہ فیروز ہی میں ہے۔

حضرت پیر کمال سندھی، سرائیکی اور اردو کے بلند پایہ شاعر تھے۔ کمال تخلص کرتے تھے۔ تصوف اور فقر نے کلام میں سوز اور اثر پیدا کر دیا ہے۔ سماع کے شوقین تھے ہر جمعرات کو ان کے یہاں مجلس سماع منعقد ہوتی تھی اور یکتارا اور ڈھولک پر کافیاں گائی جاتی تھیں۔ مستی کے عالم میں اکثر خود بھی گاتے تھے۔ ان کے مجموعۂ کلام کے ایک قلمی نسخہ کی ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ نے نشاندہی

کی ہے. جس میں ان کی سندھی اور سرائیکی زبان میں کہی ہوئی "کافیوں" ابیات اور سہ حرفیوں کے علاوہ کچھ اُردو میں بھی "کافی" کے طرز پر کہے ہوئے اشعار ملتے ہیں. اکثر سندھی اور سرائیکی کافیوں کے مطلعے اور مصرعے بھی اُردو میں کہے گئے ہیں، مثلاً:-

جب تک اپنا آپ نہ جانے   بازی برہ بنا دے کیوں
وہ واہ سخن تیری چالی   خوش خیالی عجائب عالی
وہ واہ سخن تیری چالی   خوش خیالی عجائب عالی

ع: کمال کر کے سر قربانی عشق اٹڑی پر آوے گا

نمونے کے طور پر ان کے کچھ اُردو اشعار جو "کافی" کے طرز پر کہے گئے ہیں درج ذیل ہیں:-

روز و شب مجھ کو تمہاری یادگیری اے صنم   نام تیرا ہے وظیفہ ورد خیری اے صنم
کچھ مجھے پروا نہیں لیکن ترے دیدار کی   حال زیر عشق تیرے میں زہیری اے صنم
نیم بسمل ہو کے کھاتے ہوں بلائیں دربدر   عشق کشتہ کی کرو دم دستگیری اے صنم
ہے خدا تیرا ثنا گو والضحیٰ واللیل میں   سورۂ یٰسین میں تعریف تیری دلپذیری اے صنم

وہ واہ تماشا لا   بنایا آدم بنا کے دم کا
بے رنگ میں رنگ چھپایا   کر کے ولادے اسم کا
احد سے بنا کے احمد پھر میم بن محمد   لولاک پھر چھلایا مالک عرب عجم کا
ایسا کمال کرنا، مرنے سے آگے مرنا   پیر مغاں پلایا وحدت سے جام جم کا

(۳۰) حضرت فقیر ولی محمد خاں لغاری

۱۲۵۲ھ / ۱۸۳۶ء - ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء

حضرت فقیر ولی محمد خاں لغاری سندھ کے اُن صوفیائے کرام سے ہیں جنھوں نے دولت و حشمت کو فقر پر اور عز و جاہ کو خدمتِ خلق پر ترجیح دی۔ مرصع تاج کے بدلے کلاہِ فقر کو سر پر رکھا۔ اور اپنے خالق کی رضاجوئی کو اپنی زندگی کا مقصدِ اولین سمجھا۔ آپ وزیرِ اعظم نواب ولی محمد خاں کے پوتے اور نواب احمد خاں کے صاحبزادے تھے، جو میران تالپور کے دستِ راست اور ان کی حکومت کے ستون سمجھے جاتے تھے۔ آپ کی پیدائش ۱۲۵۲ھ / ۱۸۳۶ء میں محلہ ٹنڈو ولی محمد خاں حیدرآباد سندھ میں ہوئی تھی۔

۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء میں جب میانی کے میدان میں میران تالپور کا آفتابِ اقبال غروب ہوا اور انگریزوں نے میر نصیر خاں تالپور سے تاج و تخت چھین کر انھیں پابندِ سلاسل کیا تو نواب احمد خاں اپنے دونوں صاحبزادوں ولی محمد خاں اور بخش علی خاں کو لے کر پنجاب بھاگ گئے۔ حضرت فقیر ولی محمد خاں لغاری کی عمر اس وقت سات برس کی تھی۔ چار برس بعد ۱۸۴۷ء میں جب سندھ میں امن قائم ہو گیا تو آپ کے والد نواب احمد خاں اپنے خاندان والوں کے ساتھ اپنی جاگیر میراں پور (موجودہ تعلقہ سکرنڈ) میں واپس ہوئے اور وہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ اور یہیں

حضرت ولی محمد خاں کی تعلیم و تربیت سیہون کے اخوند میاں غلام محمد اور اخوند میاں محمد صادق کے سپرد ہوئی۔ ان لوگوں سے عربی فارسی کی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد آپ کو علوم باطنی کی طرف رغبت ہوئی۔ اپنے فرزند کا تصوف اور روحانیت کی طرف میلان دیکھ کر نواب احمد خاں نے ان کو جھوک عرف میراں پور کے سجادہ نشین حضرت صوفی ابراہیم شاہ فقیر کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ دیا۔ اپنے والد کی ہدایت پر وہ وہاں حاضر ہوئے اور اپنی منزلِ مقصود کو پہنچ گئے۔ حضرت صوفی ابراہیم شاہ فقیر نے بڑی محبت سے انہیں گلے لگایا اور مرید کر کے علوم باطنی میں ان کی تعلیم و تربیت فرمائی، پھر خرقۂ خلافت اور اجازت نامہ دے کر رخصت فرمایا۔ اپنے پیر و مرشد کے فیض سے حضرت فقیر محمد خاں میں اب زبردست تبدیلی آ چکی تھی۔ سنہ ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲ء) میں آپ نے اپنی آبائی جاگیر اور ریاست مرزاں پور سے قطع تعلق کر کے تاجپور ایک چھوٹے سے گاؤں میں بود و باش اختیار کر لی، اور یہیں اپنی بقیہ زندگی عبادت و ریاضت، رشد و ہدایت اور خدمتِ خلق میں گزار کر اسّی سال کی عمر میں ۱۲ رمضان المبارک ۱۳۲۴ھ (۱۹۰۶ء) کو اپنے خالق سے جا ملے۔ آپ کا مزار مقدس تاجپور میں آج بھی مرجعِ خلائق ہے، اور سال میں ایک مرتبہ وہاں زائرین کا ایک بڑا میلہ لگتا ہے۔

حضرت فقیر ولی محمد خاں لغاری نے شاعری فقر اختیار کرنے کے بعد شروع کی عشقِ الٰہی کی جو آگ دل میں لگی تھی اس کی تسکین کے لیے آپ نے شاعری ہی کو ذریعہ بنایا۔ سندھی، سرائیکی، فارسی اور اردو میں آپ کا کلام بہت بلند پایہ اور پُر اثر ہوتا ہے۔ آپ کے مجموعۂ کلام کو ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ نے مرتب کر کے سندھی

ادبی بورڈ کی طرف سے شائع کرا دیا ہے۔ حضرت ولی محمد خاں کافی گو شاعر تھے، موسیقی سے بھی شغف تھا، ستار بہت اچھا بجاتے تھے۔ آپ کا اردو کلام بھی کافی ہی کے طرز پر ملتا ہے۔ آپ کے مطبوعہ مجموعۂ کلام میں چودہ اردو کافیاں جنھیں ہم غزل بھی کہہ سکتے ہیں اور ایک شبد ہندی آمیز موجود ہیں۔ آپ کے کلام میں تصوف اور معرفت کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ آپ کی اردو شاعری کی زبان حضرت گدا جیسی صاف اور شگفتہ تو نہیں پھر بھی خاصی رواں اور دلکش ہے۔ اپنے پیش رو صوفیا حضرت بابا فرید شکر گنج، اور حضرت امیر خسرو کی طرح آپ کے بھی کچھ ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں فارسی کے ساتھ اردو کی پیوند کاری نے عجب گنگا جمنی حسن پیدا کر دیا ہے۔ مثلاً

صبا دہ مژدہ اے مارا کہ آں دلدار کب آوے
وصالِ یار می خواہم پری رخسار کب آوے

روم در گلشنِ خوباں کنم دیدار کب آوے
چو بلبل در چمن پرسم گلِ گلزار کب آوے

برائے صحبتِ جاناں خیالِ بے خودی دارم
طبیبِ دردِ سودایاں مسیحا دار کب آوے

چو یعقوبے ہجر دارم کہ آں ماہ مصری بینم
زلیخا وار می جویم کہ در بازار کب آوے

بیا ساقی بدہ ساغر کہ من مستم ز عشقش او
نہ نوشم بادۂ گلگوں بجز میخوار کب آوے

دلی محمد طریقِ عشق می بینی در ایں منزل
کہ جز منصور در وحدت کسے بردار کب آوے

حضرت فقیر ولی محمد خاں کو اپنے پیر و مرشد حضرت صوفی ابراہیم شاہ فقیر سے بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ ایک دو جگہ انھوں نے اس کا اس طرح اظہار بھی کیا ہے:-

پیالہ مجھ دیا صوفی شراب بے حجابی کا ہوا دیدار دل اندر صنم کے ماہتابی کا

دلی محمد نہ کسی کو کہنہ طریقت کے کفر میں رہ
صوفی کی رمز سے وہ دہ، ہوا مطلب الستی کا

نمونے کے طور پر اُن کا کچھ اُردو کلام ان کے مطبوعہ مجموعۂ کلام سے درج ذیل ہے

(۱)

دیا ساقی مجھے پیالا، اتر گیا دم ہستی کا سارا اسرار ہم دیکھا، عجب صورت پرستی کا
مثل مہتاب تھا روشن، حقیقت کا کھلیا گلشن حسن کا ہو گیا درشن، ہٹا شک دل شکستی کا
سری کے سیر میں جا کر، حسن کا جب دیکھا دفتر وسر گیا خیال مجھ دل پر، ہوس کی بند و بستی کا
دنیا کے دور کی لذت، کہ جس کا ہے لقب ذلت روا اُس کی نہیں صحبت مکاں ہے، تنگ دستی کا
مشاہی چھوڑ دے بالکل، زندی کے رہو سے مل اور گل ہو مثل بلبل، نہ کھا غم شب گزشتی کا
اسی منزل میں ہر عاشق گیا ہے جوش کہہ سالک گیا ہے وہ عبد کہہ مالک گیا ہے سر بادہ ہستی کا
عجائب بیخودی کا دم جس میں نہیں دنیا کا غم درونی دل اندر تھا گم غبار ابوالہوستی کا
ہمیں ہوں عشق کے طالب جو ہے کل اوپر غالب کہوں میں کیا کسے یا لب ہو مالک سرنوشتی کا

دلی محمد نہ کسی کو کہنہ، طریقت کے کفر میں رہ
صوفی کی رمز سے وہ دہ، ہوا مطلب الستی کا

(۲)

پیالا مجھ دیا صوفی شراب بے حجابی کا ہوا دیدار دل اندر صنم کے ماہتابی کا
حسن کا جب دیکھا دفتر عقل گم ہو گیا ابتر تھا ظلمات بیچ ظاہر شعاع آفتابی کا
قلب کی سیر کرتے ہوں صورت کے سنگ پھرتے ہوں مثل نرگس کے کرتے ہوں لطافت نیم خوابی کا

دلی محمد نہ رہ غافل، دنیا کا عیش و عشرت کل
اسی کو چھوڑ دے بالکل، خسارا ہے خرابی کا

(۳)

اے دل وصال کا دم مجھ پر جشن جشن گلزار معنوی کا کھلیا چمن چمن
ذاتی سوں ذات مل گئی ثابت ہوا اسم صورت کی خاک میں تہ گئی دفن دفن
صورت کا نقش عاشق رکھتے ہیں دل اندر میں معنی اسی کی کہہ گئے حب الوطن وطن
صوفی کا دین مذہب وحدت وجود ہے خردی عقل کیا جانے جس کو کٹھن کٹھن
آب حیات چشمہ ظلمات کے اندر ہے مجھ کو ہے اب حیوان چاہ ذقن ذقن
جس کا دلی محمد شفیع امام ہے تس کو تھا حضور تھا نبوی حسن حسن

(۴)

اے دل گزر سکاں موں چلنا ہے رین دن میں
زنگ پور کا سیر دیکھا اب جاؤں گا وطن میں

ساکن ہوں جس عدم کا اب جاؤں گا عدم میں مشتاق ہوں اسی کا اس جا کے سیر ہمت میں

ذاتی سوں ذات مل گئی باقی رہی صفاتی
گم ہو گئی ہے مورت تصویر کے حسن میں

خاکی قفس کا مطلب فانی فنا کہوں میں
جس کا علاج کہہ گئے تحقیق بت شکن میں

ظلمات سے سکندر خالی نکل گیا وہ
عاشق وصال پایا معشوق کے ذقن میں

دنیا سرائے ماتم جس کو بقا نہیں ہے
عاشق مدام رہتے دیدار کے جشن میں

حب الوطن کے معنی یوں حج اکبری ہے
دیکھو ولی محمد تم قلب کے صحن میں

(۵)

دل محو ہو گیا محبوب کے حسن میں
مشتاق ہوں اسی کا بلبل مثل چمن میں

ذاتی ہے ذات میری ملک عدم میں داخل
قسمت مجھے پھنسایا اس زلف کے رسن میں

آدم کا بدش کر کے کہتا ہوں بادشاہی
نا کوئی مکاں یکجا رہتا ہوں عشق بن میں

کہتا ولی محمد دم دم کے سیر کا ہے
ذاتی مجھے دکھایا انحد کے گھور گھن میں

(۶)

ترے دیدار میں ہادی مرے دل کا نظارا ہے
کہ دل میں کیا کیسے ظاہر بہت اس کا پسارا ہے

نگہہ کر دیکھ یہ ساقی مرے دل کا یقین قائم
ہمیشہ جام صہبا سے دماغم پُر خمارا ہے

خدا بن حال میرے کا نہیں کو دوسرا واقف
کہ ساری رین میں مجھ کو ستاروں کا شمارا ہے

اگر ہووے خطا میری کرو تم معاف اے دلبر
میرا اس ملک فانی میں یہ دو دن کا گزارا ہے

ولی محمد نہ کیجیے غم وصال یار کا ہرگز
ہجر کی راہ میں آخر اسی مشکل کا چارا ہے

"شبد" ہندی آمیز کا انداز یہ ہے :-

سادھو سادھ سنگت میں راکھو، دھیان چھوڑ دوئی ابھمان
مول چکر کا کرو نظارا ( ) نیم سدھ سے جوت نیارا
انتر بھیتر ستر سجان

---

(۳۱) "حضرت سید مصری شاہ نصرپوری"

۱۲۴۵ھ - ۱۳۳۵ھ
۱۸۲۹ء - ۱۹۰۶ء

حضرت سید مصری شاہ کا تعلق نصرپور کے مشہور رضوی سادات کے خاندان سے تھا، آپ کے والد سید بلند شاہ نصرپور کے ایک معزز اور محترم شخص تھے حضرت سید مصری شاہ کی پیدائش ۱۲۴۵ھ ۱۸۲۹ء میں ہوئی۔ والد کا انتقال اُس وقت ہوا جب آپ بہت کم سن تھے، بڑے بھائی فتح شاہ نے آپ کی پرورش و پرداخت کی۔ سندھی، عربی، اور فارسی کی تعلیم قاضی گل محمد گل نصرپوری کے مدرسے میں حاصل کی۔ علوم ظاہری کے حصول کے بعد علوم باطنی اور روحانیت کی طرف مائل ہوگئے۔ اور لاہور، دہلی، اجمیر شریف کے علاوہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں گھومتے رہے، بزرگانِ دین کی درگاہوں سے خاص تعلق قلبی تھا اس لیئے اکثر اجمیر شریف اور دہلی کی درگاہوں میں حاضر ہو کر بزرگانِ دین سے روحانی فیض حاصل کرتے رہے۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی قدس اللہ سرہ سے آپ کو بڑی عقیدت تھی اور غالباً اسی سلسلے میں مرید بھی ہوئے تھے۔ مولانا روم کے کلام کے عاشق زار تھے۔ آخر عمر میں نصرپور ہی میں گوشہ نشین ہو کر یادِ الٰہی اور رشد و ہدایت میں منہمک رہتے تھے۔ ایک بار نصرپور میں ہولناک قسم کا ہیضہ پھیلا، شہر چھوڑ چھوڑ کر لوگ بھاگ گئے لیکن آپ توکل علی اللہ وہیں جمے رہے اور اللہ کے فضل و کرم سے

جملہ متعلقین کے ساتھ محفوظ و مامون رہے۔ لوگ آپ کی بزرگی کو مان گئے۔ ۵ صفر المظفر ۱۳۳۵ھ ۱۹۰۶ء کو تقریباً نوے برس کی عمر میں اس دارِ فانی سے کوچ فرمایا۔ نصرپور میں شاہ محمود کی درگاہ کے جوار ہی میں سپردِ خاک کیے گئے۔ آپ کے مزارِ مقدس پر ہر سال ۵ صفر کو زائرین کا بڑا مجمع ہوتا ہے اور آپ کے مریدین آپ کا عرس کرتے ہیں۔

حضرت مصری شاہ سندھی، سرائیکی، فارسی اور اُردو کے بلند پایہ شاعر تھے، سندھی کافی کو آپ نے بہت ترقی دی، اور اُردو غزل کے ہم پایہ بنا دیا۔ اُردو میں بھی آپ کافی ہی کے طرز پر اشعار کہتے تھے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے:-

(۱)

رہا ہوں میں روزِ ازل سے پیاسا
زمیں خاک میخانہ کی ہن میں آسا

کرو عام انعام مئے ناب مستی
خودی خود پرستی مئے خام سستی

بجس نفس زہر بھاگ جاوے ترا سا
تصرف کی طلعت نہ کچھ دور دم ہے

یہ تشریف تیری کسی پر نہ کم ہے
درد کیش درویش دیو و دلا سا

سما تا سمک رونقِ رنگِ مینا
قدح کیف قدرت سے بھر لو بھینا

عنایت کرو آب آتش لباسا
ارغواں ہیمان ساغر شوایا

فلک نیلگوں نوع دیگر میں آیا
ہو مخمور مصری بھلا ایک ما سا

(۲)

پتیم مت پردیس بدھارو رت ساون کی سانوریا

کالی گھٹا گھٹ رین اندھیری
برس ڈرا دے باوریا
بار بار پیا بجلی چمکے
چڑھ چڑھ جنبریا
کوکی مور پپیہا بولے
دھوم مچے وچ دھادھڑیا
رہو ہمارے پاس پیرا
بہن کسو تیل کیسریا
مصری ساتھ مقابل بیٹھو
من موہن مل منڈیا

"شبد"

مرلی سے مجھے موہ کے، جوگی جان لے گیو رے
کس دیس سے آیو
جوگی آیا کس گام کا، پایا پیچ زلف کے دام کا
سکھ صبر چین آرام کا، سامان لے گیو رے
کانوں میں کنڈل پائے کے، کیسر تلک لگائے کے
گائی الٹی بین بجائے کے، ساہا شانی لے گیو رے
بالوں کا جوڑا کھول کے، کالے کیس کنگھی سے پھول کے
ہنس ہنس کے باتیاں بول کے اگن گیان سے گیو رے
سائی آیا ہے سنگر، مصری کیوں کر منتظر خمدار مار خنجر، دھن دھیان لے گیو رے

(۳۲) "حضرت پیر بھاون علی شاہ ساقی"

۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۶ء - ۱۳۳۷ھ / ۱۹۱۸ء

حضرت پیر بھاون علی شاہ ساقی کے والد ماجد حضرت پیر محمد شاہ درگاہ شاہ قادری بدین ضلع حیدرآباد کے سجادہ نشین اور اپنے عصر کے مشہور صوفیائے کرام میں سے تھے۔ حضرت پیر بھاون علی شاہ کی پیدائش ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔ چودہ برس کے سن تک اپنے والد ماجد سے علوم ظاہری اور باطنی کی تحصیل کرتے رہے اور ان ہی سے قادریہ سلسلے میں بیعت بھی حاصل کی۔ ۱۹۰۰ء میں اپنے والد کے وصال کے بعد ان کی جگہ سجادہ نشین ہوئے اس وقت اُن کی عمر چودہ سال کی تھی لیکن علم سے بے حد شغف ہونے کے باعث مشہور علما اور فضلا سے تعلیم اور کتب بینی کا سلسلہ جاری رکھا۔ سندھی فارسی اور عربی کے بہت اچھے عالم تھے۔ انگریزی سے بھی خاصی واقفیت تھی۔ آپ کو مذہبی اور دینی علوم کے ساتھ ساتھ شعر و ادب سے بھی دلچسپی تھی سندھی، فارسی، اور اُردو کے بلند پایہ شاعر تھے؛ ساقی تخلص فرماتے تھے۔ کتب بینی کے ساتھ اچھی اچھی کتابوں کے جمع کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ اور کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ اردو میں اشعار کے علاوہ آپ نثر بھی لکھتے تھے۔ ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ نے اپنی کتاب "سندھ میں اردو شاعری"

میں لکھا ہے کہ حضرت پیر بھاون علی شاہ نے اپنے خاندان کے حالات اُردو میں لکھے تھے لیکن وہ کتاب اب تک منظرِ عام پر نہیں آئی اس لئے اِس کے بارے میں تیقن کے ساتھ کوئی رائے زنی نہیں کی جا سکتی۔

۱۳۳۷ھ / ۱۹۱۸ء میں آپ کا وصال ہوا، آپ کے کچھ اُردو اشعار بہ طور نمونہ درجِ ذیل ہیں:-

حضورِ داورِ محشر اکیلا جا کھڑا ہوں گا
بجز تیرے نہ ہوئے گا سہارا یا رسول اللہ

بتلا اے مرغِ دل تو نے کہاں اپنا وطن چھوڑا
نہ رستہ دشت میں پایا، کہاں اپنا چمن چھوڑا
کہاں وہ باغِ فردوسی، کہاں وہ جنت الماویٰ
کہاں وہ قصرِ ملکوتی، کہاں ملکِ عدن چھوڑا
کہاں وہ آبِ انگوری، کہاں وہ عنبریں ساغر
کہاں وہ نرگسِ شہلا، کہاں مشکِ ختن چھوڑا

جمالِ یار جمالِ قمر نہ یکساں ہے
ہمارے دیدۂ گریاں ابر نہ یکساں ہے

---

(۲۳) حضرت کلیم اللہ شاہ

سنہ ۱۲۹۳ھ
۱۸۷۶ء

حضرت سید کلیم اللہ شاہ کے والد ماجد حضرت محمد ارشد شاہ اور دادا محمد عطا شاہ پیر صاحب پگاڑہ حضرت محمد راشدؒ کے ہم جد تھے۔ یعنی پیر سائیں محمد راشدؒ (روضے دھنی) حضرت محمد عطا شاہ کے والد پیر علی مرتضیٰ شاہ کے بڑے بھائی تھے۔ حضرت سید کلیم اللہ شاہ کا خاندان شاہانی سادات کے نام سے مشہور ہے۔ آپ کی پیدائش "شاہ جو گوٹھ" ضلع لاڑکانہ میں ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء میں ہوئی تھی۔ فارسی، عربی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے علم طب بھی پڑھا تھا، اور خدمتِ خلق کے طور پر طبابت کا بھی مشغلہ رکھتے تھے۔ علمِ موسیقی سے خاص شغف تھا، سماع کے شوقین تھے۔ سندھی، سرائیکی، فارسی اور اردو کے اچھے شاعر تھے۔ سندھی میں کافیاں اور اُردو میں غزل زیادہ کہتے تھے۔ اُردو کلام کی زبان شگفتہ، صاف اور رواں تھی۔ آپ کی غزلیات کا ایک مجموعہ مخطوطے کی شکل میں مرزا عباس علی بیگ ٹنڈو آغا حیدرآباد کے پاس محفوظ ہے۔ اس قلمی نسخے کے آخر میں آپ ہی کے ہاتھ سے اُردو کی یہ عبارت درج ہے:-

"تمت ہوگئی غزلیات اُردو تصنیف کلیم اللہ شاہ جناب سائیں کے حکم کے بموجب۔ چند نمونہ غزلیات اردو لکھے گئے ہیں، اگر منظور

ہو تو چند ورق اور بھی خدمت میں ادا کریں ۔ فقط

"تاریخ ۱۷ ماہ رجب المرجب ۱۳۲۲ھ کلیم اللہ شاہ"

مندرجہ بالا عبارت سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ آپ قلم برداشتہ اُردو نثر لکھنے پر قادر تھے اور صاف نثر لکھتے تھے، نیز یہ کہ نجی معاملات میں اُردو سے بھی کام لیتے تھے۔ دوسری بات آن کی سالِ وفات کے سلسلے میں ہے۔ ان کا سنہ وصال باوجود کوشش دستیاب نہ ہوسکا لیکن اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۳۲۲ھ تک آپ بقیدِ حیات تھے۔ آپ کا وصال اس کے بعد کسی سنہ میں ہوا ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار درج ذیل ہیں :۔

گر یار خدا آج ملا دے تو کیا عجب	شربت بھی اپنی ہاتھ پلا دے تو کیا عجب
ہم چاک، دل چاک ہمارا ہے بدن چاک	یار وصل کی سوزن سے سلا دے تو کیا عجب

پری رویوں کی ہے تجھ کو امامت	امامت ہے، امامت ہے، امامت
جدائی دل کہوں میں قیامت	قیامت ہے، قیامت ہے، قیامت
کلیم اللہ ہوں در گوشش بندہ	غلامت ہے، غلامت ہے، غلامت

دل میں آیا کہ چل میں آؤں آج	تیری شفقت کا سر پہ لاؤں تاج
کچھ نہیں مانگتا خدا سے مگر	اک رقیبوں کے مرگ کا ہے علاج
داغ جدائی مشکل، مشکل نہیں اے لوگو	جان فدائی مشکل، مشکل نہیں اے لوگو
دلبر کے کوچہ جانا، یہ عیش ہے نہ ذلت	ہر در گدائی مشکل، مشکل نہیں اے لوگو

---

(۳۴) "حضرت پیر جمال الدین علوی"

سنہ ۱۲۹۶ھ ۔ سنہ ۱۳۵۵ھ

حضرت پیر جمال الدین علوی مشہور ولی اللہ شیخ ابوریحان سلطان غیاث الدین عرف شیخ ریحان کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کے والد ماجد پیر محمد ہاشم، قریہ شاہ ابراہیم داداہی گوٹھ تحصیل حیدر آباد کے ممتاز بزرگوں میں تھے۔ حضرت پیر جمال الدین کی پیدائش یہیں اپنے آبائی گاؤں میں، ۲۷ رجب المرجب ۱۲۹۶ھ کو ہوئی۔ سندھی، فارسی، عربی اور اردو پر آپ کو پوری دسترس حاصل تھی۔ اس کے علاوہ ترکی، بلوچی، پشتو اور گجراتی بھی بول سکتے تھے۔ انگریزوں کی غلامی کے خلاف اُنھوں نے سندھ میں آواز بلند کی۔ اور تحریکِ خلافت میں اپنی خدمات پیش کر کے مجاہدانہ سرفروشی سے انگریزوں کے ظلم و استبداد کا مقابلہ کیا۔ آبا و اجداد جس طوفان کو تصوف کے خمار میں نظر انداز کئے ہوئے تھے حضرت پیر جمال الدین نے جہاد کا نعرہ لگا کر اس خمار کو دُور کر دیا اور خرقہ و سجادہ کے بدلے شمشیر و سناں اور علم لے کر میدان میں نکل آئے۔ اپنی باغیانہ تقریر سے پورے سندھ میں آگ لگا دی۔ انگریزی حکام نے گرفتاری کی دھمکی دی تو یہ شعر جواب میں لکھ بھیجا :

تمہاری ہتھکڑی بیڑی نہیں کافی ڈرانے کو
رکھا جب سر ہتھیلی پہ تو کیا پرواہ زنداں کی

آخر پابندِ سلاسل کر کے جیل خانہ بھیج دیے گئے۔ جیل خانے میں بھی اذان
دیں اور نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ انگریز سپرنٹنڈنٹ جیل نے تنبیہ کی تو فی البدیہہ کہا

"اذاں دیں گے بلند اعلان سُنے سارا تمام عالم
حکم حق نے دیا ہم کو کہا احمدؐ نبی اکمل"

اس پر ان کی سزائیں اضافہ کر کے ان کو سندھ سے باہر تھانہ (بمبئی) سے آگے
کے جیل خانہ میں بھیج دیا گیا۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے اپنی تحریک کو اور تیز کر دیا
اپنے انقلابی نظریوں کو کھلم کھلا بے خوف و خطر بیان کرنے لگے۔ محمد شعیب قریشی
اس جیل خانے میں ان کے ساتھ تھے جو پیر صاحب کی ہمت مردانہ اور جوش ایمانی
سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ حضرت پیر صاحب نے باضابطہ اپنے کلام
کا کوئی مجموعہ نہیں چھوڑا۔ ان کو اس کا موقع ہی کہاں تھا لیکن اس وقت کے اردو
اخبارات میں ان کی اردو نظمیں اور مضامین اکثر شائع ہوتے رہے ہیں۔ تھانہ
جیل خانہ میں آپ نے ایک نظم کہی تھی۔ اس کے یہ دو اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں

عجب تیری قدرت دیکھی یا الٰہی — کہ قسمت وطن سے اُٹھا ہم کو لائی
وہاں آکے پہنچیں کہ سندھی نہ سمجھیں — نہ اکڑے "یہ تکڑے" یہ کہتے یہ بھائی

آپ کا وصال ۱۲ شوال سنہ ۱۳۵۵ھ مطابق ۲۷ دسمبر سنہ ۱۹۳۶ء کو ہوا۔
دلی شیخ ریحان کے قبرستان میں سپردِ خاک کیے گئے۔

(۳۵) حضرت سائیں عبد الغنی قدس اللہ سرہٗ

سنہ ۱۲۶۰ھ - سنہ ۱۳۵۷ھ

حضرت سائیں عبد الغنی قریشی قادریؒ ایک عارف باللہ صوفی
تھے۔ انھوں نے کراچی میں قادریہ قلندریہ سلسلے کی ایک خانقاہ قائم کی
جو آج تک رشد و ہدایت کا مرکز ہے۔ اور اس خانوادے میں کئی خدا
رسیدہ اور روشن ضمیر صوفی پیدا ہوئے۔

حضرت سائیں عبد الغنیؒ کے جدِ بزرگوار سنہ ۱۸۵۷ء کی ناکام
جنگِ آزادی کے بعد دانا پور (پٹنہ) سے ہجرت کر کے احمد نگر (دکن)
میں پناہ گزین ہوئے اور پھر کچھ عرصے بعد کراچی (سندھ) میں آ کر
بس گئے۔ دانا پور میں آپ ایک معزز خوش حال زمیندار گھرانے سے
تعلق رکھتے تھے۔ گھر میں پیری مریدی کا بھی سلسلہ تھا۔ غالباً اس خاندان
کے ترکِ وطن کرنے کا ایک بڑا سبب پیری مریدی کے سبب عوام میں
غیر معمولی مقبولیت بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ انھیں خوف ہوگا کہ تسلط کے
بعد انگریز ان کے خاندان کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ نہ بنائیں۔

ترکِ وطن کے وقت حضرت سائیں عبد الغنی کے والد ماجد مولانا شاہ
محمد بشیر صاحبؒ جوان تھے لیکن ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ احمد نگر (دکن)

میں آپ کا خاندان اپنے ایک قدیم آشنا مولانا قاضی عبدالکریم صاحب (قاضی شہر) کے مکان میں ٹھہرا تھا۔ قاضی صاحب کی خواہش پر سائیں عبدالغنیؒ کے دادا نے اپنے فرزند مولانا شاہ محمد بشیر قریشی کی شادی ان کی صاحبزادی سے کر دی۔ وہاں سے پونا ہوتے ہوئے آپ کا خاندان کراچی میں وارد ہوا۔ اور یہیں سکونت پذیر ہو گیا۔ کراچی صدر میں سائیں عبدالغنی کے دادا نے ایک دو منزلہ مکان تعمیر کرایا اور ملازمت اور کاروبار کے ذریعہ گزر اوقات کرنے لگے۔ حضرت سائیں عبدالغنیؒ کی پیدائش یہیں کراچی میں تقریباً ۱۲۶۰ھ میں ہوئی۔

حضرت سائیں عبدالغنیؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے بہنوئی حافظ علم الدین صاحب قادری سے حاصل کی، پھر علوم باطنی اور روحانی کی طرف راغب ہو گئے۔ حضرت سائیں عبدالغنیؒ کا پورا خاندان پیر صاحب پگاڑو حضرت سید محمد بقا مہمل شاہ قادری کا معتقد تھا اس لئے آپ کے والد نے اپنے لڑکے کو بھی بیعت کے لیے پیر صاحب کے آستانے پر حاضر کیا لیکن سائیں عبدالغنی کی تسکین قلبی وہاں نہ ہوئی۔ تیرہ ۱۳ برس کے سن میں آپ فقر و درویشی کی طرف پوری طرح مائل ہو گئے، دنیا سے دل ٹوٹ گیا اور وہ اپنے دوست سید قاسم علی قلعی گر کی دوکان میں قبر نما گڑھا کھود کر کڑی ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ آپ کے والد ماجد کو اس کی خبر ہوئی تو وہ اتنی کم سنی میں ایسی کڑی ریاضت پر ناراض ہوئے۔ والد کی ناراضگی سے ڈر کر وہ گھر سے غائب ہو گئے اور سیدھے اجمیر شریف روضۂ مبارک پر حاضر

ہوئے۔ وہاں شیر علی شاہ نامی ایک فقیر سے ان کی ملاقات ہو گئی اور وہ انھیں اپنے ساتھ احمد نگر گجرات لے کر چلا گیا۔ وہاں کچھ روز تک کافی ریاضت کرتے رہے، پھر خانوادۂ دھمیان کے سرگروہ سرفراز شاہ نے آپ کو شجرہ لکھ کر حوالے کیا۔ وہاں سے رخصت ہو کر آپ کراچی پہونچے، کچھ دنوں تک یہاں ٹھہر کر پھر نکل گئے اور مختلف جگہ کی خاک چھانتے پھرے کہیں غاروں میں چلہ کش ہوئے کہیں اللہ والوں کی صحبت سے مستفیض ہوئے آخر میں کسب کمال کے بعد اپنے مسکن کراچی پہنچے اور یہاں حلقۂ ذکر اللہ کی بنیاد رکھ کر رشد و ہدایت میں مشغول ہو گئے آپ نے جونا دھوبی گھاٹ لیاری میں عمارت حلقہ شریف تعمیر کرائی جہاں ہر اتوار کو ۴ بجے شام کے وقت تعلیم عرفان و ہدایت خود شناسی و خدا شناسی دی جاتی ہے۔ اور ہر مذہب کے اصحاب کو اسی رنگ میں توحید باری تعالیٰ کی تعلیم دیتے۔ ہر چاند کی گیارہ تاریخ کو ذکر قادریہ ہوا کرتا۔ چودھویں رات کی ساری رات ذکر الٰہی میں مریدین کے ساتھ گزارتے اور شب و روز کلام موزوں اسرار تصوف کے کلام موزوں فرماتے۔

حضرت سائیں عبدالغنیؒ کو اللہ نے جمال اور جلال دونوں عطا فرمایا تھا۔ آواز میں غیر معمولی شیرینی اور کشش تھی۔ آپ اکثر یکتارے پر اپنا عارفانہ کلام گاتے تو لوگوں پر بے خودی اور تحیر کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ آپ کے صاحبزادے حضرت صوفی عبدالرشید نے ایک جگہ لکھا ہے کہ آپ کو

لہ رسالہ مرغوب موحدان مطبوعہ ۱۳۵۸ھ صہ

ترسٹھ مرشدانِ کامل اور ولی اللہ بزرگوں سے اکتسابِ فیض کا موقع حاصل ہوا تھا، اور پھر آپ نے ان سب کا نام بھی لکھا ہے لیکن آپ کا سلسلۂ طریقت حضرت شاہ گل حسن قلندر قادری سے ملتا ہے جیسا کہ ان کے شجرہ سے ظاہر ہے ؎

گل حسن شاہ قلندر صاحب تجرید ادب — حضرت سائیں غنی[۳۵] ذی التقا کے واسطے

بعد ازاں حافظ غلام رسول[۳۶] صاحب قادری — بو الرجا شیخ طریقت کی دعا کے واسطے

آپ کے حلیۂ مبارک اور خصائل و عادات کے متعلق شاہ عبد الرشید نے ایک جگہ لکھا ہے :-

"[۳۷]حضرت قبلہ و کعبہ علیہ الرحمۃ کا حلیۂ مبارک — بلند بالا، متناسب الاعضاء، جسم لاغر نہ فربہ، ناک دراز، سر بزرگ، پیشانی و ابرو کشادہ، بینی بلند، چشم متوسط، مگر اس میں جلالت، سفید ریش بود عالمِ ضعیفی دندان سے دہن صاف، سینہ بلند و فراخ، کفِ دست پر گوشت، انگشت دراز، رفتار مردانہ تیز و بے تکلف، آواز پُر شوکت بلند، سر کے پچھلے حصے میں بیش بہ قدرے زلف، نشست و برخاست ہو لا آویز، .... دنیا سے بے تعلق اور اہل دنیا سے یکتا، مخالف و موافق امیر و غریب سب کے ساتھ خلق و تواضع

کا برتاؤ بدرجۂ مساوات تھا، حاکم و امیر ہو یا حقیر و فقیر، نہ اس کی تکریم نہ اس کی تحقیر، ہر مذہب کے پیشوا کی تعظیم کرتے۔ قوت لایموت کے لیے پہلے گائے رکھی دودھ پر گزران رہا، بعدہٗ بکریاں رکھیں خود چرانے لے جاتے اور اپنے دستِ مبارک سے دودھ دوہتے۔ حلقہ شریف کی جاروب کشی آخری عمر تک جاری رکھی، اور اپنا بوجھ آخری دم تک کسی پر نہ ڈالا۔ نہ کسی مرید معتقد کے گھر جاتے نہ اپنا بوجھ کسی پر رکھتے۔"

آپ کا وصال ۲۱ ربیع الاول ۱۳۵۷ھ مطابق ۲۲ مئی ۱۹۳۸ء کو ہوا۔ "قطب ہند آہ سائیں غنی" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ آپ کے وصال کی تفصیل رسالہ مرغوب موحداں[۳۸] میں آپ کے صاحبزادے شاہ عبد الرشید نے اس طرح لکھی ہے :-

"حضور قبلہ و کعبہ میں ہر وقت کسی قسم کی بیماری نمودار نہ ہوئی مگر ضعف ضرور پایا جاتا تھا، چونکہ عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے۔ ۲۰ ربیع الاول ۱۳۵۷ھ ہفتہ کی صبح معمول کے مطابق شہر میں تشریف لے گئے، حلقہ شریف کے نیاز کا سامان خریدا، یکشنبہ کے روز صبح ہی حلقہ شریف تشریف لائے۔ اپنے دستِ مبارک سے حلقہ شریف کو صاف کیا، فاتحہ کا سامان رکھا ...... بوقت دوپہر کے وقت غسل کیا، غسل سے فارغ ہو کر اس دری

---

[۳۷] رسالہ مرغوب موحداں مطبوعہ ۱۳۵۸ھ صفحہ ۱۵

[۳۵] رسالہ مرغوب موحداں مطبوعہ ۱۳۵۸ھ صفحہ ۱۵۔ [۳۶] رسالہ مرغوب موحداں صفحہ ۱۳

کے پاس کھڑے ہو گئے جس کا رخ قبرستان کی جانب تھا پھر فرمایا
آج قبرستان کو دیکھ کر فرحت حاصل ہوئی ہے بہت خوب جگہ
ہے۔ یہ کہہ کر پلنگ پر بیٹھ گئے۔ اُس وقت قبلہ کی حالت میں کچھ
تبدیلی ہوئی سرخ رنگ ہو گیا، چہرۂ مبارک پر سرد پسینہ جاری
ہو گیا۔ مکان میں جو حاضر تھے ان سے فرمایا سینہ پر کان رکھ کر
آواز سنو، یہ سکرات کا وقت ہے۔ لوگ حیران تھے کہ سکرات
والا انسان بیٹھے بیٹھے باتیں کس طرح کر سکتا ہے۔ گھر والوں
نے ڈاکٹر بلانے کا خیال ظاہر کیا، آپ نے منع کیا کہ یہ ڈاکٹروں
کا کام نہیں اور فرمایا کہ جلد فرش زمین پر بچھا دو اور آپ پلنگ
سے زمین پر اُتر آئے۔ قبلہ رُو ہو کر سجدہ میں سر رکھا اور قے کی
بعدہٗ شہد میں پانی ملا کر شہد پینے کی خواہش ظاہر کی۔ تین
چمچے پیئے۔ پھر گھر والوں سے کہا کہ مجھ سے علیحدہ ہو جاؤ
تاکہ میں اپنے رب کے دھیان میں رہوں۔ سب علیحدہ ہو گئے
دیوار سے پشت لگا کر آنکھیں بند کیے کچھ پڑھتے رہے
جلد ہی بستر پر دراز ہو کر جان جان آفریں کو سپرد کی۔"

حضرت سائیں عبدالغنیؒ اردو کے قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کے
کلام کا مجموعہ "کلام عرفان غنیؒ" کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ نثر میں آپ کی
باقاعدہ کوئی تصنیف نظر سے نہیں گزری لیکن آپ کے "ملفوظات" شائع
ہو چکے ہیں جن کو آپ کی نثر کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ پہلے آپ کے کلام

کا نمونہ درج ذیل ہے :-

معشوق سے نہیں ہو عاشق کی زندگانی
پر عشق ہی سے حاصل ہو عمر جاودانی

پروانہ شمع سے گر واصل ہو جل ہی جائے
ہر جسم عشق اس کا ہو جائے غیر فانی

خود شمع سا ہے روشن اس عشق کی بدولت
عاشق تو عشق ہی سے حاصل ہو زندگانی

گر دل میں عشق پیدا ہو دوستو خدا کا
یہ بھی ہے فضل اس کا بندہ تو شے ہے فانی

آفاق اور انفس کی سیر کر رہا وہ
کیا ذوق ہے وہ حاصل جب ہو نہ زندگانی

گر عشق دل میں پیدا مت وصل کی طرف جا
دنیا و دیں دونوں کا لطف لے اے جانی

معمولی بات تو یہ سائیں غنی نہیں ہے
ہر شخص جس کو سمجھے یہ راز ہے نہانی

موت کی تین ہے قسم یارو
اس سے واقف ہیں لوگ کم یارو

ایک ہے نیند بھی یہ مثل موت
دوم تن سے جو جائے دم یارو

سوم جو موت اختیاری ہو
ہے خوشی جس میں اور نہ غم یارو

موت جب زندگی کے ساتھ ہی ہو
پھر وجود اور گیا عدم یارو

جسم میرا ہے جگ میں اس کی جاں
اور میرا ہے وطن عدم یارو

جو غنی موت سے مرو پہلے
پاؤ گے ہستی عدم یارو

بوجود فانی جو ہو اُس کو فنا فی اللہ کہتے ہیں
بحق باقی جو ہو اُس کو بقا باللہ کہتے ہیں

زنصیب العین ہو جسکا اجل کے ہاتھ مرجائے　　اُسے بھی اہلِ دنیا واصل باللہ کہتے ہیں

یہی زینہ فنا کا ابتدائی ہے جو جانے تو

مسلمان ورنہ یوں ہر وقت بسم اللہ کہتے ہیں

سلام ان پہ جو صالح ہیں نماز پنجگانہ میں

نمازی جہاں دعلی عبداللہ کہتے ہیں

طواف اُس کا غنی کرتے ہزار دل کعبے سے بہتر

دلِ مومن کو اہل اللہ حرم اللہ کہتے ہیں

یہ بحرِ فنا موج میں آرہا ہے　　ہر اک اس میں بہتا ہوا جا رہا ہے

قرار اس سرا میں نہیں ہے کسی کو　　کوئی آرہا ہے کوئی جا رہا ہے

کہیں کس کو مظلوم اور کس کو ظالم　　کہ اک دوسرے کو یہاں کھا رہا ہے

یہ ہے شامت بخش اعمال انساں　　کہ قہر خدا خلق پر چھا رہا ہے

زمیں پر ہے بھونچال یا زلزلہ اب　　فلک نار آفات برسا رہا ہے

تہ آب سیلاب سے کھیتیاں ہیں　　کہ خورشید جوں برف پگھلا جا رہا ہے

کہ جھوٹ اور فریب آج کل مصلحت ہو　　جو سچا ہے خون جگر کھا رہا ہے

ہے بازار گرم آج لہو و لعب کا　　جسے دیکھو اینٹھا ہوا جا رہا ہے

نہ آنکھوں میں شرم اور نہ دل میں ایماں　　ہر اک دین مذہب سے کترا رہا ہے

خدا ہی کرے فضل بندوں پہ اپنے

غنی تو سمجھ کس کو سمجھا رہا ہے

آگاہ اپنی ہستی سے سرشار نہیں ہے　　دنیا سے باخبر ہے خود کی خبر نہیں ہے

مشغول سیر میں ہے ہر اک بشر جہاں کے　　جان کے عجیب چیزوں پہ کچھ نظر نہیں آ

ہر ایک غیر شے کے ہستی کا ہے یہ شاید　　اپنی گواہی اس کے مد نظر نہیں ہے

خود کیا ہوں اور کتنے اشیا سے ہیں مرکب　　دنیا میں کیا ہے جس کا مجھ میں اثر نہیں ہے

صورت میں مثل قطرہ معنی میں شکل دریا　　بہتر خدا سے خالی کوئی بھی سر نہیں ہے

گر جیتے جی نہ پایا پس مرگ پا کے کیا　　گر کچھ ادھر نہیں ہے تو کچھ ادھر نہیں ہے

گر علم خود شناسی سائیں غنی ہو حاصل

پھر مرگ و زیست کا کچھ خوف و خطر نہیں ہے

اللہ سے یہ بندہ بھی خوشنود نہ ہو جب　　تو چیز ہے کیا تجھ سے تو راضی ہی یہ کب ہو

مطلب کے سوا کوئی نہ پوچھے ہے کسی کو　　سید ہو کوئی پیر ہو یا عالی نسب ہو

حاضر ہوں خدا کے لئے ایسے ہیں بہت کم　　موجود ہو ہر کوئی جہاں اکل و شرب ہو

ہوں جس کی تمنا میں فرشتے بھی ترساں　　انساں کو میسر ہو وہ کامل جو طلب ہو

جب تک نہ مسبب کی ہو جانب نظر کرم کچھ　　مقصد کے بر آنے کا کوئی بھی سبب ہو

انساں نے ہی خالق دو وصف ہوں جس　　قابو میں رہے اس کے گو خواہش یا غضب

جز عشق خدا سائیں غنی گوشت ہے بے جاں

خواہ پیر زمانہ ہو یا کوئی عالی نسب ہو

زندہ رہنا ہے گر تو مرنا سیکھ　　نیست ہستی سے ہی گزرنا سیکھ

نیست ہونے سے نیست ہم پہلے　　خاک میں مل کے خود ابھرنا سیکھ

جس سے مولا کو کر سکے راضی　　ہو سکے ایسے کام کرنا سیکھ

جو گرا داں سے پاش پاش ہوا　　بام ہستی سے کو اترنا سیکھ

روح بھی خاک ہو نہ جسم کے ساتھ ہو نڈر سب سے حق سے ڈرنا سیکھ
زندگیٔ ابد جو ملتی ہو ایسا سودا کسی سے کرنا سیکھ

یہ ہے بگڑا ہوا جہاں اے غنی
گر بنا چاہیے تو سنورنا سیکھ

اپنے وصال سے چند دن پہلے یہ اشعار موزوں فرمائے تھے:-

کفر و اسلام کا جھگڑا ہے میرے دم کے ساتھ
اور اللہ کو دیکھو تو ہے عالم کے ساتھ

کفر و اسلام کی ہستی ہے مری ہستی سے
ختم ہو جائیں گے جھگڑے جو ہیں بس دم کے ساتھ

جامِ دل تیرا ہے حق ہیں کہ وہ ہے عرشِ خدا
خلق میں جام جو تھا وہ تو گیا جم کے ساتھ

گو گنہگار غنی ہے، مگر انشاء اللہ
خلد میں جائے گا یہ سرورِ عالم کے ساتھ

آپ کے نثر کا نمونہ ملفوظات سے درج ذیل ہے:-

"سمجھنا چاہیئے کہ جب تک انسان بیداری سے نیند کی حالت میں نہیں پہنچتا ہے خواب نظر نہیں آتا۔ اسی طرح جب تک طالب خدا اس دنیا کی تمام چیز دل سے ندر نہیں اُٹھا لیتا ہے اس کو چھوڑ کر خیال کو ایک طرف نہیں کر لیتا ہے تب تک خود کی حقیقت سے آشنا ہو سکتا نہیں ہو سکتا۔

انسان کو خدائے عزوجل نے اپنے نور سے پیدا کیا اور فرشتوں کو انسان کے نور سے۔ خدائے عزوجل ہر شئے میں سما سکتا ہے..... علم اور سمجھ انسان کی موروثی دولت ہے جس کا حاصل کرنا ضروری بلکہ فرض ہے..... خدا پاک جیسا انسان میں ظاہر ہوا ایسا کسی اور چیز میں نہیں، اس لیے انسان کو اپنی معرفت سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے.....
جاننا چاہیئے راہِ عشق کے چار سفر عارفانِ الٰہی نے مقرر کیے ہیں، ایک خلق سے حق کی طرف اور ایک حق سے حق کی طرف اور ایک قدم سے حدوث کی طرف، ایک حدوث سے حدوث کی طرف، اور ایک قدم سے قدم کی طرف۔

---

(۳۶) حضرت شاہ غلام رسول رح

۱۳۰۶ھ - ۱۳۹۱ھ
۱۹۷۱ء

شمس الفقراء حضرت مولانا الحاج حافظ قاری شاہ محمد غلام رسول قادری
کی پیدائش کراچی میں ۱۳۰۶ھ میں ہوئی۔ آپ کے والد ماجد حافظ قاری شاہ
علم الدین قادری (المتوفی ۱۳۲۵ھ) مسجد قصابان کے امام و خطیب تھے
آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد کے زیر نگرانی ان ہی کے قائم کردہ مدرسہ
العلمیہ قادریہ متصل مسجد قصابان صدر کراچی میں حاصل کی۔ اسی مدرسے
میں آپ نے حفظِ قرآن کے علاوہ علم تجوید کی تکمیل بھی فرمائی۔ آپ کا رجحان
اوائل ہی سے فقر و درویشی کی طرف تھا۔ چنانچہ اپنے ماموں اور خسر
عارف باللہ حضرت صوفی سائیں عبدالغنی صاحب سے روحانی تربیت
حاصل کرنے کے بعد ان ہی کے دستِ حق پرست پر بیعت بھی کی۔ اور
کچھ عرصے ان کے ساتھ رہ کر عبادت و ریاضت کرتے رہے بالآخر تصوف
اور روحانیت میں بلند مقام حاصل کیا۔

آپ ایک شعلہ بیان خطیب بھی تھے، اور اپنی ساری صلاحیتیں
تبلیغ دین اور رشد و ہدایت میں صرف کیں۔ منازلِ طریقت کی تکمیل اور
اکتسابِ علم و فقر کے سلسلے میں آپ نے ہندوستان کے علاوہ مختلف بلادِ

اسلامیہ کا سفر کیا، اور اس عہد کے مشہور علماء کرام و صوفیائے عظام
اولیاء و اقطاب سے بہرہ ور ہوئے۔ ہند کے مشاہیر میں حضرت فاضل
بریلوی رح اور بیرونِ ہند کے علماء اور صوفیاء میں حضرت شاہ عبدالحق محدث الہ آبادی
مہاجر مکی، حضرت مولانا شاہ عبداللطیف قادری مدنی سے اکتسابِ فیض
کیا۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں کچھ عرصے قیام کے بعد آپ بغداد شریف
تشریف لے گئے وہاں آپ نے کئی خطبات دیئے جس کے باعث عوام اور
خواص میں بہت مقبول ہوئے۔ حضرت سید شرف الدین احمد کلید بردار
آستانہ حضرت غوث اعظم سے آپ کے دوستانہ مراسم قائم ہوگئے۔

حضرت شاہ غلام رسول کا تقویٰ اس درجہ کمال پر تھا کہ آپ نے
کوئی نماز بغیر تازہ وضو کے نہیں پڑھی آپ کا سارا وقت رشد و ہدایت میں
صرف ہوتا تھا۔ آپ کی مجلس میں دنیا یا دنیا والوں کا ذکر نہیں ہوتا آپ اس سے
پرہیز فرماتے تھے۔

آپ عربی فارسی اور اردو پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ اردو اور فارسی
کے قادر الکلام شاعر تھے۔ غلام تخلص فرماتے تھے، آپ نظم زیادہ لکھتے تھے
نثر کبھی کبھی اپنے مریدوں کی ہدایت کے لیے لکھتے تھے۔ آپ کی مندرجہ ذیل
تصانیف کی نشاندہی آپ کے خاندان والوں نے کی ہے ان میں زیادہ تر
غیر مطبوعہ ہیں :-

مثنوی قادری (فارسی)، مثنوی فانوسِ عشق، ارمغانِ قادری،
گلدستہ غوثیہ، فیضانِ غوث اعظم، فیضانِ معینی، گل یازدہ صد برگ، انفعالِ کرمی

اجالاِ محمدی، تحفہ رجبی شریف۔ تحفہ عید الضحیٰ، بہارِ بے خزاں۔ تحفہ زیارت و ہدیہ ملاقات، نذرِ حسینی، چمنستانِ حسینی، مجموعہ فسانۂ قوم، حقیقت صراطِ مستقیم۔ کلام کلیاتِ قادری المعروف بہ چمنستانِ قادری۔

آپ کا وصال ۱۹ جمادی الاول ۱۳۹۱ھ مطابق ۱۳ جولائی ۱۹۷۱ء کو بروز منگل بوقت ۸½ بجے شب ہوا۔ آپ کے جانشین آپ کے فرزند ارجمند صاحبزادہ حضرت محمد علم الدین قادری ہوئے۔ اس سلسلۂ غنیہ قادریہ میں ان پانچ اصولوں پر بہت زور دیا جاتا رہا ہے۔ حضرت شاہ غلام رسولؒ نے ان اصول پر عمل پیرا ہو کر بہت بلند مقام حاصل کیا۔ یہ پانچ اصول (۱) ذکرِ دوام، (۲) ذوقِ سجود، (۳) شوقِ درود، (۴) آئینِ وجود، اور (۵) نورِ شہود ہیں۔

ذکرِ دوام میں ذکر نفی اثبات لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ خفی و جلی اور سری و جہری صدقِ دلی و بہ یقین سے کیا جاتا ہے۔

ذوقِ سجود سے مراد نماز کا ذوق پنج وقتہ فرائض نماز کی پابندی اور ہر قسم کی نوافل سنت کی ادائیگی ہے۔ اسی میں صلوٰۃ غوثیہ بھی شامل ہے، علاوہ ازیں خلوت میں بھی جب دعا مانگی جائے تو سر بہ سجود ہو کر گریہ و زاری و عاجزی و انکسار کے ساتھ دعا کرنا ہے اور اس امر کا خیال رکھنا ہے کہ بندے کے لیے دو حجابات ایسے ہیں جن سے راہِ سلوک الی اللہ میں قربِ خداوندی سے ایک قسم کی دوری اور خود پسندی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ معصیت کے حجاب کے علاوہ زہد و عبادت اور پارسائی کے احساس کا حجاب ہے۔

ذوقِ سجود میں اس باریک بات کا بہت زیادہ خیال رکھنا ہے۔

شوقِ درود، سے مراد درود و سلام اور ذکرِ حبیب کا پیارا شغل ہے۔

آئینِ وجود، سے مراد دنیاوی معیشت کے لحاظ سے زکوٰۃ و صدقات خیرات اور سخاوت کے اوصاف سے اپنے لیے دعا لینے کا سامان مہیا کرنا ہے، یعنی ؎

خیر اور خیرات کو ہرگز نہ چھوڑ　　خیر ہے ساری عبادت کا نچوڑ

نورِ شہود سے مراد یہ ہے کہ جب رابطۂ شیخ صدق ارادت سے قائم ہو جاتا ہے تو مرید کو جہاں کہیں بھی وہ رہے اویسیہ طریق پر فیض پہنچتا رہتا ہے۔ حاصلِ مقصد نورِ شہود کا یہ ہے کہ برزخ شیخ کی تجلیات مرید کو ہر جگہ دیدۂ دل سے نظر آئیں اور وہ اپنے شیخ کو اپنی ذہنی اور باطنی، ذوقی و وجدانی نظرِ بصیرت سے اپنے ساتھ بامر اللہ، باذن اللہ، بمدد اللہ، بحکم اللہ، بعون اللہ، بفضل اللہ، بلطف اللہ حاضر و ناظر پائے۔

حضرت شاہ محمد غلام رسولؒ اردو و فارسی کے پرگو شاعر تھے۔ حمد و نعت اور منقبت کے علاوہ آپ عارفانہ کلام بھی موزوں فرماتے تھے۔ کلام کا نمونہ درجِ ذیل ہے:-

"حمدِ باری"

اے خدا آپ ربُّ البریات ہیں　　آپ کے لطف بے حد و غایات ہیں

آپ ہیں وحدہٗ لاشریک لہٗ　　اے خدا آپ وحدانی الذات ہیں

سب سرا پا نیاز آپ ہی کے لیے　　آپ ہی قبلۂ التحیات ہیں

آپ معبود ہیں آپ مسجود ہیں — آپ ہی کے لیے سب عبادات ہیں
شمس ہو یا قمر یا نجوم فلک — آپ کے نور کے سب ذرات ہیں
آپ ہی نور انفس آفاق ہیں — آپ علام غیب و شہودات ہیں
آپ ہی کنت کنزاً کا اعلان ہیں — آپ ہی گنج رمز و رموزات ہیں
لا الٰہ میں ہے نفی ہر ماسوا — آپ ہی حرف الا میں اثبات ہیں
جس طرف دیکھیے آپ ہی آپ ہیں — آپ ہی معدنِ جملہ برکات ہیں
آپ ہی کے لیے سب ہے حمد و ثنا — آپ الحمدللہ بالذات ہیں
حامد و حمد و محمود سب آپ ہیں — آپ ہی روح معنی و آیات ہیں
ماعبدنا حق عبادتک — جس نے سمجھا بلند اس کے درجات ہیں
ماعرفناک حق معرفتک — اس کے قائل نبی البریات ہیں
اولاً آخراً ظاہراً باطناً — آپ ہی اصل کل مظہریات ہیں

اس غلام فقیر و دل افگار کے
آپ ہی غافر کل خطیات ہیں

"در منقبت غوث اعظم"

یہ دل محبوب سبحانی کے صدقے — محی الدین جیلانی کے صدقے
جناب پیر پیراں میر میراں — زہے دلیوں کے سلطانی کے صدقے
ہوئے غوثوں میں غوث الاعظم کل — نشانِ اعظم الشانی کے صدقے
جو پیدا ہوتے ہی عاشق ہوئے ہیں — یہ دل معشوق یزدانی کے صدقے
مریدی لاتخف فرماں ہوا ہے — ہم اس لطفِ فراوانی کے صدقے

ہوئے شیخ ملائک انس و الجن — دل ایسے شیخ ربانی کے صدقے
مریدوں کی مدد اب بھی ہیں کرتے — ہم ہوں اس فیض روحانی کے صدقے

غلام قادری کا وردِ جاں ہے
رسول اللہ کے جانی کے صدقے

"دعائے رحمت"

الٰہی تو رحمت کا اظہار کر دے — نگاہِ کرم ہم پہ اک بار کر دے
تری اک نگاہِ کرم ہی ہے ایسی — کہ بیڑا گنہگار کا پار کر دے
بری عادتوں سے بچا لے ہمیں تو — نکو سیرت و نیک کردار کر دے
نہ غافل تری یاد سے ہم ہوں یارب — ہمیں خواب غفلت سے بیدار کر دے
الانسان سری انا سرہٗ کا — الٰہی تو جویائے اسرار کر دے
طفیلِ جناب شفیع دو عالم — ہمیں اپنی بخشش کا حق دار کر دے

غلام درِ "قادری" کو الٰہی
فدائے رہ غوث الابرار کر دے

حضرت منگھو پیر شاہ کی شان میں ایک منقبت ملاحظہ ہو:-

حضرتِ سلطان منگھو پیر شاہ — عاشق رحمان منگھو پیر شاہ
پُر فضا ہے نور درگہ آپ کی — ہے عظیم الشان منگھو پیر شاہ
زائروں کا رات دن ہے یاں ہجوم — جاری ہے فیضان منگھو پیر شاہ
ہے کراچی کی قدیمی یادگار — درگہ ذی شان منگھو پیر شاہ
یہ مگرمچھوں کا لشکر بھی تو ہے — آپ کی برہان منگھو پیر شاہ

بچپنے سے ہم ہیں زائر آپ کے — اے ولی ذی شان منگھو پیر شاہ
ہیں مرے باپ بھی حاضر ہوئے — اس جگہ سلطان منگھو پیر شاہ
آپ کے راہِ طریقت کے رفیق — والی سہوان منگھو پیر شاہ
ہے قلندریہ کا رکان اس کا نشان — مظہرِ اعیان منگھو پیر شاہ
منقبت لکھنے کا مجھ کو مژدہ — ہے ہوا فرمان منگھو پیر شاہ
ایسی نوعیت میں لکھنا منقبت — اندریں دوران منگھو پیر شاہ
یہ تھا در پردہ اشارہ آپ کا — میرا کیا امکان منگھو پیر شاہ
سب یہ حق ہے ہر ولی اللہ میں — ہے مرا وجدان منگھو پیر شاہ
اولیاء اللہ ہیں جتنے ہیں سب — مظہرِ سبحان منگھو پیر شاہ

اس غلامِ قادری کو بخش دو
نعمتِ عرفان منگھو پیر شاہ[1]

نمونۂ نثر کے لیے "ارشادات" سے کچھ اقتباس درج ذیل ہے:-

"[2]علم شریعت ظاہری علم ہے جس کی پابندی کے لیے ہر بنی آدم مکلف ہے اس لیے وہ سب پر اللہ حجت ہے۔ مگر علم طریقت جو عمل سے تعلق رکھتا ہے حصول پر مکلف نہیں مگر پورا فائدہ اور اعلیٰ نفع اسی سے حاصل ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں علم باطن یا علم سلوک و طریقت سے منکر زیادہ تر وہی ہیں جو ترکِ تقلید کی بلا میں مبتلا ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ترکِ تقلید کے جس قدر برے نتائج ہیں ان میں سے

ایک یہ بھی ہے کہ فیوض باطنیہ کا اس کے ساتھ اجتماع نہیں ہو سکتا۔ یعنی عبادات و مجاہدات جو روحانی لطائف پیدا کر سکتے ہیں تارکِ تقلید ہرگز ان سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔ یا یوں کہیے کوئی غیر مقلد صوفی نہیں ہو سکتا۔ وجہ یہ کہ اول تو یہ لوگ عموماً سیر و سلوک کے قائل ہی نہیں۔ اور جب اس کے قائل نہ ہوں تو اس سے مستفیض کیونکر ہو سکتے ہیں۔"

———— ✻ ————

[1] تحفہ علمی از محمد علم الدین علمی ص ۱۳۲، ۱۳۵ - [2] ارشادات شاہ غلام رسول قادری، از سید عبدالرسول مطبوعہ باب الاسلام پریس کراچی ص ۲۷

ہمارے لیے مشعل نورِ ہدایت ہیں۔ وارثانِ نبیؐ اسی طبقۂ صوفیائے کرام اولیائے عظام میں پیدا ہوئے۔ ان بزرگوں میں روحانی قوت اخلاق، جذب و کشش اس لیے موجود تھی کہ وہ فنا فی الذات کے مرتبے پر فائز ہو چکے تھے۔ ہمہ اوست، ہمہ از دوست بلکہ اوست از دوست کا مشاہدہ کرتے تھے، جو کچھ کہتے تھے زبانِ حق سے کہتے تھے، وہ دیکھتے تھے دیدۂ حق سے دیکھتے تھے۔ ان کا قلب صافی شہود گنجینہ تھا۔ ان بزرگوں کے اخلاق تخلقوا باخلاق اللہ کی تفسیر، اُن کی ذات قدسیہ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کی حقیقی تصویر تھی۔ وہ فنا فی الرسول، فنا فی اللہ تھے۔ جب فنا فی اللہ تھے سب کچھ تھے۔ اولیاء عظام نے دلوں کی اقلیم پر حکمرانی فرمائی۔ دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ان کی مقبولیت اسی طرح باقی ہی نہیں دونی رات چوگنی بڑھتی گئی ان کے نعمتوں سے نعمتیں تقسیم ہوتی ہیں۔ ان کی روحانی قوتیں درماندگوں کی دستگیریاں کرتی ہیں۔ صفحۂ کائنات پر ان کا نام ان کے تذکیے دوامِ ثبات کا نقش ثبت کر دیا۔ ان کی روحانی طاقتیں کارفرما ہیں ...... اے میرے پیشوا تم پہ لاکھوں سلام اے میرے رہنما تم پہ لاکھوں سلام۔[1]

[1] جذباتِ عقیدت مطبوعہ ڈیسنٹ پریس کراچی ص۲

(۳۷) حضرت سائیں عبدالرشیدؒ

(سنہ ۱۹۰۷ء۔ سنہ ۱۹۷۲ء)

حضرت سائیں عبدالرشید کے والد ماجد حضرت سائیں عبدالغنیؒ بڑے ولی اللہ اور روشن ضمیر بزرگ تھے۔ آپ کا خاندان سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد کراچی منتقل ہوا تھا اور ایک سو سال سے یہاں رشد و ہدایت اور تبلیغ اسلام کی خدمات انجام دے رہا ہے۔ حضرت سائیں عبدالرشید کی پیدائش سنہ ۱۹۰۷ء میں کراچی میں ہوئی۔ پرائمری اسکول کی ابتدائی تعلیم کے بعد دینی تعلیم آپ نے اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ تجارت کو ذریعۂ معاش بنایا۔ مختلف دوکانیں کھولیں لیکن دوکانداری نہ چلی۔ تو پھر بچوں کو پڑھانے لگے اور اس سے گزر اوقات کر لیتے تھے۔ اپنے والد سائیں عبدالغنیؒ کے وصال کے بعد ان کی جگہ سجادہ نشین ہوئے۔ سنہ ۱۹۷۲ء میں آپ کا وصال ہوا

آپ اردو نثر اور نظم دونوں لکھنے پر قادر تھے۔ رسالہ مرغوب موحدان میں آپ کا ایک مضمون حضرت صوفی سائیں عبدالغنیؒ کے سلسلے میں شائع ہوا ہے اس سے آپ کے اندازِ تحریر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس جگہ ایک کتابچے سے جو حضرت صوفی سائیں عبدالغنی کے عرس کے موقع پر شائع کیا گیا تھا۔ آپ کی تحریر کا اقتباس بطور نمونہ درج ذیل ہے:۔

"اولیائے امتِ محمدیہ علیہ الف الف تحیہ سلام کے حالاتِ طیبات

آپ کی شاعری نعت و منقبت اور سلام کے لیے وقف تھی، آپ زیادہ تر مذہبی رنگ کی شاعری کرتے تھے۔ آپ کے کلام کا نمونہ درج ذیل ہے:-

نعت رسول

جمالِ روئے انور گر نظر آجائے تو بہتر ہے
مدینے میں اگر آقا مجھے بلوائے بہتر ہے

نبی کی اک نظر عفو کرم ہو جائے بہتر ہے
مری بخشش کا کچھ ساماں نکل جائے بہتر ہے

رسول اللہ کے اس روضۂ انور کی جالی پر
جبین نیاز اس عاصی کی گر جھک جائے بہتر ہے

کرم سے اس شہ بطحیٰ کے دل میرا منور ہو
اور اس میں بہر حق علم لدنی کھل جائے بہتر ہے

میں پلکوں سے در اقدس کو جھاڑ دوں یہ حسرت ہے
زہے قسمت غلامی کا شرف مل جائے بہتر ہے

یہ عاصی پر خطا کو خوفِ محشر کا نہ ہوگا کچھ
وہاں سرکار کی مجھ پر نظر ہو جائے بہتر ہے

رشید قادری رکھا ہوا ہے کیا یہاں پر اب
مدینے میں پہنچ کر تو اگر مر جائے بہتر ہے

"سلام خیر الانام"

رسولِ پاک ہمارے سلام کہتے ہیں — یہ نام لیوا تمہارے سلام کرتے ہیں

ادب سے ہاتھ کو باندھے ہوئے سر جھکائے ہوئے — خدا کے نور ہمارے سلام کرتے ہیں

یہ حور اور ملک اور شمس و قمر — اور آسماں کے تارے سلام کرتے ہیں

محمد عربی سید الرسل آقا — غلام اب یہ تمہارے سلام کرتے ہیں

رشید ابن غنیؒ سائیں یہ فقیر حقیر
اور حلقے والے یہ سارے سلام کرتے ہیں

(۳۸) صاحبزادہ محمد علم الدین علمی قادری

(سنہ ۱۹۲۳ء پیدائش)

حضرت محمد علم الدین علمی قادری کے والد ماجد حضرت حافظ شاہ محمد غلام رسول بڑے روشن ضمیر صوفیا میں سے تھے۔ آپ کی پیدائش سنہ ۱۹۲۳ء میں اپنے آبائی مکان کراچی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ یکایک انگریزی تعلیم سے برگشتہ خاطر ہو کر دینی علوم کی طرف راغب ہوئے اور اپنے والد ماجد حضرت شاہ محمد غلام رسول سجادہ نشین خانقاہ سائیں عبد الغنی رح سے علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل کر کے ان ہی کے دست حق پرست پر بیعت بھی کی، اور پھر ان کے وصال کے بعد ان کی جگہ سجادہ نشین ہو کر رشد و ہدایت اور علوم دینی کے درس و تدریس میں مشغول ہیں۔ حضرت شاہ غلام رسول رح نے سولجر بازار متصل قادری مسجد میں مدرسہ علمیہ قادریہ کے نام سے ایک مذہبی تعلیم گاہ قائم کی تھی، آپ اسی کو چلا رہے ہیں۔ آپ کے مریدوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن اپنے ذاتی اخراجات کے لیے آپ اپنے مریدوں سے نذرانہ نہیں قبول کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ مریدوں کی داد و دہش سے پیروں کو اپنے اخراجات پورے نہیں کرنے چاہئیں۔

شاہ علم الدین علمی قادری اُردو کے ایک اچھے نثر نگار اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ شاعری میں وہ زیادہ تر نعت و منقبت لکھتے ہیں۔ مثنوی مولانا روم سے ان کو عشق ہے۔ اُن کے بہت سے اشعار کا اُنھوں نے اُردو میں منظوم ترجمہ "ارشادات رومی معہ تعلیمات رومی" کے عنوان سے کیا ہے جو ابھی تک غیر مطبوعہ مسودے کی شکل میں ان کے پاس محفوظ ہے۔ اُردو نثر میں آپ کی نئی کتابیں موجود ہیں جن میں قدم النبی، جہاد اصغر، بہشتی جہیز، اور نو مسلمہ، غیر مطبوعہ ہیں اور قادری نامہ، تحفۂ علمی اور نغمۂ نور مطبوعہ ہیں۔

نو مسلمہ عبد الحلیم شرر کے ناول ملک العزیز ورجنا کے طرز پر لکھا ہوا ایک ناول ہے۔ جو ۱۳۶۵ھ میں لکھا گیا تھا۔ جہاد اصغر، جہاد کے موضوع پر مختصر سا رسالہ ہے جس میں جہاد کی فضیلت اور اہمیت بتائی گئی ہے۔

تحفۂ علمی میں مختصر سوانح و حالات خلفائے راشدین و شہدائے بدر، شہدائے کربلا، معہ مشائخین سلاسل عالیہ قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ اور مدحیات و مناقب ائمہ عشرہ و امام اعظم، و منقبت حضرت داتا گنج بخش رضوان اللہ علیہم اجمعین درج ہیں۔[۱]

نغمۂ نور میں کراچی شہر کے لیاری قبرستان کے بزرگان کرام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ بیس صفحات پر مشتمل مختصر سا رسالہ ہے۔ نثر اور نظم کا نمونہ درج ذیل ہے:

سلسلۂ عالیہ علیہ سہروردیہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رح سے منسوب ہے۔ آپ حضرت شیخ ضیاء الدین ابو نجیب سہروردی رح

۱؎ تحفۂ علمی از صاحبزادہ محمد علم الدین علمی قادری" مطبوعہ جاوید پریس ۱۳۸۲ھ صفحہ ۲۱

کے چھوٹے بھائی تھے۔ کہتے ہیں کہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ بچپن ہی سے حضور غوث پاکؓ کی صحبت میں رہے اور حضور غوث پاکؓ بھی نہایت مہربانی فرمایا کرتے تھے۔ چونکہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کا وجود بھی سرکار غوث الاعظمؓ کی ایک زبردست کرامت اور آپ ہی کی دعا کا نتیجہ تھا اس لیئے آپ سرکار غوث الابرار رضی اللہ عنہ کے بہت ہی معتقد اور مداح تھے۔ عوارف المعارف آپ ہی کی مشہور تصنیف ہے جس کا حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ باقاعدہ درس دیا کرتے تھے۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے خلفائے عظام میں سے حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ، شیخ بہاؤ الدین ذکریا ملتانی، حضرت شیخ مصلح الدین سعدیؒ شیرازی مشہور و متعارف ہیں۔ شیخ بہاؤ الدین ذکریا ملتانی کے وجود سے سلسلۂ سہروردیہ کی ہند و سندھ میں بہت اشاعت ہوئی۔"

حضرت علمی نظمیں زیادہ لکھتے ہیں اور اس میں بھی نعت منقبت بزرگانِ دین اور سلام ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ نمونے کے طور پر کچھ نظمیں درج ذیل ہیں:-

سلام و منقبت حضرت مخدوم علی ہجویری داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ

ہوں تم پہ سلام آقا مخدوم علی ہجویریؒ — گنج بخش ہو تم داتا مخدوم علی ہجویری

اسلامی تصوف کے استاد و مبلغ ہو — دیں تم سے ہے حسن افزا مخدوم علی ہجویری

ہر سالک حق کی تم بھر دیتے ہو جھولی کو — سائل جو کوئی آیا مخدوم علی ہجویری

یہ حلقۂ ذکر اللہ ہم قادریوں کا بھی — طالب ہے دعاؤں کا مخدوم علی ہجویری

اس قادری علمی اور سب اس کے محبوں پر
ہو لطف و کرام داتا مخدوم علی ہجویری

"سلام غوث الانام"

غوث اعظم کی سیرت پہ لاکھوں سلام — قطبِ عالم کی شہرت پہ لاکھوں سلام

جوہرِ مصطفےٰ گوہرِ مرتضےٰ — ان کے نورِ سیادت پہ لاکھوں سلام

انس و جن و ملک کے بھی وہ پیر ہیں — ان کی شانِ امامت پہ لاکھوں سلام

رہزنوں کو کیا اک نظر سے ولی — ان کی شانِ کرامت پہ لاکھوں سلام

بیڑہ برسوں کا ڈوبا نکالا وہیں — ان کے زورِ ولایت پہ لاکھوں سلام

ان کے سارے مریدوں پہ ہو لطفِ حق — ان کی پیاری جماعت پہ لاکھوں سلام

جس نے جو مانگا منہ مانگی اس کو دیا — ان کے جود و سخاوت پہ لاکھوں سلام

قادری علمی ہو قادریوں کے بھی
پیرِ رشد و ہدایت پہ لاکھوں سلام

حصۂ دوم

صوفی نثر نگار

حصۂ دوم

صوفی نثر نگار

(۱) حضرت سید رشد اللہ شاہ رح

(المتوفی سنہ ۱۳۴۰ھ)

حضرت پیر سید رشد اللہ شاہ کا خاندان حجازی ہے آپ کے جدِّ اعلیٰ اسلامی فتوحات کے ابتدائی دور میں ہی حجاز سے بغداد ہوتے ہوئے سندھ پہنچے تھے اس خانوادہ میں پیر محمد مکّی بہت مشہور ہوئے ہیں. علم و فضل، زہد و تقویٰ، رشد و ہدایت اور خدمتِ خلق اس خاندان کا طرۂ امتیاز رہا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ سندھ کے اندر ہر دور میں اس خاندان کو مخدومیت اور عزّ و جاہ حاصل رہا ہے

حضرت پیر سید رشد اللہ شاہ کے والد ماجد سید رشید الدین شاہ بڑے درویش صفت اور عالم فاضل بزرگ تھے. آپ کے دادا پیر سید محمد لیٰسین شاہ اور پیر صبغۃ اللہ شاہ صاحبِ قلم کے ساتھ صاحبِ سیف بھی تھے۔ پیر صبغۃ اللہ شاہ اول حضرت سید احمد شہید کی تحریکِ احیاء دین اور جہاد سے بہت زیادہ متاثر تھے اور ایک طرح ان کے ہم نوا اور رفیق بھی تھے. انھوں نے سجادہ نشین ہونے کے بعد اپنے مریدوں کو ایسے طریقے پر منظم کرنا شروع کیا کہ

حضرت پیر سید رشد اللہ شاہ تیسرے پیر جھنڈو ہیں، جیسا کہ ان کے مندرجۂ ذیل نسب نامے[1] سے بھی ظاہر ہے:-

پیر سید بدیع الدین شاہ، بن پیر سید فضل اللہ عرف احسان اللہ شاہ، بن پیر سید رشد اللہ شاہ، بن پیر سید رشید الدین، بن پیر سید محمد یٰسین، بن پیر سید محمد راشد، بن پیر سید محمد بقا شہید، بن پیر سید محمد امام شاہ، بن شاہ محمد فتح، بن سید شاہ شاکر اللہ، بن شاہ عثمان، بن شاہ کشن، بن شاہ سنجر، بن شاہ بولن، بن شاہ حسین، بن سید شاہ میر علی، بن سید شاہ ناصر الدین، بن سید شاہ عباس، بن سید شاہ فضل اللہ، بن سید شاہ شہاب الدین، بن سید شاہ بہاؤ الدین، بن سید شاہ محمود، بن سید شاہ محمد، بن سید شاہ حسین، بن سید شاہ ججکن، بن سید شاہ علی مکی عربی، بن سید شاہ عباس، بن سید شاہ زید، بن سید شاہ اسد اللہ، بن سید شاہ عمر، بن سید شاہ حمزہ، بن سید شاہ ہارون، بن سید شاہ عبد اللہ، بن سید شاہ حسین، بن سیدنا امام علی رضا، بن سیدنا امام موسیٰ کاظم، بن سیدنا امام جعفر صادق، بن سیدنا امام محمد باقر، بن سیدنا امام زین العابدین، بن سیدنا امام حسین شہید کربلا، بن حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہم۔

---

[1] یہ نسب نامہ ہمیں پیر سید بدیع الدین شاہ کی مہربانی سے ملا ہے جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

ضرورت پڑنے پر وہ سب کے سب خرقہ و تسبیح کے ساتھ تلوار بھی پکڑ سکیں اور تحفظ اسلام اور اپنے وطن کی آزادی کے لیے درویشوں سے جانباز مجاہدین کی شکل اختیار کر لینے میں انھیں دیر نہیں لگے۔ یہی "حُر" تحریک کی ابتدا تھی۔ "حُر" تحریک کے بانی پیر صبغۃ اللہ شاہ کے ملفوظات سے پتہ چلتا ہے کہ جب سکھ حکومت سندھ کی جانب پھیلنے لگی تو پیر صاحب نے جہاد کا پختہ ارادہ کر لیا۔ اور حضرت سید احمد شہید قدس کی حمایت و تعاون کے لئے تیار ہو گئے۔

پیر صبغۃ اللہ شاہ کے مریدوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ لوگ ان کے علم و فضل، خلوص نیت اور تقدس کی وجہ سے ان پر جان نثار کرتے تھے۔ سید حمید الدین نے ایک جگہ لکھا ہے[1]:-

"در تمام مملکت سندھ ہم چو او شیخے و مرشدے در زعم مردم آں ملک نیست۔ قریب سہ لک مریدانش از قوم بلوچ ہستند۔"

پیر سید رشد اللہ کے پردادا پیر سید محمد راشد تک جھنڈا اور پگڑی یعنی جہاد اور تبلیغ دین کا کام ایک ہی شخص کے سپرد رہا لیکن ان کے وصال کے بعد جب پیر صبغۃ اللہ شاہ اول سجادہ نشین ہوئے تو انھوں نے جھنڈا اپنے بھائی پیر محمد یٰسین کے حوالے کیا اور خود پگڑی یعنی تبلیغ دین کی ذمہ داری سنبھالی۔ اس طرح سندھ میں دو اہم مراکز روحانی و عسکری پیر پگارو اور پیر جھنڈو کے نام سے عالم وجود میں آئے۔ اور پیر محمد یٰسین شاہ (صاحب لواء الاول) پہلے پیر جھنڈو اور پیر صبغۃ اللہ شاہ اول پہلے پیر پگارو ہوئے۔

---

[1] ملاحظہ ہو "سید احمد شہید" مصنفہ غلام رسول مہر ص ۲۰۳۔

حضرت سید رشد اللہ شاہ کی پیدائش بہ مقام پیر جھنڈو نزد سعید آباد حیدرآباد سندھ ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد آپ نے شیخ حسین بن محسن یمانی سے جو اس دور کے مشہور عالم تھے اکتسابِ علوم و فنون کیا اور ان سے سند حاصل کی۔

پیر سید رشد اللہ شاہ کی زندگی بڑی مجاہدانہ بسر ہوئی، آپ سندھ میں تحریک خلافت کے روحِ رواں تھے، انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ میں بہت نمایاں کردار ادا کرتے رہے، اور اس کی پاداش میں قیدِ فرنگ کے مصائب بھی جھیلے۔ آپ سے پہلے آپ کے والد پیر رشید الدین شاہ بھی تحریک آزادی کے لیے سرتن کی بازی لگا چکے تھے۔ انھوں نے جہاد کے لیئے اپنے مریدوں سے بیعت بھی لی تھی اسی لیے انھیں صاحب البیعت بھی کہا جاتا ہے۔

پیر سید رشد اللہ شاہ ایک مردِ مجاہد اور درویش صفت روحانی پیشوا تھے۔ اُن کی زندگی کا اولین مقصد تبلیغ دین اور اشاعتِ اسلام تھا اور اس کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیئے بھی تیار رہتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان پیران پگاڑو اور پیران جھنڈو کے حکم پر عوام بھی مر مٹنے کو تیار رہتے تھے، بقول مصنف سید احمد شہید:-

ان پیروں[1] کے ساتھ عوام کی عقیدت کے حالات بڑے حیرت انگیز ہیں کہا جاتا ہے کہ جب وہ باہر نکلتے تھے تو عقیدت مند

[1] سید احمد شہید (از مولانا غلام رسول مہر، ص ۳۰۹

اپنی ساری دنیوی متاع ان کے قدموں پر لا کر ڈال دیتے تھے اگر یہ ریل میں سفر کرتے تھے تو ہر جگہ کے پیرو ریلوے لائن پر سارے اندوختے لے کر جمع ہو جاتے تھے۔"

پیر سید رشد اللہ کے سات لڑکے اور نو لڑکیاں تھیں، آپ کا وصال ۱۳۴۱ھ مطابق ۲۳ اپریل ۱۹۲۳ء میں ہوا۔ آپ کے وصال کے بعد سید فضل اللہ شاہ عرف احسان اللہ شاہ پیر جھنڈو ہوئے۔ پیر سید رشد اللہ شاہ کی کافی تصانیف ملتی ہیں، ان میں زیادہ تر سندھی زبان میں ہیں لیکن دو کتابیں آپ کی اُردو میں بھی ملتی ہیں۔ ان میں سے ایک عین المتانۃ" فی تحقیق تکرار الجماعۃ" قلمی ہے جو پیر صاحب جھنڈو کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے، اور راقم الحروف کو بھی اس سے استفادے کا موقع ملا ہے۔ اس کا کاتب عبدالعلیم ہے، اس کی کتابت ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ کو ختم ہوئی ہے۔ دوسرا ایک مطبوعہ رسالہ "الفارقۃ بین اہل اللہ و بین المبارقۃ" ہے۔ جو پیروں اور مریدوں کی ہدایت کے لئے اردو اور سندھی دونوں میں لکھا گیا ہے۔

(۱) عین المتانۃ فی تحقیق تکرار الجماعۃ:- یہ ایک مذہبی تصنیف ہے۔ اس میں مصنف نے ثابت کیا ہے کہ مسجد میں ایک ہی وقت کی نماز کے لیے اگر دوسری مرتبہ جماعت سے لوگ نماز پڑھیں تو وہ نماز مکروہ نہیں ہوتی۔ قرآنی آیات اور احادیث نبوی کی روشنی میں اس مسئلے پر بڑی عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کی وجہ تصنیف سے

متعلق ابتدا میں لکھتے ہیں :-

"ان ایام یعنی سنہ تیرہ سو ہجری میں "الشمس اللامعۃ فی کراہۃ الجماعۃ الثانیۃ" نظر سے گذرا کہ جس میں بلا وجہ وجیہ اور بغیر کسی دلیل صحیح کے جماعت ثانیہ کو مکروہ ٹھہرایا ہے اور جماعت اول کے بعد خواہ جس قدر نمازی جمع ہو جاویں سب کی نسبت الگ الگ پڑھنے کا حکم لگا دیا۔ عوام بیچارے دھوکے میں پڑ گئے بلکہ بعض تو شدت تعصب سے حد سے متجاوز ہو گئے۔ لہذا مناسب معلوم ہوا کہ ناواقفوں کی تنبیہ اور تفہیم کے لیئے اس مسئلے کے متعلق کچھ تحقیق لکھی جاوے تاکہ ان بیچاروں کو اصلی مسئلے سے واقفیت ہو جاوے اسی وجہ سے اردو میں لکھنا بہتر معلوم ہوا۔"[1]

نمونہ تحریر کے طور پر اس قلمی نسخے سے کچھ اقتباسات درج ذیل ہیں :-

"کراہت[2] تحریم تکرار جماعت مع اذان و اقامت پر اتفاق مسلم نہیں اور مطلق کراہت سے تحریم کے ہونے کا حال تو پہلے ہی معلوم ہو چکا۔ پس امام یوسف کی روایت جس کو شارح نے صحیح قرار دیا یہ معنی کرنا کہ نفی صرف تحریمیہ کی ہے نہ مطلقہ

۱؎ عین المتانۃ فی تحقیق تکرار الجماعت قلمی ص۱

۲؎ عین المتانۃ فی تحقیق "تکرار الجماعت"، قلمی، ص۵۹

کی صحیح نہیں اور یہ جو کہا کہ مطلق کی نفی سے لازم آوے گا کہ تکرار مع اذان اور اقامت بھی بہ ترک محراب مکروہ نہ ٹھہرے حالانکہ یہ ظاہر البطلان ہے کیونکہ یہ صورت بہ اتفاق مکروہ تحریمی ہے لہذا تحریمیہ ہی کی نفی مراد رکھنا چاہیئے تو جواب اس کا یہ ہے کہ اس صورت کا مکروہ ہونا تو حسب روایت اولیٰ کے ہے اور یہ روایت دوسری ہے۔ پس اس روایت کے مضمون کو تو پہلی روایت کے مخالف ہونا چاہیئے و الا دو روایت ٹھہرانا باطل ٹھہرے گا۔ پس اس میں مطلق کراہت کی نفی سے جو مقتضی ظاہر لفظ کا ہے کوئی خرابی لازم نہیں آتی۔ اور جس نے اس کو صحیح اور راجح قرار دیا اس کے نزدیک ظاہر روایت صحیح و مقبول تھی۔"

"دوسرے میں کہتا ہوں کہ صرف کراہت تحریم کی نفی صورت میں بھی یہی وجہ بطلان کی موجود ہے" اس واسطے کہ حسب اقرار آپ کے جب تکرار بہ اذان و اقامت کی صورت میں گو بہ ترک محراب ہو کراہت تحریم بہ اتفاق موجود ہے، پس اس صورت میں نفی کراہت تحریم کی بھی ظاہر البطلان ہے۔ فما ہو جوابکم فہو جوابنا۔"

۲- الفارقۃ بین اہل اللہ و بین المارقۃ :- یہ مختصر سا رسالہ مطبوعہ ہے۔ اس کو ۱۳۳۱ھ میں حکیم محمد حنیف ہاشمی کراچی نے اپنے

زیرِ اہتمام شائع کیا تھا مگر اب وہ کم یاب ہے۔ درگاہ شریف سعید آباد کے کتب
خانے میں اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے جو راقم الحروف کی نظر سے بھی گزرا ہے حضرت
پیر رشد اللہ شاہ نے اس کتابچے کو پیر و مرید دونوں کی ہدایت کے لئے اُردو
اور سندھی میں لکھا ہے ہر صفحہ پر نصف میں سندھی اور نصف میں اُردو ہے۔ یہ
رسالہ کل تیرہ صفحات پر مشتمل ہے۔ نمونہ تحریر کے طور پر اس کے اُردو حصہ کا کچھ
اقتباس درج ذیل ہے:-

"کامل ولی کے بیٹے کو بھی اس کے باپ کی طرح ولایت اور مرشدی
کے لائق جاننا جہلا کی سمجھ اور صاف گمراہی میں ڈالنے والی فاش
غلطی ہے۔ کامل ولی کا بیٹا ہونے کی وجہ سے آدمی کامل ولی
نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ولایت بھی نبوت کی طرح ورثہ کے طور پر نہیں
ملتی۔۔۔۔۔۔ جس کے اپنے باپ کی طرح اچھے عمل نہ ہوں گے
وہ ولی نہیں بلکہ اس کا باپ بھی اس سے بیزار سمجھنا چاہیئے دیکھو
تو اس بات کے سمجھانے کے لیے خدائے تعالیٰ نے سورۂ ہود
میں حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ بیان کیا تاکہ ہم لوگ جو
سادات اور پیروں اور مشائخ کی اولاد سے ہیں وہ اس سے
عبرت حاصل کریں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے
کنعان کے حق میں طوفان میں غرق ہونے سے بچنے کے لئے دعا
کی اور فرمایا رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَھْلِیْ" یعنی اے میرے
پروردگار میرا بیٹا میری اہل و عیال میں سے ہے اس کو بچا،

اللہ تعالیٰ نے ان کے بیٹے کے حق میں دعا قبول تو نہ کی بلکہ عتاب
کے طور پر فرمایا: یا نوحُ اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِكَ اِنَّہٗ عَمَلٌ
غَیْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّیْ
اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِیْنَ ۝ یعنی اے نوح تیرا
بیٹا تیری اہل و عیال میں سے نہیں ہے کیونکہ تیرا بیٹا اچھے کام
کرنے والا نہیں پس تو مجھ سے ایسے کام کا سوال نہ کر جس کی
تجھے خبر نہیں، اور میں تجھے نصیحت کرتا ہوں تاکہ تو جاہلوں میں
سے نہ ہو۔ حضرت نوح نے یہ بے پروائی کا جواب سن کر اپنے بیٹے
کی نجات کا سوال تو چھوڑ دیا بلکہ اُلٹا اپنے قصور کی بھی معافی
مانگی۔" [1]

---

[1] پیر اور مرید کے لیئے ہدایت کرنے والا) الفارقۃ بین اھل اللہ
وبین المارقۃ - ص ۶ و ۷

(۲) حضرت پیر سید فضل اللہ شاہ عرف سید احسان شاہ

(۱۳۱۳ھ - ۱۳۵۷ھ)

حضرت پیر سید فضل اللہ شاہ چوتھے پیر جھنڈو تھے۔ اپنے والد ماجد حضرت پیر سید رشد اللہ شاہ کے وصال کے بعد درگاہ شریف سعید آباد میں سجادہ نشین ہوئے۔ آپ کی پیدائش ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۱۳ھ کو ہوئی تھی۔ آپ نے مکمل تعلیم مدرسہ دارالرشاد میں حاصل کی جہاں اس وقت مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا محمد صاحب سندھی، جیسے "استاد الکل" اور مولانا احمد علی صاحب لاہوری جیسے بحر العلوم موجود تھے۔ آپ نے ان اساتذہ سے اکتساب علوم و فنون کیا حافظ قرآن ہونے کے علاوہ آپ کو علم حدیث، تفسیر قرآن اور اسمائے رجال کے فن پر بڑا عبور حاصل تھا۔

آپ کا وصال چوالیس[۴۴] سال کی عمر میں ۱۳۵۷ھ میں بہ مقام درگاہ شریف نزد سعید آباد ضلع حیدر آباد (سندھ) میں ہوا۔ آپ علم و فضل کے ساتھ ساتھ درویشی میں بھی اپنا مقام رکھتے تھے۔ فقر و توکل آپ کو بہت پسند تھا۔ تبلیغ دین، عبادت و ریاضت اور رشد و ہدایت آپ کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ دنیا کی بے ثباتی کا ان کے دل پر گہرا اثر تھا۔ ایک بار ایک ویران مقام سے گزر رہے تھے جہاں کچھ بکریاں اور گائیں چر رہی تھیں، اس مقام کو دیکھ کر تھوڑی دیر آپ

خاموش کھڑے رہے، پھر فرمایا: "اگر مجھے یقین ہوتا کہ میرے ورثا میری وصیت کو مان لیں گے تو میں انھیں وصیت کرتا کہ مجھے اسی مقام پر دفن کرنا، اور اس طرح دفن کرنا کہ قبر کا نشان باقی نہ رہے۔"[۱]

پیر سید فضل اللہ شاہ کو عربی، فارسی، سندھی اور اردو چاروں زبانوں پر دسترس حاصل تھا۔ سندھی کے علاوہ اردو زبان میں بھی آپ نے کچھ تصانیف چھوڑی ہیں۔ آپ کی دو اردو تصانیف جو مخطوطہ کی شکل میں کتب خانہ درگاہ شریف میں محفوظ ہیں۔ حضرت پیر بدیع الدین شاہ کی مہربانی سے راقم الحروف کو دیکھنے کو ملی ہیں۔ ان دو تصانیف کے نام (۱) البلاغ الحقیق بالتحقیق العمیق۔ اور (۲) المقالۃ المحبوبہ فی الدعا بعد الصلوٰۃ المکتوبۃ ہیں۔

(۱) البلاغ الحقیق بالتحقیق العمیق:- یہ ۳۵ صفحات پر مشتمل ایک رسالہ ہے جس کو سید فضل اللہ شاہ نے ۱۳۴۹ھ میں خانپور کے ایک مذہبی اجتماع میں پڑھنے کے لیئے لکھا تھا۔ آپ نے اس جلسہ کی صدارت بھی فرمائی تھی اور اس طرح اس مقالے کو خطبۂ صدارت بھی کہا جا سکتا ہے۔ نمونۂ تحریر درج ذیل ہے:-

"قرآن شریف میں روحانی و جسمانی اصلاح کے لیے تمام مصالح موجود

---

[۱] یہ روایت آپ کے صاحبزادے حضرت بدیع الدین شاہ نے عند التذکرہ مجھ سے بیان فرمائی جو اس سفر میں اپنے والد کے ہمراہ تھے۔

[۲] البلاغ الحقیق بالتحقیق العمیق، قلمی ص ۳

ہیں۔ اور جمیع امراض روحانی و جسمانی کے لئے عجیب و غریب نسخے موجود ہیں۔ اور ہمارے دینی و دنیوی منافع حاصل کرنے کے لیئے بھی قرآن کریم میں عمدہ عمدہ طرائق بیان کئے گئے ہیں۔ بہ طور نمونہ یہاں ۲ دو نسخے ایک مرض روحانی کے لیئے مثلاً قساوت قلب، دوسرا مرض جسمانی کے لیئے مثلاً تنگی رزق ذکر کیے جاتے ہیں۔ روحانی امراض کے دفع اور اُن سے صحت پانے کے لیئے دوا ذکر اللہ عز و جل کا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ "الا بذکر اللہ تطمئن القلوب" یعنی خبردار تمہارے قلوب تندرست اللہ کے ذکر سے ہوتے ہیں۔"

(۲) "المقالۃ المحبوبہ فی الدعاء بعد الصلوٰۃ المکتوبۃ"

پچاس صفحات پر مشتمل حضرت سید فضل اللہ شاہ کی یہ دوسری مذہبی تصنیف ہے اس کتابچے کا موضوع دعاء بعد نماز ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نماز چونکہ خود ایک دعا ہے اس لیے نماز کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگنا درست نہیں پیر سید فضل اللہ شاہ نے اس مختصر سے کتابچے میں اس کی تردید کی ہے اور بعض آیات قرآنی اور احادیثِ نبوی کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ نماز کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگنی چاہیئے کیونکہ یہ وقت دعاؤں کی قبولیت کا ہوتا ہے اور اس سے نماز خراب نہیں ہوتی۔ یہ رسالہ جیسا کہ اس کے سنہ تصنیف سے ظاہر ہے ۱۳۴۷ھ میں لکھا گیا ہے، موضوع اور زبان کے لحاظ سے یہ قابلِ قدر کتاب ہے۔ پیر سید فضل اللہ شاہ کی اُردو نثر سادہ، رواں اور عالمانہ ہوتی ہے۔ ان کی دونوں تصانیف

کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان پران کو خاصی قدرت حاصل ہے لیکن زبان کے لحاظ سے ان کے ارتقائے ذہنی کی صحیح نشاندہی نہیں کی جاسکتی پہلی اور دوسری کتاب کی زبان میں یکسانیت ہے، اس سے پہلے اور بعد کی کوئی تصنیف پیش نظر نہیں۔ ان کی اُردو نثر میں عربی فارسی کے الفاظ بہ کثرت مستعمل ہیں لیکن ثقیل نہیں۔ نمونہ تحریر کے طور پر اس کتاب سے اقتباس درج ذیل ہے:۔

"دعا[1] بعد صلواۃ مکتوبہ باجماعت ہاتھ اُٹھا کر مانگنے کے جواز میں کوئی شبہ نہیں، بلکہ مسنون ہے...... کیونکہ دعا طلب کرنا ہے حاجت کا تضرع سے ان کے قاضی سے ذالقاضی المطلق ھو اللہ الواحد الصمد لم یلد و لم یولد تو اب بندہ کو جب اپنی حاجت کے قضا کے لیے طلب کرنا ہے تو بلا خدشہ و خطرہ...... اپنے قاضی مطلق و شافی برحق میں یقین بالاجابۃ کر کے طلب کرے تو مرتبۂ اجابت پاوے لا سیما ادبار الصلوٰۃ المکتوبات فانہ وقت الاجابہ کما یاتی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اگرچہ دعا بعد صلواۃ مکتوبہ بغیر رفع الیدین کے مسنونیت بھی ثابت ہے لیکن ہاتھ اُٹھانا داعی کا اولیٰ و ارفع ہے۔ کیونکہ داعی کے لیے مستحسن یہ ہے کہ بعض آداب کی دعا کے لیے مراعۃ کرے۔"

---

[1] المقالۃ المحبوبہ فی الدعاء بعد الصلواۃ المکتوبۃ ۔ قلمی ۔ ص ۲-۳

پس دعا کے آداب کثرت سے وارد ہیں لیکن جو مسئلے مبحوث فیہا
سے مناسبت رکھتے ہیں وہ صرف تین ہیں: الاول رفع الیدین فی الدعا
کیونکہ ہاتھ اُٹھانا دعا میں تضرع و تواضع ہے۔ والثانی الدعا مع
الجماعۃ کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ دعا با جماعت مانگنا تفرد سے
زیادہ مستحسن اجابت دا ثابت ہے۔ الثالث تقدیم عمل صالح لیکون
ذالک وسیلۃ الاجابۃ کیونکہ یہ بات مسلم اور مرئی ہے کہ جب خادم
کوئی ایسا عمل کرے جو عند مالک محبوب ہو اور اس کے بعد کوئی سوال
کرے تو اس وقت میں سوال کی اجابت بلا شک ہو جاتی ہے۔"

(۳) حضرت پیر سید محب اللہ شاہ

(پیدائش ۱۹۲۱ء)

حضرت پیر سید محب اللہ شاہ پانچویں پیر جھنڈو ہیں جو اپنے والد
ماجد پیر سید فضل اللہ شاہ عرف سید احسان اللہ شاہ کے وصال کے بعد
سجادہ نشین ہوئے۔ آپ کی پیدائش ۲ر اکتوبر ۱۹۲۱ء کو بمقام پیر جھنڈو
نزد سعید آباد ہوئی۔ عربی۔ فارسی۔ اُردو کی تعلیم آپ نے مدرسہ دار الرشاد
میں حاصل کی اور وہیں سے عربی اور فارسی زبان و ادب میں فاضل کا
امتحان پاس کیا اور حافظِ قرآن بھی ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں سندھ یونیورسٹی
سے بی۔اے اور ۱۹۶۳ء میں Comparative study of Religion
میں ایم۔اے کی ڈگری لی۔

حضرت پیر سید محب اللہ شاہ کو تعلیمی امور سے بڑی دلچسپی ہے
اسی بنا پر انھوں نے ۱۹۶۱ء میں اپنے گاؤں میں اورنٹیل کالج قائم کیا
یہ ایک اقامتی ادارہ ہے اور یہاں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کے سارے
اخراجات پیر صاحب خود اپنی طرف سے ادا کرتے ہیں۔ یہاں کے طلبا حیدرآباد
بورڈ سے پرائیویٹ امتحان دے کر ادیب عالم اور ادیب فاضل کی سند
حاصل کرتے ہیں۔ اس کالج میں عربی۔ فارسی۔ سندھی کے ساتھ اُردو کی بھی

بہت اچھی تعلیم دی جاتی ہے۔ پیر صاحب خود اس کالج کے پرنسپل ہیں اور اپنے علم وفضل سے ملک وقوم کی بہت بہتر خدمت انجام دے رہے ہیں۔

پیر سید محب اللہ شاہ کی ۲ دو شادیاں ہوئی ہیں، ایک سے صرف ایک لڑکا ہے اور دوسری سے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔

پیر صاحب کی زندگی بڑی درویشانہ اور عالمانہ گزرتی ہے تبلیغ دین اور درس تدریس آپ کا محبوب مشغلہ ہے، اپنا زیادہ وقت پڑھنے پڑھانے اور عبادت گزاری میں صرف کرتے ہیں، ان کی زندگی حد درجہ سادہ ہے، وہ سادی غذا، سادا لباس اور بے تکلف زندگی کے عادی ہیں۔ نمود ونمایش اور تصنع سے ان کو سخت نفرت ہے۔ دوستوں اور مریدوں سے منکسرانہ ملتے ہیں۔ گفتگو ٹھہر ٹھہر کر بہت دھیمی آواز میں کرتے ہیں۔ احادیث نبوی اور تفسیر القرآن پر بڑی اچھی نظر رکھتے ہیں، سندھی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھنے کی یکساں قدرت حاصل ہے۔ اردو میں ان کا ایک پرمغز خطبہ ۱۹۶۷ء میں اشرف پریس لاہور سے شائع ہوا ہے۔ یہ غالباً کسی مذہبی اجتماع پر خطبۂ صدارت کے طور پر پڑھا گیا تھا۔ اس خطبے میں ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اہل حدیث اسلامی عقائد سے روگرداں نہیں ہیں وہ قرآن واحادیث کے پیرو ہیں انھیں محض بدنام کرنے کے لیے "وہابی" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اور یہ سازش انگریزوں کی تھی کہ اس طرح مسلمانوں کو گروہوں میں تقسیم کرکے کمزور کردیا جائے۔ لکھتے ہیں :-

"اہل[1] حدیث کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیرو ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ سفید جھوٹ نہیں ہوسکتا کہ جماعت اہل حدیث کو شیخ کا مقلد قرار دیا جائے۔

...... وہ (انگریز) جب برصغیر میں اپنے پاؤں جمانے لگے تو ان کے سامنے دو قومیں تھیں، ہندو اور مسلمان —— ہندوؤں سے ان کو چنداں خطرہ نہیں تھا، البتہ مسلمانوں سے وہ کافی ڈر رہے تھے، اور مسلمانوں میں بھی جماعت موحدین یا اہل حدیث ان کی نظر میں خار تھی، کیونکہ یہی ایک جماعت ہے جو ان کے ناپاک عزائم کا خاتمہ کرسکتی تھی، اور حق کی کما حقہ، مدافعت کرسکتی تھی۔ انگریز بھی چاہتے تھے کہ ان کو کسی طرح بدنام کیا جائے۔ وہ جانتے تھے کہ متحدہ ہندوستان کے لوگوں میں بزرگوں کی طرف زیادہ اعتقاد پایا جاتا ہے اگر کسی طرح جماعت اہل حدیث کو بزرگوں سے بھری ہوئی اور رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو نہ ماننے والی ثابت کردیا جائے تو لامحالہ عوام ان سے بدظن ہو جائیں گے اور ان کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ اسی ناپاک مقصد کے لیئے انھوں نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ لفظ "وہابی" عوام میں پھیلانا شروع کردیا"

---

[1] خطبۂ صدارت مطبوعہ صـ ۸ — ۹

پیر سید محب اللہ شاہ کا ایک مقالہ رسالہ "الاعتصام" لاہور کے شمارہ ۳۵ بابت ۲۹ مارچ ۱۹۶۸ء میں "پردہ اور اسلام" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ پیر صاحب عورتوں کے لیے پردہ اور چہرہ پر نقاب رکھنے کے بہت زبردست حامی ہیں۔ ان کے نزدیک عورتوں کے چہرے پر نقاب نہ ہونے سے بہت سی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس مقالے میں انھوں نے اپنے خیالات کی تائید میں قرآن اور احادیث سے دلائل بھی پیش کیے ہیں۔ نمونۂ تحریر کے طور پر اس مقالے سے کچھ اقتباس درج ذیل ہے :—

"عنوان[1] بالا پر پہلے ہی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اس وقت اس پر قلم اٹھانے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ ہمارے معاشرے میں ایک مغرب زدہ طبقہ ایسا پیدا ہو چکا ہے کہ جس نے یہی ٹھان لی ہے کہ وہ جس طرح بھی ممکن ہو اپنے مغربی ماسٹروں کو ضرور ہی راضی کرے گا۔۔۔۔۔

اس حقیقت سے بھی کسی عقل سلیم رکھنے والے انسان کو انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ جنس کثیف (مرد) کی جملہ فتنہ سامانیاں پیدا کرنے والے اہم عناصر بھی جنس لطیف کے چہرے کے خد و خال میں ہیں۔ اس صورت میں اگر عورت کو جسم کے اس حصہ کو کھلا رکھنے کی رخصت مل جائے جو

---

[1] "الاعتصام" لاہور، شمارہ ۳۵ بابت ۲۹ مارچ ۱۹۶۸ء ص ۴

اصل طوفان و ہیجان کا باعث ہے تو پردہ کے حکم سے کیا حاصل۔"

پیر محب اللہ شاہ کی اردو نثر خاصی صاف، رواں اور عام فہم ہوتی ہے۔ یہ ایک بیدار مغز اور حالات حاضرہ سے باخبر انسان ہیں۔ یہ جو کچھ لکھتے ہیں اس کے لئے استدلال پیش کرتے ہیں اور اس سے ان کی تحریر ...یح ہو جاتی ہے۔ پردہ کے اوپر جو ان کا مضمون ہے اس میں خاصی دلکشی ...جاتی ہے۔ چونکہ اردو میں یہ کم لکھتے ہیں اس لئے ان کی نثر میں ...رتقائے ذہنی کی کھوج نہیں لگا سکتے۔ لیکن ان کی اردو نثر کا ایک ...ص رنگ ہے اس سے بھی ہم انکار نہیں کر سکتے۔

---

(۴) ابی محمد سید بدیع الدین شاہ

(پیدائش ۱۹۲۴ء)

ابی محمد سید بدیع الدین شاہ موجودہ پیر جھنڈو کے چھوٹے بھائی اور حضرت پیر سید فضل اللہ شاہ عرف سید احسان اللہ شاہؒ کے فرزند ارجمند ہیں۔ آپ کی پیدائش ۱۰ر جولائی ۱۹۲۴ء بہ مقام پیر جھنڈو نزد سعید آباد (حیدرآباد سندھ) ہوئی۔ آپ کی تعلیم مدرسہ دار الرشاد اور مدرسہ غزنویہ امرتسر میں ہوئی۔ آپ کو مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کے علاوہ مولانا عبد الحق صاحب بہاولپوری مہاجر مکہ سے بھی تلمذ حاصل ہے۔ آپ کی ذہانت اور فطانت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ نے صرف چار ماہ کے مختصر عرصے میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ تفسیر قرآن اور احادیث نبوی پر آپ کو پوری بصیرت حاصل ہے۔ اور یہ آپ کے پسندیدہ مضامین ہیں۔ درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور مطالعۂ کتب میں اپنا سارا وقت گزارتے ہیں اور اسی کو مقصدِ حیات بنا لیا ہے۔ علمِ دین کے مستند عالم کی حیثیت سے اپنے معاصرین میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ آپ کے مریدان اور دوسرے لوگ نزدیک اور دور سے مذہبی مسائل پوچھ کر اپنے شکوک و شبہات دور کرتے رہتے ہیں۔ آپ درویش اور عالم باعمل کی سی زندگی گزارتے ہیں۔ طبیعت میں بڑی انکساری، عاجزی اور خدا ترسی پائی جاتی ہے۔ ملنے والوں

سے محبت اور خلوص سے ملتے ہیں اور خاص کر علمی مذاق رکھنے والوں اور اسکالرز کی ہر مشکل کو دور کرنے کے لیے ہمہ دم تیار رہتے ہیں

آپ کی خانگی زندگی بڑی پرسکون ہے۔ آپ کی شادی خاندان ہی کی ایک خاتون سے ہوئی ہے جن سے اللہ تعالےٰ نے چار لڑکے اور تین لڑکیاں عطا فرمائے ہیں۔ سندھی کے علاوہ اردو میں بھی پوری دستگاہ رکھتے ہیں اور اکثر اس میں تالیف و تصنیف فرماتے رہتے ہیں۔ آپ کے تین رسالے اردو زبان میں مطبوعہ ہیں اور کئی کتابیں غیر مطبوعہ بھی مسودہ کی شکل میں موجود ہیں آپ کی جملہ تصانیف مذہبی اور فقہی مسائل سے متعلق ہیں جن کو پڑھنے سے علوم دینی میں آپ کی بصیرت، وسعتِ مطالعہ اور صاف ذہنی کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کی مطبوعہ کتابوں کے نام یہ ہیں :-

(۱) زیادۃ الخشوع،

(۲) الدلیل التام علیٰ ان سنۃ المصلی الوضع کلما قام،

(۳) الا علام

یہ تینوں رسالے سید بدیع الدین شاہ صاحب نے ایک فقہی مسئلہ کی وضاحت کے سلسلے میں لکھے ہیں۔ فقہ کا ایک مسئلہ "ارسال الیدین" کا ہے۔ اس میں بعض لوگوں کے درمیان کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک جماعت رکوع کے بعد کھڑے ہونے میں ہاتھ باندھنے پر عمل کرتی ہے اور دوسری جماعت رکوع کے بعد قیام میں ہاتھ نہیں باندھتی۔ مولانا حافظ عبد اللہ صاحب روپڑی مرحوم نے ایک رسالہ "ارسال الیدین" لکھ کر رکوع کے بعد قیام میں ہاتھ نہ باندھے

"تلمیذ علامہ ابو اسمٰعیل یوسف حسین صاحب ہزاروی کا رسالہ
اتمام الخشوع بہ وضع الیمین علی الشمال بعد
الرکوع" ملا۔ اور پھر ۱۹۴۷ء میں سفر حج نصیب ہوا۔ وہاں
بہت سے علماء کو عامل پایا:۔

من "تنہا دریں خانہ مستم — جنید و شبلی و عطار شد مست

گذشتہ سال عوام کے سمجھنے کے لیے ہم نے اس مسئلے کے متعلق سندھی
زبان میں ایک مختصر رسالہ لکھا جو کہ شائع ہو کر کافی مقبول ہوا۔ غیر
سندھی حضرات کے اصرار پر اس سال ایک اور رسالہ اُردو میں
بنام "زیادۃ الخشوع بوضع الیدین فی القیام بعد الرکوع" لکھا جو
کہ شائع ہو کر لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکا ہے۔ ابھی ابھی ہم کو
ہمارے محترم مولانا حافظ عبد اللہ صاحب روپڑی کا رسالہ ملا
جس میں حافظ صاحب موصوف نے علامہ ہزاروی کے رسالہ
اتمام الخشوع کی تردید کے ساتھ ہم کو یاد فرمایا ہے اور جابجا
ہمارے سندھی رسالے کے حوالے دیے ہیں۔ کئی دوستوں نے
مجبور کیا کہ اس کا جواب لکھا جائے اگرچہ غور سے دیکھا جائے
تو ہمارے اُردو رسالے میں ان کی سب باتوں کا جواب بعض
کا اجمالاً اور بعض کا تفصیلاً پہلے موجود ہے۔ مگر بموجب "کل جدید
لذیذ" اس رسالہ کا بھی جواب لکھا جاتا ہے اور اس رسالے کا
نام "الدلیل التام علی ان سنۃ المصلی الوضع کلما قام" رکھا ہے

کو درست ثابت کیا تھا۔ سید بدیع الدین شاہ صاحب رکوع کے بعد قیام میں
ہاتھ باندھنے کے قائل اور عامل ہیں اور اس سلسلے میں انھوں نے پہلے "زیادۃ
الخشوع" لکھا تھا۔ مولانا عبد اللہ صاحب مرحوم اپنے رسالے "ارسال الیدین"
میں زیادۃ الخشوع کو زیر بحث لائے تھے۔ اس کے جواب میں حضرت بدیع
الدین شاہ صاحب نے "الدلیل التام علی ان سنۃ المصلی الوضع
کلما قام" لکھ کر مولانا عبد اللہ صاحب کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔
اپنے رسالے "الدلیل التام"[1] کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:۔

"رکوع کے بعد کھڑے ہونے کی حالت میں ہاتھ باندھنے پر ہم نے
اپنے علاقے میں سب سے پہلے علامہ محدث ابو محمد عبد الحق صاحب
بہاول پوری مہاجر مکی کو عمل کرتے دیکھا اور تحقیق سے ہمیں بھی معلوم
ہوا کہ احادیث اور آثار میں صرف کھڑے ہونے کی حالت میں وضع
(ہاتھ باندھنے) کا ذکر ہے۔ ...... چنانچہ جب یقین ہوا کہ یہ تخصیص
بلا مخصص ہے تو ہم نے استخارہ کرنے کے بعد اس پر عمل شروع
کیا۔ یہ ۱۹۴۵ء کا واقعہ ہے، اور عربی زبان میں ایک مبسوط رسالہ
بھی لکھا ہے جس وجہ سے سندھ کے کئی علماء اس پر عامل ہوگئے
اور ۱۹۴۶ء میں دہلی جانا ہوا وہاں برادر محترم مولوی عبید الرحمن
صاحب نو مسلم سے شیخ الکل میاں صاحب سید نذیر حسین کے

---

[1] الدلیل التام علی ان سنۃ المصلی الوضع کلما قام ص ۳

کچھ عرصے بعد فروری ۱۹۶۶ء میں حافظ عبداللہ صاحب روپڑی مرحوم نے ہفتہ وار "تنظیم اہلحدیث" میں پھر اس بحث کو چھیڑا اور سید بدیع الدین شاہ صاحب کے رسالے "الدلیل التام"[1] کا جواب "رفع الایہام" فی جواب دلیل التام" کے عنوان سے شائع کیا۔ پھر بدیع الدین شاہ صاحب نے اس کے جواب میں تیسرا رسالہ "الاعلام بہ جواب رفع الایہام و تائید الدلیل التام" کے عنوان سے شائع کیا، اور اس میں اس فقہی مسئلے کو آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی کے حوالے سے مزید واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ تینوں رسالوں کی زبان علمی اور رواں ہے۔ نمونہ تحریر رسالہ "الدلیل التام" سے درج ذیل ہے:۔

"میں نے دراصل یہ کہا ہے اور اب بھی کہتا ہوں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے نماز کے اندر کھڑے ہونے کی حالت میں ہاتھ باندھنا وارد ہے اور رکوع کے بعد بھی کھڑا ہونا ہے، اور جو لوگ "ارسال" کے مدعی ہیں وہ کسی حدیث سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بعد الرکوع ارسال کا ثبوت دیں تو ان کو مبلغ ایک ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔ سو واقعی حافظ صاحب ایسا ثبوت اپنے رسالے میں نہیں دے سکے۔ افسوس یہ ہے کہ نام "ارسال الیدین" رکھا ہے اور کوشش وضع کے

---

[1] الدلیل التام علی ان سنۃ المصلی الوضع کلما قام ص

عدم ثبوت کے لیئے کی ہے۔ حالانکہ ان دونوں میں تباینِ کلّی نہیں جو ایک کا رفع دوسرے کے وقوع کو مستلزم ہو۔ حافظ صاحب پر لازم تھا کہ ارسال کا ثبوت دیتے مگر سارا رسالہ دیکھ کر بے ساختہ یہی منہ سے نکلتا ہے کہ ؎

کوئی بھی کام مسیحا ترا پورا نہ ہوا   نامرادی میں ہوا ہے ترا آنا جانا"

ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ مندرجہ ذیل غیر مطبوعہ کتابوں کے مسودوں سے بھی استفادے کا موقع ملا ہے جن کے بارے میں کچھ حقائق درج ذیل ہیں:۔

(۱) **خالص توحید**: یہ تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ایک اہم تصنیف ہے۔ اس میں مسئلہ وحدت الوجود کے نظریے کو قرآنی آیات اور احادیث کی روشنی میں غلط ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کتاب میں "وسیلہ" کے مسئلہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ سید صاحب کا خیال ہے کہ وسیلہ کوئی چیز نہیں۔ یہ خیال غلط ہے کہ بغیر وسیلہ کے اللہ عام بندوں کی نہیں سنتا۔ وہ بغیر وسیلے کے بھی سب کی دعا قبول کرتا ہے۔ یہ سوال و جواب کی شکل میں لکھا گیا ہے، اور ایک طرح اس کو ہم بدیع الفتاوی کا ہی ایک حصہ قرار دے سکتے ہیں۔ توحید کے سلسلے میں سید صاحب نے مسلسل احادیث نبوی اور آیات قرآنی اس طرح پیش کی ہیں کہ اردو کی عبارت درمیان میں سطر دو سطر سے زیادہ جگہ نہیں پاتی۔

(۲) **تنقید السدید بر رسالہ اجتہاد و تقلید**:۔ یہ کتاب علامہ محمد ادریس کاندھلوی کے رسالہ اجتہاد و تقلید کے جواب میں ۱۹۶۵ء میں لکھی گئی ہے۔

یہ تقریباً ۳۶۵ صفحات پر مشتمل ہے اور ابھی تک بعض وجوہ کی بنا پر طبع نہیں ہو سکی ہے۔ سید صاحب کا خیال ہے کہ تقلید درست نہیں اور جیسا کہ ان کے لکھنے کا انداز ہے اس مسئلے پر بھی انھوں نے احادیث نبوی سے کافی ثبوت اور دلائل فراہم کیے ہیں۔ اسلوب تحریر ملاحظہ ہو[۱]:۔

"جانور اپنے کھینچنے والے کے پیچھے ایسا جاتا ہے کہ اس کو یہ خبر نہیں کہ مجھے گھاس کھلانے کے لیے لے جا رہا ہے یا کسی اور کام کے لیے، یا بیچنے کے لیے، یا ذبح کرنے کے لیے، اسی طرح مقلد کو بھی علم نہیں کہ وہ جس کے پیچھے لگتا ہے وہ حق پر لے جا رہا ہے یا باطل پر کیوں کہ اس کو نہ دلیل معلوم ہے نہ اس کا امام معصوم۔ مولانا روم نے اپنی مثنوی میں خوب کہا ہے:۔

پس مقلد ہست چوں طفل علیل — گرچہ دارد حجت باریک و دلیل
آں مقلد نیز مانند کور است — اندر آں شادی کہ ادراہ بر است"

(۳) نشاط العبد: یہ غیر مطبوعہ رسالہ ۳۷ صفحات پر مشتمل ہے اس میں سید صاحب نے دلیل سے ثابت کیا ہے کہ نماز میں رکوع کے بعد "ربنا ولک الحمد" بہ آواز بلند کہنا چاہیے، نمونہ تحریر ملاحظہ ہو[۲]:۔

"اما بعد ارباب رکوع و عبادت و اصحاب خشوع و ریاضت کی

۱؎ تنقید السدید بر رسالہ اجتہاد و تقلید۔ ص ۱۱

۲؎ نشاط العبد قلمی از حضرت سید بدیع الدین شاہ۔ ص ۱۔۳

خدمت بابرکت میں عرض ہے کہ نماز اللہ تعالیٰ کی خالص حمد کا نمونہ ہے۔ جب بندہ رکوع سے سیدھا ہوتا ہے تو سمع اللہ لمن حمدہ کہتا ہے جس کا مطلب ہے کہ جس بندے نے اپنے رب کی تعریف کی تو وہ اس کی سنتا ہے یعنی قبول فرماتا ہے۔ یہ جملہ جواب کا مقتضی ہے یعنی اس کے عقب میں جوابی طور پر خدا کی حمد کرنا ضروری ہے، کیونکہ اس وقت قبولیت ایزدی منتظر ہوتی ہے اس لیے جواب میں اللّٰھم ربنا لک الحمد یعنی اے اللہ ہمارے پروردگار تیرے لیے حمد ہے کہنا شروع ہوا چونکہ اس ترتیب سے ظاہر ہوا کہ یہ جواب اس جملے کا تابع ہے لہذا جو حکم متبوع کا ہوگا وہی تابع کا ہونا چاہیے۔ یعنی اگر متبوع جہراً ہے تو تابع بھی جہراً۔ اور وہ سرّاً ہے تو یہ بھی سرّاً ہونا چاہیے۔ جیسا کہ آمین قرأۃ کی تابع ہے۔ مگر بایں ہمہ زمانے میں اکثر جگہ پر اس کے خلاف عمل ہو رہا ہے بلکہ دیکھا گیا ہے کہ بعض اہل علم جہراً ربنا ولک الحمد کہنے کو ناپسند کرتے ہیں حتیٰ کہ بعض تو ایسے کہنے والوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اگرچہ علماء سے ایسا ہرگز متوقع نہ تھا مگر کیا کیا جائے نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی۔ اس حالت کے مدنظر اس مختصر رسالہ موسوم نشاط العبد بہ جہر ربنا ولک الحمد میں چند احادیث و آثار جمع کیے جاتے ہیں۔"

(۴) **بدیع الفتاویٰ**: یہ کتاب دراصل ان کے مریدوں کے وقتاً فوقتاً کیے گئے سوالات کے فتویٰ کی شکل میں جوابات ہیں۔ یہ سلسلہ عرصہ سے چل رہا ہے اور آگے چل کر فتاویٰ کی یہ ایک دلچسپ کتاب ہو جائے گی۔ سید صاحب نے اپنے مریدوں کے شکوک و شبہات کو اسلامی عقائد اور سنت رسول ؐ کے مطابق آیاتِ قرآنی اور احادیث نبوی کی روشنی میں دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کی ایک اہم اور عجیب خصوصیت یہ ہے کہ مرید نے جس زبان میں سوال کیا ہے اس کے سوال کو لکھ کر جواب اسی زبان میں دیا گیا ہے۔ اس طرح اس میں عربی، سندھی اور اُردو تینوں زبانوں میں عبارتیں ملتی ہیں۔ اب تک اس کتاب کا حجم تقریباً نو سو صفحات تک پہنچ گیا ہے۔ نمونۂ تحریر کے طور پر ایک مرید کا سوال اور اس کا جواب درج ذیل ہے:-

حضرت سید بدیع الدین شاہ صاحب سے ایک شخص قادر بخش نے دریافت کیا کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی کے موقع پر داماد سے اسٹامپ پر یہ شرط لکھوانا چاہتا ہے کہ اگر نکاح کے بعد داماد نے بریلوی عقیدہ اختیار کیا تو میری لڑکی کو طلاق بائنہ ہو جائے گی۔ اس شرط کے ساتھ نکاح از روئے شرع جائز اور درست ہے یا نہیں؟

اس کے جواب میں حضرت سید شاہ بدیع الدین صاحب نے جو جواب تحریر فرمایا ہے وہ درج ذیل ہے:-

"اس قسم کی شرط جائز ہے[1]۔ اخرجہ البخاری و مسلم عن عقبہ

[1] بدیع الفتاویٰ (مسودہ قلمی) از سید بدیع الدین شاہ ص ٣٠١

ابن عامرؓ قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم احق الشروط ان توفوبہ ما استحللتم بہ الفروج

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نکاح کے وقت شروط جائز ہیں الا ایسی شرط جو کہ شرع کے خلاف ہوں۔ اور یہ شرط تو نہایت ضروری ہے کیونکہ شرکیہ عقیدہ والے کو لڑکی دینا یا شادی کرنا منع ہے........ بالخصوص جب کہ یہ اندیشہ ہو وہ کہیں غلط راہ اختیار نہ کرے تو ایسی صورت میں یہ شرط نہایت لابدی اور اہم ہے۔ اور نیز حدیث بالا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شرط پر پابند رہنا فرض و لازمی ہے۔ بصورت دیگر طلاق واقع ہو جائے گی۔"

حضرت سید بدیع الدین شاہ ایک علمی آدمی ہیں۔ ان کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر بھی ملک و قوم کے بعض اہم سیاسی مسائل پر وہ اپنی رائے وقتاً فوقتاً ظاہر کرتے رہتے ہیں۔

حضرت سید بدیع الدین شاہ کی تصانیف زیادہ تر مذہبی نوعیت کی ہیں اور اس میں ان کی شانِ مناظر کی نظر آتی ہے۔ ان مذہبی تصانیف میں ان کی زبان بہت رواں نہیں بلکہ عربی فارسی کے الفاظ سے بوجھل ہو گئی ہے۔ احادیث اور آیاتِ قرآنی کے بہ کثرت استعمال نے ان میں وقار اور استدلال تو ضرور بڑھا دیا ہے لیکن زبان کی دلکشی میں کمی آ گئی ہے۔ ایک دو مضامین جو سیاسی نوعیت پر اخبارات میں چھپے ہیں ان میں زور، روانی اور دل کشی پائی جاتی ہے۔ مجموعی طور پر

سید صاحب کی تصانیف میں ارتقائے ذہنی کا پتا نہیں چلتا۔ کیوں کہ ان کی ساری تصانیف مذہبی ہیں اور ان کی زبان ایک جیسی ہے لیکن ایک چیز ان کی تمام تحریروں میں ضرور نمایاں ہے اور وہ ہے زبان کو عام فہم بنانے کی کوشش اور اس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔

(۵) پیر علی محمد راشدی

(پیدائش ۱۳۲۴ھ - ۱۹۰۵ء)

جناب پیر علی محمد راشدی سندھ کے ایک معزز زمیندار اور مقدس پیر گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کا خاندان راشدی خاندان کے نام سے معروف ہے۔ آپ کے بزرگوں میں سید علی مکی ۱۱۲۷ء مطابق ۵۳۰ھ میں مکہ معظمہ سے سندھ تشریف لائے تھے۔ آپ کا شجرۂ نسب ٥ اس طرح ہے:۔

پیر علی محمد راشدی[1]، بن پیر حامد شاہ[2]، بن پیر شاہ[3]، بن پیر علی محمد[4] بن پیر صبغۃ اللہ شاہ[5] (بانی تحریک حر) بن پیر سید محمد راشد[6]، بن پیر سید محمد بقا شہید[7]، بن سید محمد امام شاہ[8]، بن شاہ فتح محمد[9] بن سید شاہ شکر اللہ[10]، بن شاہ عثمان[11]، بن شاہ کھٹن[12]، بن شاہ سنجر[13]، بن شاہ بولن[14]، بن شاہ حسین[15] بن سید شاہ میر علی[16]، بن سید شاہ ناصر الدین[17]، بن سید شاہ عباس[18]، بن سید شاہ فضل اللہ[19]، بن سید شاہ شہاب الدین[20]، ابن سید شاہ بہاؤ الدین[21]

---

٥ غلام رسول مہر کتاب سید احمد شہید (مطبوعہ) پہلا اڈیشن محفوظ در کتب خانہ رھبنڈو سعید آباد حیدر آباد۔ ص ۳۸

بن سید شاہ محمود[22]، بن سید شاہ محمد[23]، بن سید شاہ حسین[24]، بن سید شاہ بھکن[25] - بن سید شاہ علی مکی[26]، بن سید شاہ عباس[27]، بن سید شاہ زید[28]، بن سید شاہ اسد اللہ[29]، بن سید شاہ عمر[30]، بن سید شاہ حمزہ[31]، بن سید شاہ ہارون[32]، بن سید شاہ عبداللہ[33]، بن سید شاہ حسین[34]، بن سیدنا امام علی رضا[35]، بن سیدنا امام موسیٰ کاظم[36]، بن سیدنا امام جعفر صادق[37]، بن سیدنا امام محمد باقر[38]، بن سیدنا امام علی اصغر زین العابدین[39]، بن سیدنا امام حسین[40] علیہ السلام، بن سیدنا حضرت علی[41] بن ابی طالب رضؓ"

جناب پیر علی محمد راشدی کی پیدائش ۱۲ جمادی الثانی ۱۳۲۴ھ مطابق ۵ اگست ۱۹۰۵ء کو جمعہ کے دن ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مولوی محمد سومار دکنی اور مولوی محمد صدیق صاحب میرپور خاص سے حاصل کی۔ عربی فارسی اور انگریزی کی تعلیم بھی گھر پر لائق اساتذہ سے حاصل کرتے رہے۔ کسی اسکول یا کالج میں نہیں داخل ہوئے۔ یہ ایک ذہین و فطین انسان ہیں، محض اپنی کتب بینی اور خود پیدا کردہ صلاحیت کے ذریعہ انہوں نے علمی، سیاسی، صحافتی اور ادبی دنیا میں ایک بلند مقام حاصل کر لیا۔

حضرت پیر سید حامد شاہ کے دونوں فرزند، پیر سید علی محمد راشدی، اور پیر حسام الدین راشدی (راشدی برادران) ایک صاحب سلسلہ خاندان کے افراد ہوتے ہوئے بھی طریقت اور سلوک کی طرف مائل نہیں ہوئے۔ قدرت کو ان دونوں سے دو علیحدہ کام لینے تھے۔ ایک تو میدان سیاست و صحافت میں چمکا

تو دوسرا علم و فضل اور تحقیق و تنقید کے میدان میں درخشاں و تاباں ہوا۔
جناب پیر علی محمد راشدی کی سیاسی اور صحافتی زندگی کا آغاز ایک ساتھ غالباً ۱۹۲۶ء سے ہوا جیسا کہ آپ کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔

"میری سیاسی اور صحافتی زندگی کا آغاز ایک ساتھ ہوا۔ ستارہ ہند اور صبح سندھ کے علاوہ سندھ زمیندار، الحزب، الراشد، الامین اور قربانی کا اڈیٹر بھی رہا۔ یہ سب سندھی پرچے تھے۔ مارماڈیوک پکتھال کے ساتھ بمبئی میں کچھ دنوں تک بمبئی کرانیکل میں بھی اخباری کام کا مطالعہ کیا۔ سندھ آبزرور (انگریزی روزنامہ) کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ میں جس زمانے میں اخبار نویس تھا اس دور کی اخبار نویسی بھینس کے آگے بین بجانے کے برابر تھی۔"[1]

۱۹۲۶ء میں شکارپور (سندھ) سے آپ نے سب سے پہلے اخبار الحزب کی ادارت سنبھالی۔ اسی دوران سکھر سے اخبار الامین کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ ۱۹۲۹ء میں سکھر کے اخبار سندھ زمیندار کے اڈیٹر ہوئے ۱۹۳۳ء میں آپ کا تعلق سر شاہ نواز بھٹو کی سیاسی پارٹی سے ہو گیا۔ ۱۹۳۴ء میں سکھر سے اخبار ستارہ ہند نکالا جس کے مینیجنگ ڈائرکٹر اور اڈیٹر سب کچھ

---

[1] پیر علی محمد راشدی (ایک انٹرویو) از خالد مطبوعہ اخبار جہاں مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۶۸ء

خود ہی تھے۔ یہ اخبار ۱۹۳۲ء تک نکلتا رہا۔ اس میں بہترین سندھی ادبی اور سیاسی مضامین شائع ہوتے تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۶ء تک انگریزی زبان میں ہفت روزہ "مسلم وائس" نکالتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد سنہ ۱۹۴۶ء میں آپ نے "سندھ آبزرور" نکالنا شروع کیا جس میں فرقہ وارانہ ذہنیت اور علاقائی عصبیت کی بیخ کنی کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ۱۹۵۲ء میں ہفت روزہ اخبار اسٹیٹسمین انگریزی میں نکالا اور پاکستان نیوز سروس ایسوسی ایشن کے صدر کی حیثیت سے ہندوستان، مصر، لندن اور دیگر ممالک کا دورہ کیا ہانگ کانگ کے قیام کے دوران دنیا بھر کے مختلف اخباروں کے لیے معلوماتی مضامین لکھتے رہے۔

جناب پیر علی محمد راشدی سندھی اور انگریزی کے بہت اچھے صحافی ہیں۔ انھوں نے جتنے اخبارات نکالے وہ سب یا تو سندھی زبان میں تھے یا انگریزی میں۔ لیکن عربی فارسی کے ساتھ اردو کی لیاقت ان کو گھر کی تعلیم اور کتب بینی سے حاصل ہوئی۔ قیام پاکستان کے بعد اردو مضمون نگاری کی طرف مائل ہوئے، پھر میر خلیل الرحمٰن صاحب اڈیٹر "جنگ" کے اصرار پر وہ "مشرق و مغرب" کے عنوان سے مستقلاً لکھنے لگے۔ اور اب وہ اردو کے مشہور اہل قلم اور مقبول مضمون نگار مانے جاتے ہیں۔ "مشرق و مغرب" کے عنوان پر اور "بین الاقوامی حالات" کے سلسلے میں ان کے مضامین جو روزنامہ "جنگ" اور "اخبار جہاں" میں شائع ہوتے رہتے ہیں، وہ ادبیت اور دلکشی کے لحاظ سے بہت خوب ہوتے ہیں۔

جس مسئلے پر قلم اٹھاتے ہیں اسے تشنہ نہیں چھوڑتے، خصوصاً سیاسی عنوانات اور شخصیات نگاری پر ان کا قلم خوب ہی جولانیاں دکھاتا ہے۔ ان کی تحریر کی شگفتگی، نفاست، سلاست اور روانی، بعض وقت قابل رشک ہو جاتی ہے۔ "جنگ" میں شروع شروع مضمون نگاری کے سلسلے میں فرماتے ہیں[1]:۔

"روزنامہ "جنگ" میں لکھنے کا مشورہ مجھے میر خلیل الرحمٰن نے دیا، اس موقع پر میرا خیال تھا کہ میں اردو نہیں لکھ سکوں گا لیکن میر صاحب نے اصرار کیا اور میں نے ان کی بات مان لی حالانکہ اردو نہ میری مادری زبان تھی نہ میں نے اردو تعلیم حاصل کی اور نہ اس کے استعمال پر میں اپنے آپ کو پوری طرح قادر پاتا ہوں۔ اس وقت تک میں صرف سندھی اور انگریزی میں لکھتا رہتا تھا۔"

صحافتی دنیا میں پیر علی محمد راشدی کے ممتاز مقام کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف آل پاکستان اڈیٹرز کانفرنس کے صدر چنے گئے بلکہ لیاقت نہرو معاہدے کے بعد پاک بھارت اڈیٹروں کی جو متحدہ کمیٹی بنی تھی اس کے بھی صدر منتخب ہوئے۔ اس بارے میں ان کا بیان ملاحظہ ہو:۔

"جب تک صحافت میں رہا تو میں آل پاکستان اڈیٹرز کانفرنس کا

---

[1] پیر علی محمد راشدی (ایک انٹرویو) از خالد خلد، مطبوعہ اخبار جہاں ۲۱ر فروری ۱۹۶۹ء، ص ۱۰

صدر رہا۔ اس کے علاوہ لیاقت نہرو معاہدے کے بعد پاک بھارت
اڈیٹروں کی جو متحدہ کمیٹی بنی تھی اس کا بھی صدر مجھے منتخب
کیا گیا تھا۔ صحافت کے لحاظ سے بہ یک وقت ہندوستان
اور پاکستان کے اڈیٹروں کی جماعت کا صدر ہونا بڑا اعزاز
تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان کے چوٹی کے اڈیٹر جن کا
نام ہندوستان کی صحافت اور سیاست کی تاریخ میں زندہ
جاوید رہے گا بہ قید حیات تھے اور میری صدارت میں کام
کرتے رہتے تھے، بعد میں یہ نظام ختم ہو گیا۔"

جناب پیر علی محمد راشدی ایک ذہین اور ہوشیار سیاست داں بھی ہیں
جوڑ توڑ کے گُر سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اپنی صلاحیت کی بنا پر وہ ۱۹۵۳ء
میں سندھ اسمبلی کے ممبر چُنے گئے، اور پیرزادہ وزارت میں وزیر مال
ہوئے۔ پھر ۱۹۵۶ء میں مرکزی حکومت کے وزیر نشر و اشاعت بنائے گئے۔
۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۳ء تک پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے مختلف ملکوں
میں فائز رہے، اور پھر ریٹائر ہو کر لکھنے پڑھنے کے کاموں میں مشغول ہو گئے۔
آپ کے الفاظ ہیں :-

"[لہ]۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۵ء تک سندھ کا وزیر مال، وزیر صحت
وزیر اطلاعات اور نائب وزیر اعلیٰ رہا۔ اس زمانے میں پیرزادہ

لہ پیر علی محمد راشدی (ایک انٹرویو) از خالد خلد مطبوعہ اخبار جہاں
۲۱ فروری ۱۹۶۹ء

عبدالستار اور پھر کھوڑو صاحب وزیر اعلیٰ تھے۔ مرکزی کابینہ
میں چودھری محمد علی کی وزارت میں وزیر اطلاعات بنا۔
وزارت کے علاوہ میں چھ ماہ تک مشرق وسطیٰ میں، پانچ سال
فلپائن میں اور ڈیڑھ سال چین میں سفارت کے فرائض
انجام دیتا رہا۔"[لہ]

جناب پیر علی محمد راشدی پیدائشی اور فطری شاعر بھی ہیں لیکن اب
شعر گوئی سے تائب ہو گئے ہیں۔ نو برس کے سن سے سندھی میں شعر گوئی
شروع کر دی تھی اور اٹھارہ برس کے سن میں ایک ایسی طویل نظم لکھی جس
نے ہمیشہ کے لیے ان سے شعر گوئی چھڑا دی۔ اس واقعہ کو انہی کی زبانی
سنیے جو بڑے پُر لطف انداز میں بیان کیا گیا ہے :-

"۱۹۳۲ء کا واقعہ ہے میں اور میرے بھائی پیر حسام الدین
روزنامہ ستارہ ہند اور صبح سندھ نکالا کرتے تھے۔ میری عمر
اس وقت سترہ اٹھارہ سال کی تھی۔ میں نے اخبار میں شائع
کرنے کے لیے دو اخباری صفحات کی ایک طویل نظم لکھی ...
یہ نظم انگریزی حکومت کے انتظام کے خلاف تھی، اور ضمناً اس
میں ایک لوکل بورڈ کے چیف افسر صاحب کی رشوت ستانی
کا تذکرہ بھی آ گیا تھا۔ نظم شائع ہوئی تو صوبائی حکومت کے ایما پر

لہ پیر علی محمد راشدی (ایک انٹرویو) از خالد خلد، مطبوعہ اخبار جہاں
۲۱ فروری ۱۹۶۹ء

چیف افسر صاحب نے مجھ پر ہتک عزت کا دعویٰ کیا۔ سب
ڈویژنل مجسٹریٹ سکھر کی عدالت میں یہ مقدمہ تین سال چلا۔ اس
میں میں نے بذاتِ خود اپنی وکالت آپ کی۔ اس بات کے
ثبوت میں کہ یہ افسر واقعی رشوت لیتا ہے اڑھائی ہزار
مسودات اور کاغذات عدالت میں منگوائے۔ اور مدعی
چیف افسر پر مختلف اوقات میں سب ملا کر ۹۰ گھنٹے جرح
کی۔ اس کارروائی میں حکومت کے اہم رازوں کا انکشاف
ہو رہا تھا اس لیے چیف افسر کی جرح ختم ہونے سے پہلے ہی
حکومت نے خود چیف افسر صاحب کو چلتا کر دیا، اور مقدمہ
ختم ہو گیا۔ اس مقدمے کو بھگتانے کے بعد میں نے ہمیشہ
کے لیے شاعری سے توبہ کر لی۔"

جناب پیر علی محمد راشدی اسلام پر پختہ عقیدہ رکھتے ہوئے چینی رہنما ماؤزے تنگ
کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں:۔

"میں[1] اپنی زندگی میں تین آدمیوں سے سب سے زیادہ متاثر
ہوا، ان میں ایک شام کے بزرگ سید احمد شامی تھے جو روحانیت
کا بحرِ ذخار تھے، دوسری شخصیت سندھ کے میر تراب علی شاہ
مرحوم تھے، جو تحریکِ خلافت کے رہنماؤں میں سے تھے اور علم

[1] پیر علی محمد راشدی (ایک انٹرویو) از خالد خلک مطبوعہ اخبار جہاں
بابت ۲۱ فروری ۱۹۶۸ء

وفضل میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ تیسری شخصیت جس نے
مجھے متاثر کیا وہ چین کے رہنما جناب ماؤزے تنگ ہیں۔ ان
کے سیاسی عقائد و افکار سے مجھے اختلاف اور شدید اختلاف
ہے لیکن ان کی شخصیت میں ایک عجیب جاذبیت مجھے محسوس
ہوئی۔"

نمونۂ تحریر کے طور پر اخبار جنگ کراچی سے ان کے ایک اردو مضمون
کا اقتباس درج ذیل ہے، جو انہوں نے سندھ کے ایک عظیم مفکر اور
جامعۂ سندھ کے وائس چانسلر امداد علی قاضی پر لکھا ہے۔ اس سے ان
کی شخصیت نگاری اور اردو زبان و ادب پر قدرت کا صحیح اندازہ ہو گا:۔

"علامہ[1] امداد علی قاضی ایک مانے ہوئے انسان تھے۔ قدرت
کی فیاضیوں کا ایک نادر نمونہ تھے۔ انسانی اوصاف کا حسین
مجموعہ تھے۔ ذہنی اور روحانی کمال کا مجسمہ تھے، علم و فضل
کا گنجینہ تھے۔ مشرقی اور مغربی دانش کا خزینہ تھے۔ اسلامی
دنیا کے نئی زمانہ مفکر منفرد تھے۔ وادیِ سندھ کے مرغِ خوش
الحان تھے۔ بوستانِ لطیفی کے بلبلِ ہزار داستان تھے۔ ارضِ
پاکستان کے لیے باعثِ عز و شان تھے۔ پاکستانی قوم کے لیے
موجبِ امتیاز و سربلندی تھے۔ یہ لفاظی نہیں ہے ایک حقیقت ہے،

[1] علامہ امداد علی قاضی از پیر علی محمد راشدی۔ مطبوعہ روزنامہ "جنگ"
بابت ۲۷ اپریل ۱۹۶۸ء

اعتبار نہ آئے تو ان کی زندگی کا مطالعہ کیجئے۔ ان کے چھوڑے
ہوئے اوراق کو چھاپئے۔ جن خوش نصیبوں نے ان کو دیکھا
یا سُنا ہے ان سے پوچھئے:۔ ع

ز رویت آستیں بردار و گوہر را تماشا کن

تاریخ عالم کے سب سے زیادہ خونی دور میں زندگی گزاری، دو بڑی
عالمی لڑائیاں اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ ہٹلر اور مسولینی
کو انسانی خون سے اور اُن کی ذریات کو انسانی حقوق سے
ہولی کھیلتے دیکھا۔ امن اور انسانی اقدار کو پامال ہوتے دیکھا
اور یہ بھی دیکھا کہ انسان پر اس قدر بدبختی سوار ہو چکی ہے کہ وہ
حق اور انسانیت کی بات ہرگز نہیں سُنتا۔ مگر اس کے باوجود
یہ شخص امن اور انسانیت کا سندیسہ سُناتا رہا۔ انسان دوستی
اور خدا ترسی کی تلقین کرتا رہا...... جن لوگوں نے حیات
کی حقیقت سمجھ لی ہے وہ موت سے کبھی نہیں ڈرتے۔ قاضی
صاحب مرحوم کو شاہ عبداللطیفؒ کا بعد الموت جس
یوصل الحبیب الی الحبیب کی طرف اشارہ معلوم تھا
ان کے دوسرے ارشادات بھی ان کے علم میں تھے۔ مثلاً جو لوگ
مرنے سے پہلے مرجاتے ہیں ان کے لیے ’موت ایک مشاہدہ کی
مانند ہے‘ یا مرنے سے پہلے جو مر گئے وہ مر کر مٹ نہیں سکیں گے۔
سقراط یا پیٹرونئس Petronins کب موت سے ڈرے

ایک نے مزے لے کر زہر کا پیالا پیا اور دم توڑ دیا۔ دوسرے
نے بڑے مزے لے کر خون بہایا اور ابدی نیند سو گیا بقول
علامہ اقبالؒ ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم   چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس سے اور اخبار و جرائد میں شائع ہونے والی ان کی
متعدد تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے وہ اُردو کے ایک صاحب طرز انشا پرداز
اور ادیب ہیں۔ ان کی تحریر صاف ستھری اور شگفتہ ہوتی ہے۔ انھیں اُردو
زبان پر اہل زبان کی سی قدرت حاصل ہے۔ وہ ہر قسم کے خیالات اور پیچیدہ
سے پیچیدہ مسئلوں کو بہتر سے بہتر اور لطیف پیرائے میں ادا کرنے پر قادر
ہیں۔ عربی، فارسی اور انگریزی پر ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ انگریزی
کتابوں میں پیش کئے گئے اچھے اچھے خیالات اور مضامین کو بہت حسن و خوبی
سے اُردو اور سندھی میں لے آتے ہیں۔ فارسی اور اُردو کے بہترین اشعار کو
اپنی عبارتوں میں بہت مناسب اور برمحل انداز میں پیش کرتے ہیں۔ بلاشبہ
انھیں صرف سندھ ہی کا نہیں بلکہ پورے پاکستان کا ایک صاحب طرز نثر نگار
کہا جا سکتا ہے۔ اُردو میں اُن کی خدمات لائقِ تحسین ہیں۔

(۶) پیر حسام الدین راشدی

(پیدائش ۱۹۱۱ء)

جناب پیر حسام الدین راشدی کا خاندان بہ لحاظ علم و فضل اور دولت و تموّل سندھ کا مشہور اور ممتاز خاندان سمجھا جاتا ہے۔ آپ کے والد پیر سید حامد شاہ راشدی بہت بڑے عالم دین صوفی، طبیب اور شاعر تھے۔ راشدی خاندان کا شجرۂ نسب ہم پہلے پیر حسام الدین راشدی کے بڑے بھائی پیر علی محمد راشدی کے حالات کے سلسلے میں دے چکے ہیں۔

جناب پیر حسام الدین راشدی ۲۰ ستمبر ۱۹۱۱ء کو "بہمن گوٹھ" میں پیدا ہوئے۔ سندھی، عربی، فارسی کی تعلیم پہلے اپنے والد ماجد سے اور پھر مولانا محمد الیاس صاحب سے حاصل کی۔ انگریزی نصرت پور ریلوے اسٹیشن ماسٹر سے پڑھی۔ اپنے بڑے بھائی پیر علی محمد راشدی کی طرح انھوں نے بھی باقاعدہ کسی اسکول کالج یونیورسٹی میں تعلیم نہیں حاصل کی اور نہ کوئی سند لی۔ جو کچھ ہے وہ سب خداداد ذہن اور وسیع مطالعہ کتب کی بدولت ہے۔

جناب پیر حسام الدین راشدی کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۲۸ء سے ہوتا ہے جب سے انھوں نے سندھی میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ ان کہانیوں کو پھر خود ہی وہ اردو میں ترجمہ کرتے، اس طرح سندھی کے ساتھ ساتھ

پیر صاحب نے ابتدا ہی سے اُردو زبان کی طرف بھی توجہ دی۔ یہ راشدی خاندان جس میں پیر پگاڑو اور پیر جھنڈو بھی شامل ہیں تحریک آزادی میں ہمیشہ پیش پیش رہا، اور بیش بہا جانی و مالی قربانیاں دیں۔ سید احمد شہید کی تحریک جہاد، اور مولانا محمد علی شوکت علی کی تحریک خلافت، اور سر سید احمد اور ان کے رفقاء کی تحریک علی گڑھ میں اس خاندان نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا "تحریک حُر" جو خالص مجاہدین اسلام کی تحریک تھی، کے بانی اسی خاندان کے ایک بزرگ حضرت پیر صبغۃ اللہ شاہ اوّل تھے۔ غرض ان تحریکوں نے شمالی ہند اور سندھ کو "حبل المتین" کی طرح ایک رسی میں باندھ دیا تھا، اور ان تمام تحریکوں کی اشاعتی اور تبلیغی زبان چونکہ اردو اور صرف اُردو ہی تھی، اس لیے سندھ کا یہ راشدی خاندان اُردو زبان کا بھی بہت بڑا حامی، سرپرست اور قدردان تھا۔ ان کے یہاں شروع ہی سے اُردو گھروں میں بولی اور سمجھی جاتی رہی ہے۔

پیر حسام الدین راشدی کے بڑے بھائی پیر علی محمد راشدی نے سکھر سے "ستارۂ سندھ" نکالا تو آپ نے اس میں باقاعدگی سے کہانیاں اور مضامین لکھنے شروع کیے۔ اس اخبار کا ہفتہ وار ادبی اڈیشن بھی نکلتا تھا، جس میں اختر شیرانی، سیماب اکبرآبادی، اور بہت سے دیگر عظیم اردو شعرا کے کلام کو سندھی میں ترجمہ کرکے یہاں کے عوام میں روشناس کرانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یہ سندھ کے اخبارات کو ادبی اڈیشن کی اہمیت اور افادیت سے آگاہ کرنے کی ابتدا انہی راشدی برادران نے کی تھی۔ "ستارہ سندھ" کے علاوہ پیر حسام الدین صاحب اکثر اُردو مضامین زمیندار لاہور، سیاست لاہور

کو بھی اشاعت کے لیے بھیجتے رہتے تھے۔ اس طرح اُردو میں ان کی نثر نویسی اس زمانے سے باقاعدہ شروع ہو گئی۔ پھر ان کے تاریخی اور تحقیقی مضامین معارف اعظم گڑھ، ماہِ نو کراچی، رسالہ اُردو اور قومی زبان میں اکثر شائع ہونے لگے، اور علمی و ادبی حلقوں میں ان کی لیاقت اور صلاحیتوں کے جوہر کھلے۔

بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب مرحوم نہ صرف ان پر بھروسا کرتے تھے بلکہ ان کی علمی و ادبی صلاحیت کے قدردان بھی تھے۔ پہلی مرتبہ جب انھوں نے کراچی میں انجمن کی شاخ قائم کی تو اس انجمن کی مجلس عاملہ کا رکن ان کو منتخب کیا۔ اُردو کالج کی موجودہ عمارت میں پیر صاحب کی کوششوں کو بڑا دخل رہا ہے۔[1]

۱۹۳۴ء میں پیر صاحب نے سندھی ادیبوں اور دانشوروں کو اُردو زبان و ادب سے متعارف کرنے کے لیے نو سو صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب "اُردو ادب کی تاریخ" لکھنی شروع کی تھی، جو غالباً ابھی تک چھپی نہیں ہے۔ سندھ یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہونے والی اکثر کتابیں آپ کی زیرِ نگرانی مرتب کی جاتی ہیں۔

آپ کی اُردو تصانیف میں "مرزا غازی خاں ترخان، اور اُس کی بزمِ ادب" "جناب میر معصوم بکھری" "مکلی نامہ" اور غالب کے "تلامذہ سے متعلق

[1] یہ معلومات عبدالرشید خاں تبسم کے مقالہ "سندھی کے جدید اُردو مصنفین" (غیر مطبوعہ) سے حاصل کی گئی ہیں۔

"دودِ چراغِ محفل" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ "مرزا غازی خاں ترخان اور اس کی بزمِ ادب" انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی ہے اس اہم اور گراں قدر تصنیف کو مصنف کی بیس بائیس سال کی کوششوں کا نتیجہ بتایا گیا ہے جیسا کہ مصنف نے اس کتاب کی ابتدا میں بھی لکھا ہے:-

"مرزا غازی کی داستانِ حیات اور اس کے دامنِ دولت سے وابستہ اہلِ علم و فن کے حالات جمع کرنے اور لکھنے کی ابتدا آج سے کئی سال پہلے بلکہ کم و بیش اس پر بیس بائیس برس بیت چکے ہوں گے کہ میں نے کی تھی، اور کتنی سال ہو سکے اس کے سوانحِ حیات کا ایک خاکہ تیار کر کے مجلہ اُردو میں بھی چھپوا دیا تھا لیکن یہ دلچسپ داستان اس حد تک بکھری ہوئی ہے کہ اس کو یکجا کرنا اور پھر کتاب کی صورت میں لے آنا اتنی مدت میں باوجود ہر ممکن کوشش کے بھی مجھ سے ممکن نہ ہو سکا۔"[1]

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ بیس بائیس برس تک مسلسل تحقیقات اور کام کے بعد یہ کتاب مرتب ہو سکی ہے۔ کیونکہ بیس بائیس برس کا عرصہ ایک مصنف اور اسکالر کے لیے بہت ہوتا ہے اور اس میں ایسی ایسی اور اس پایہ کی کئی کتابیں معرضِ وجود میں آ سکتی ہیں۔ میرے خیال میں پیر صاحب کی دوسری

[1] مرزا غازی بیگ ترخان اور اس کی بزمِ ادب" از پیر حسام الدین راشدی مطبوعہ انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی ۱۹۷۰ء ص ۱۵۔

مشغولیتیں اس کتاب کی ترتیب کو معرضِ التوا میں ڈالتی رہی ہوں گی، اور
اسی لیئے اتنی تاخیر ہوئی ہوگی۔

اس کتاب کی اہمیت پر جناب اختر حسین صاحب صدر انجمن ترقی
اُردو پاکستان نے حرفے چند کے تحت ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:-[1]

"راشدی صاحب نے غازی بیگ کے حالاتِ زندگی اور اس کے
دربار سے متعلق شعراء کے بارے میں یہ مفصل کتاب لکھ کر کئی
جہتوں میں رہنمائی کی ہے۔ سب سے پہلی اور اہم بات تو
یہ ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ برصغیر ہند و پاکستان کی فارسی
شاعری کے ایک خاص گوشے پر روشنی پڑتی ہے۔ متعدد اہم شعراء
کے حالات پہلی مرتبہ پوری تفصیل سے سامنے آئے ہیں اور
اس کے ساتھ ہی بعض غیر معروف شعراء کو بھی گوشۂ گمنامی
سے نکال کر متعارف کرایا گیا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے
کہ فارسی زبان جو پاکستان کے تمام علاقوں کا مشترک تہذیبی
ورثہ ہے اس کی خدمت صوبۂ سندھ نے کسی طرح بھی دوسرے
صوبوں سے کم نہیں کی بلکہ زیر نظر کتاب کے مطالعے کی روشنی
میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سندھ کا فارسی ادب برصغیر کے

[1] "مرزا غازی بیگ ترخان اور اُس کی بزم ادب" از پیر حسام الدین راشدی،
مطبوعہ انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی، ۱۹۷۰ء صد ۱۱ و ۱۲

ادبیات میں ایک وقیع اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔
اس کتاب کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ راشدی صاحب
نے سندھ کے فارسی شعرا کے بارے میں یہ کتاب اُردو زبان
میں لکھی ہے، وہ اگر چاہتے تو اسے سندھی یا فارسی میں بھی لکھ
سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے اس گراں قدر کتاب کے ذریعہ اردو
کے سنجیدہ ادب میں اضافہ کر کے اُردو سے اپنی قدیم اور لازوال
محبت کا ثبوت دیا ہے۔"

پیر حسام الدین راشدی نے کئی اہم اور نادر قلمی کتابوں کو اپنے گراں قدر
مقالے اور تحقیقی حواشی کے ساتھ ایڈٹ بھی کیا ہے جن میں میر شیر علی قانع
ٹھٹوی کی تصنیف تحفۃ الکرام، دولت کی فارسی تصنیف "تاریخ رشیدی"
خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تذکرہ شعرائے کشمیر، تاریخ مظہر شاہ جہانی، روضۃ
السلاطین، تذکرہ امیر خاں وغیرہ پر آپ کے پُر مغز اور تحقیقی مقدمے اہل علم لوگوں
کی نظر میں بڑے وقیع سمجھے جاتے ہیں۔

فارسی زبان پر پیر صاحب کو بڑی قدرت حاصل ہے۔ ان کی فارسی تحریریں
بڑی بے ساختہ اور شگفتہ ہوتی ہیں۔ اُردو میں بھی وہ بڑے اعتماد کے ساتھ
بے ساختہ، رواں اور دلکش نثر لکھنے پر قادر ہیں۔ اُن کی اُردو تحریروں میں کہیں
کہیں مزاح کی چاشنی بہت مزا دے جاتی ہے۔ مثال کے طور پر "دود چراغ محفل"
کے اس اقتباس کو لیجیے۔
"میں نہ غالب شناس ہوں اور صحیح حقیقت تو یہ ہے کہ نہ میں نے

غالب کی اچھی کتابوں کا اور نہ غالب پر لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ اس غرض سے کیا ہے کہ محقق بنوں، یا کم از کم اتنا پڑھوں کہ وقت آن پڑے تو کچھ لکھ سکوں۔ مولانا غلام رسول مہر مربی ہیں، عرشی صاحب کا معتقد ہوں، مالک رام عزیز دوست ہیں۔ اکرام صاحب سے نیاز مندی ہے۔ جب کوئی کتاب شائع ہوئی خریدی اور لکھنے والوں سے جو روابط ہیں اسی سطح پر کتابیں پڑھیں اور رکھ دیں۔ جوانی میں البتہ جب میں سکھر میں اخبار نویسی کرتا تھا، اور دن کی گرمی کی تپش اور لو سے نجات پا کر مرحوم محمد اسماعیل کے احاطے کی چھت پر ہم دو بھائی اور ہمارے مرحوم دوست جسٹس عبدالرحیم تہمد باندھ کر بستروں پر دراز ہوتے تو اکثر غالب ہی کی غزلیں، لیکن وہی غزلیں جو زبان زد عام نہیں، یا بھائی چھیلا پٹیالے والے یا بھائی فیض امرتسر والے کے ریکارڈوں کے ذریعے سنی ہوتی تھیں، کورس میں گایا کرتے تھے۔ ؎

ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

یہ غزل یوں پسند تھی کہ کچھ ہم تینوں کی مالی حالت بھی پتلی تھی۔ اخبار ہمارا نہیں چلتا تھا، اور وکالت جسٹس عبدالرحیم کی نہیں چمکی تھی

۵ "سندھی کے جدید اردو مصنفین" (غیر مطبوعہ) از عبدالرشید خان تبسم ص ۲۰۶۔

بس اس غزل کے اشعار جتنے کچھ یاد تھے گاتے گاتے جہاں اونگھ سی آنے لگتی تو ہم میں سے ہر ایک لمبی تان کر سو جاتا تھا۔

جناب پیر حسام الدین راشدی اپنی علمی اور تحقیقی تصانیف کی طرز نگارش میں مولوی عبدالحق صاحب مرحوم سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ تحقیقات علمی میں بڑی احتیاط اور سنجیدگی برتتے ہیں۔ عبارت سلجھی ہوئی اور دلکش ہوتی ہے۔ بعض مفروضات کے سلسلے میں استدلال بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ تاریخ پیر صاحب کا خاص موضوع ہے اور اس میں وہ غیر جانب داری اور ثقاہت کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ تنقید و تبصرہ کا انداز بھی بہت ہمدردانہ اور سنجیدہ ہوتا ہے۔ نمونۂ تحریر کے طور پر ان کی تصنیف "مرزا غازی بیگ ترخان اور اس کی بزم ادب" سے کچھ اقتباس درج ذیل ہے:-

"ویسے تو شاہ بیگ بھی کچھ قابل ستائش مزاج کا آدمی نہیں تھا مگر اس کو اتنا موقع مل ہی نہ سکا کہ کابل اور قندھار میں شکست کھانے کی تلخی اور غصے کی آگ سندھ کے باشندوں پر اتار سکے لیکن "اگر پدر نتواند پسر تمام کند" کے مصداق اس کے بیٹے شاہ حسین نے اپنے ۳۴ سالہ دور حکومت میں ملتان سے لے کر ٹھٹہ کا پورا ملک اچھی طرح روند ڈالا۔ اور ملتان، اوچ، بکھر، سیوہن اور ٹھٹہ

۶ "مرزا غازی بیگ ترخان اور اس کی بزم ادب" از پیر حسام الدین راشدی مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۷۰ء۔ ص ۱۴-۱۵

کے شہروں، قریوں اور قصبوں تک کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔
شیبانی شاہ اسماعیل اور بابر نے جو کچھ وہاں کیا تھا اس کا حساب
کتاب اس نے یہاں کے مکینوں اور مکانوں سے مع سود چکا لیا
یہ شخص جب لاولد ۹۶۲ھ میں مرا تو سندھ دو حصوں میں
بٹ کر اس کے دو ترکی امیروں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ بالائی
سندھ فاضل کوکل تاش کے بیٹے سلطان محمود کے قبضے میں
آیا جس کا مرکز بھکر بنا اور زیریں سندھ جس کا دار السلطنت
ٹھٹہ کا تاریخی شہر تھا وہ مرزا عیسیٰ خاں کے حصے میں آیا۔ مرزا
عیسیٰ (۹۶۲-۹۷۳ھ) کا دور قدرے اطمینان کا دور
رہا۔ لیکن اس کے بیٹے مرزا محمد باقی کا زمانہ پھر ایک قیامت بن کر
آیا۔ اور اس نے نہ فقط یہاں کے لوگوں کو تہس نہس کیا بلکہ اپنے
خاندان کا بھی جتنا صفایا کر سکتا تھا کر لیا۔ اتنا خون بہایا کہ آخر
خود بھی دیوانہ ہو گیا اور جنون میں خودکشی کر لی۔ اس کا بیٹا
پائندہ بیگ جو صحیح الدماغ نہیں تھا اس کا جانشین ہوا لیکن مملکت
کا اصل کاروبار اس کے بیٹے مرزا جانی بیگ کے ہاتھوں میں رہا۔
جانی بیگ اگر بہتر نہیں تھا تو اتنا برا بھی نہیں تھا۔ اس نے خون
کے بہت سارے داغ دھوئے لیکن کہاں تک دھوتا......
......اس کتاب میں اسی مرزا جانی بیگ کے
بیٹے مرزا غازی خاں ترخان کا حال لکھا گیا ہے، جس نے اکبر

اور جہانگیر کے دور میں نہ فقط سندھ سے لے کر قندھار
تک حکمرانی کی اور اپنی امیری کی ٹھاٹھ دار مسند سجائی
بلکہ شعر و سخن اور داد و دہش کی یوں دھومیں مچائیں
کہ جہانگیر سے لے کر ایران کے شاہ عباس تک کے دربار
میں اس کی علم دوستی، سخن پروری اور زر بخشی کے
چرچے سنائی دیے۔ اور داستانیں بیان ہوا کیں۔
مرزا غازی کو نظر کھا گئی اور جوانی میں اس کا
انتقال ہو گیا۔ اگر طبعی عمر نہ سہی زندگی کی ذرا سی مہلت
اور ملتی تو ہماری ادبی تاریخ میں اس کا دربار اکبر
اور جہانگیر جیسے بادشاہوں کی ٹکر کا، جائے ادب
ہونے کی وجہ سے، اگر نہیں شمار کیا جا سکتا تو پرورش
علم و ہنر میں خانِ خاناں جیسے علم دوست اور
ادب پرور امرا سے تو یقیناً بہتر درجہ پاتا۔"

جناب پیر حسام الدین راشدی کی عالمانہ شخصیت نہ صرف سندھ بلکہ پورے
پاکستان کے لیے لائق احترام ہے۔ انھوں نے علمی دنیا میں جو نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے
اس کے اہم اسباب میں ان کا علمی شغف، ذہانت، فطانت اور وسیع مطالعہ کے
ساتھ ان کی خاندانی وجاہت، وقار اور پس منظر بھی شامل ہیں۔ مستقبل میں اردو
فارسی اور سندھی زبان و ادب کو ان کی علمی بصیرت اور تحقیقی جد و جہد سے
بہت زیادہ امیدیں وابستہ ہیں۔

سنہ ۱۹۶۳ء میں آپ کی علمی، ادبی، اور تاریخی خدمات کے اعتراف میں حکومت ایران نے آپ کو "نشانِ سپاس" درجۂ اول عطا کیا۔ سنہ ۱۹۶۴ء میں حکومت پاکستان نے ان ہی علمی فضائل کی بنا پر آپ کو "ستارۂ امتیاز" سے نوازا۔ پاکستان کی جانب سے آپ اکثر غیر ممالک کا ثقافتی دورہ کرتے رہے ہیں۔ سیر و سیاحت سے آپ کو بڑی دلچسپی ہے۔ دمشق، بغداد، افغانستان، ایران، وسط ایشیا، چین، فلپائن، قاہرہ اور روس وغیرہ کا سفر کر چکے ہیں، اور اکثر مقامات کی نادر تصویریں آپ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔

پیر صاحب کی کوئی اولاد نہیں ہے، ان کی اولاد ان کی غیر فانی تصانیف اور نادر کتابوں سے مزین کتب خانہ ہے۔ انھیں کتابوں سے عشق ہے۔ نئی اور گراں قدر مطبوعات کا جمع کرنا اور ان کا مطالعہ کرنا ان کی دلچسپ مشغولیتوں میں شامل ہے۔ تقریباً بیس ہزار کتابیں، اڑھائی تین سو کے قریب نادر مخطوطات اور سیکڑوں مائکروفلمیں آپ کے ذاتی کتب خانے کی زینت ہیں۔ یہ وہ علمی خزانے ہیں جن سے ملک و قوم ان کی زندگی میں نہ سہی، بعد میں اور ہمیشہ مستفیض ہوتی رہے گی۔

(۷) حضرت مولانا محمد قاسم صاحب

(سنہ ۱۳۰۵ھ - سنہ ۱۳۴۹ھ)

حضرت مولانا محمد قاسم عالم باعمل کے ساتھ ایک صاحبِ حال صوفی بھی تھے، سلسلۂ نقشبندیہ میں مرید تھے۔ آپ کے والد مولانا محمد ہاشم بانیٔ مدرسہ ہاشمیہ گڑھی یٰسین اپنے وقت کے ایک جید اور ثقہ عالم تھے۔ مولانا محمد قاسم نے درسِ نظامیہ کی اکثر کتابیں اپنے والد ہی سے پڑھیں پھر سنہ ۱۳۲۲ھ میں والد کے انتقال کے بعد انھیں استاذ الکل، اور ولیٔ کامل حضرت مولانا عبدالغفور صاحب قدس اللہ سرہٗ کی صحبت میں کچھ عرصے تک رہنے کا موقع مل گیا۔ سنہ ۱۳۲۳ھ تک وہ ان کے ساتھ رہ کر علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل کرتے رہے۔ پھر اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ ہاشمیہ کی نگرانی قبول کر کے درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ دُور دُور سے طلبا آکر آپ سے فیض حاصل کرتے۔ درس و تدریس کے علاوہ آپ کا بڑا مشغلہ فتویٰ نویسی تھا۔ علوم دینی اور شریعت میں آپ کی غیر معمولی بصیرت کے باعث دور دور سے لوگ فتوای دریافت فرماتے اور آپ کے دستخط کے بغیر لوگوں کو تشفی نہ ہوتی تھی۔

آپ کی پیدائش اپنے آبائی گاؤں "میاں گوٹھ" تحصیل شکارپور (سندھ)

میں پیر کے دن ۱۳۰۵ھ کو ہوئی، اور ۱۸ ذی قعدہ شنبہ کی رات ۱۳۴۹ھ کو انتقال فرمایا۔ آپ کی بزرگی اور تقدس سے لوگ بہت زیادہ متاثر تھے، اکثر کرامات بھی آپ سے ظاہر ہو جاتی تھیں، وفات کے بعد نماز جنازہ کے دوران چار تکبیروں کی آواز غیب سے سنی گئی اسی باعث لوگ ان کو "صاحب التکبیر" بھی کہتے ہیں

حضرت مولانا محمد قاسم اُردو کے اچھے نثر نگار تھے۔ آپ فتاویٰ زیادہ تر اُردو ہی میں لکھتے تھے۔ مادری زبان سندھی تھی، اور فارسی عربی کے بہت اچھے عالم تھے۔ لیکن فتاویٰ اور مضمون نویسی کے لیے آپ نے اُردو ہی کو پسند فرمایا۔ کبھی کبھی فارسی اور اُردو میں اشعار بھی موزوں فرماتے تھے۔ قاسم تخلص کرتے تھے۔ ان کا ایک فتویٰ جو انھوں نے میر فخر الدین جیلانی گھوٹکی کے اس سوال پر، کہ جنگلات جو کسی کی ملکیت نہ ہوں اور سرکار انگلشیہ کے قبضے میں ہوں اگر اس سے کوئی لکڑی کاٹتا ہے تو کیا یہ سرکاری جرم ہے اور کیا خدائی مؤاخذہ بھی اس پہ ہوگا۔ اس کے جواب میں آپ نے لکھا ہے، وہ ان کے نمونہ نثر کے طور پر درج ذیل ہے:۔

"یہ جنگل[1] ملکیت سرکاری نہیں کہا جاوے گا زیرا کہ حربی نصاریٰ کا زمینات پر قبضہ مفید ملکیت کا نہیں ہو سکتا ہے بلکہ جس چیز کو

---

[1] مجموعہ فتاویٰ قاسمیہ (قلمی) صفحہ ۱۲۳ محفوظ نزد مولانا محمد نجم الدین صاحب صدر مدرس و مفتی مدرسۂ ہاشمیہ گڑھی یٰسین

وہ احراز دار الحرب میں لے جاتے ہیں یا اپنی چیز کے ساتھ اس چیز کو اس طرح خلط کرتے ہیں جس سے استہلاک کے معنی پیدا ہو سکتی ہے جیسا کہ اپنے روپیوں سے یا اپنے غلہ گیہوں سے یہاں کے روپیوں یا غلہ گیہوں کو لے کر خلط کریں کہ اس قسم کے خلط ہونے کے بعد تمیز کی معنی جاتی رہتی ہے تو تب وہ مالک ہو سکتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ زمینات اور اشجار ہندوستان کو وہ اپنی دار الحرب میں نہیں لے گئے ہیں اور نہ خلط استہلاک کی کر چکے ہیں لہٰذا یہ جنگل ملکیت سرکار نصاریٰ کی نہیں ہوگی۔ . . . .

. . . جبکہ مذکورہ بات ثابت ہو چکی تب یہ بھی جاننا چاہیئے کہ جنگل کی لکڑیوں اور گھاس کا بیع کرنا شرعاً باطل ہے اس لیے کہ یہ اشیا، مباحہ سے ہیں اور کسی کی ملکیت میں داخل نہیں ہیں، اور اشیاء مباحہ کا بیع کرنا غیر مشروع اور نا روا ہے۔ کتاب در المنتقی شرح الملتقی کے باب البیع الفاسد میں لکھا ہے "ولا یجوز بیع المباحات لحطب الصحرا وحشیشہ۔ انتہیٰ"۔ جب کہ بیلا کے جنگل میں خدائی سیلاب، دریا کا پانی آ جاتا ہے اور اس کے درخت خود رو ہیں اور اہل کار فقط درختوں کی نگرانی کرتے ہیں جیسا کہ مستفتی کے استفتا سے ظاہر ہے

تو ایسی صورت میں سرکاری ممانعت محض ظلم ہے، اور لکڑ لوڈل کے کاٹنے والے پر خدائی مؤاخذہ نہیں ہے واللہ اعلم بالصواب۔

حررہٗ فقیر محمد قاسم الیاسی عفی اللہ عنہ

۲۳ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ

جیسا کہ عبارت بالا سے ظاہر ہے عبارت سادہ اور مذہبی رنگ کی ہے لیکن بے ضرورت ثقیل عربی فارسی کے الفاظ استعمال نہیں کیے گئے ہیں۔

۸

مولانا محمد ابراہیمؒ

(۱۳۰۷ — ۱۳۸۴ھ
۹۰-۱۸۸۹ء — ۱۹۶۴ء)

حضرت مولانا محمد ابراہیمؒ کے والد ماجد مولانا محمد ہاشم گڑھی یٰسین کے ایک مشہور عالم تھے۔ آپ اپنے علم و فضل اور زہد و تقدس کی وجہ سے اپنے معاصرین میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ نے اپنی زندگی درس و تدریس اور تبلیغ دین کے لئے وقف کردی تھی اور ایک عربی مدرسہ ہاشمیہ قائم کر کے خدمت علم دین میں برابر مصروف رہے۔

حضرت مولانا محمد ابراہیم کی پیدائش ۱۳۰۷ھ ۹۰-۱۸۸۹ء میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ حفظ قرآن کے علاوہ عربی، فارسی اور سندھی میں اچھی لیاقت حاصل کی۔ ۱۳۲۲ھ ۵-۱۹۰۴ء میں جب آپ کے والد کا انتقال ہوا تو آپ اس وقت پندرہ برس کے تھے۔ بڑے بھائی مولانا محمد قاسمؒ نے جو گڑھی یٰسین میں اپنے والد کے قائم کردہ مدرسۂ نظامیہ ہاشمیہ کو چلا رہے تھے، ان کو اپنے پاس بلالیا اور تعلیم دیتے رہے۔ ۱۳۳۴ھ ۱۶-۱۹۱۵ء میں آپ ہمایوں شریف صاحبزادہ

سبد انسباقی صاحب کی تعلیم کے لئے بلا لئے گئے۔ تصوف کا چسکا آپ کو دہیں لگا اور آپ جب وہاں سے نکلے تو ایک عالم دین کے ساتھ، صوفیانہ مشرب بھی اختیار کر چکے تھے، شاعرانہ مذاق نے اس پر اور جلا بخشی، اور وہ ایک اچھے صوفی شاعر ہو گئے۔ اردو میں کم لیکن فارسی میں آپ کے کلام کا بہت بڑا ذخیرہ کلیات ناظم، دیوان ناظم، اور تواریخ منظومہ ناظم کے نام سے قلمی مسودے کی شکل میں موجود ہے، جن سے آپ کی فارسی زبان پر قدرت، شاعرانہ مہارت اور صوفیانہ انداز بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ تمام مخطوطے مولانا نجم الدین صاحب گڑھی یٰسین کے پاس محفوظ ہیں۔

سنہ ۱۳۳۸ھ (۲۰-۱۹۱۹) میں آپ کے بڑے بھائی مولانا محمد قاسم نے آپ کو گڑھی یٰسین کے مدرسہ ہاشمیہ کا کام سنبھالنے کے لئے اپنے پاس بلا لیا۔ اور وہاں کام کرتے رہے۔ سنہ ۱۳۴۹ھ میں جب مولانا محمد قاسم کا انتقال ہوا تو آپ ان کی جگہ صدر مدرس مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۳۶۳ھ میں شہریار بلوچستان، میر احمد یار خاں نے ان کو قاضی القضاۃ بلوچستان مقرر کیا لیکن وہاں زیادہ دنوں تک نہ ٹھہر سکے اور دو ہی برس بعد وہاں سے مستعفی ہو کر گڑھی یٰسین چلے آئے اور مدرسہ ہاشمیہ کی صدر مدرسی اور ادارالافتا شرعی کا کام سنبھال لیا۔

۷ شعبان المعظم بروز شنبہ سنہ ۱۳۸۴ھ (۱۹۶۴) کو بہ عارضہ تپ دق انتقال فرمایا اور گڑھی یٰسین میں مغربی جانب سپرد خاک کئے گئے۔

حضرت مولانا محمد ابراہیم کو عربی، فارسی، سندھی کے ساتھ اردو پر خاصی قدرت حاصل تھی۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اسلامی ثقافت اور علوم کا اردو میں

جیسا اور جتنا سرمایہ موجود ہے برصغیر کی اور کسی دوسری زبان میں نہیں اور یہی وجہ ہے کہ آپ کو اردو سے بڑی محبت تھی۔ آپ مفتی تھے اور فتویٰ لکھنا آپ کا بہت بڑا مشغلہ تھا۔ فتاویٰ آپ برابر اردو ہی میں لکھتے تھے۔ ان فتاویٰ سے آپ کی اردو نثر کا نمونہ حاصل ہو جاتا ہے، جو درج ذیل ہے۔ یہ فتویٰ انھوں نے مسمی حبیب ساکن رستم کے اس سوال پر لکھا تھا کہ "غلام حیدر نامی ایک شخص اپنی بیوی فاطمہ، لڑکی نوری اور ایک بہن جنت، کو وارث چھوڑ کر مر گیا۔ غلام حیدر کے اوپر کچھ قرض بھی ہے۔ اس کا مال متروکہ شرعاً مذکورہ ورثا میں کس طرح تقسیم ہوگا۔" آپ نے اس کے جواب میں جو فتویٰ اردو میں لکھا اس کی عبارت اس طرح سے ہے:-

"از روئے قانون شرع انور پہلے اس کے مال متروکہ سے اس کے کفن دفن کا خرچ ادا کیا جائے۔ بعد میں اس کے اوپر جو قرض ہے وہ اس کے باقی ماندہ مال سے دیا جائے۔ اس کے بعد جو اس کا مال، ملکیت، زر، زیور، زمین، اثاث البیت کو ایک روپیہ مقرر کر کے حسب ذیل وارثوں میں تقسیم کیا جائے۔

ایک روپیہ

زوجہ فاطمہ	بنت نوری	اخت جنت
۲ر آنے	۸ر آنے	۶ر آنے

---

[1] از مجموعہ فتاویٰ ناظمی قلمی محفوظ در کتب خانہ مولانا محمد ابراہیم، مرحوم، گڑھی یٰسین

یعنی قرضہ ادا کرنے کے بعد باقی مال متروکہ کو ایک روپیہ مقرر کر کے دو آنے اس کی بیوی مسماۃ فاطمہ کو اور آٹھ آنے اس کی بیٹی نوری کو اور چھ آنے اس کی بہن مسماۃ جنت کو دیئے جائیں شریعت کا یہ حکم ہے۔"

آخر میں آپ کی ایک نعتیہ اردو غزل سے دو اشعار درج ذیل ہیں ان سے آپ کی اردو غزل گوئی کا بھی اندازہ ہوگا:۔

سرور عالم حبیب کبریا پیدا ہوئے
پیشوائے مرسلان و انبیاء پیدا ہوئے
ناظما کیونکر گل امید پژمردہ رہے
نوبہارے موجب نشو و نما پیدا ہوئے

---

(۹)

"پیر اسحاق جان سرہندی"

(پیدائش ۱۳۳۱ھ
۱۹۱۳ء)

حضرت پیر اسحاق جان سرہندی کا خاندان قندھار سے ہجرت کر کے سندھ میں انیسویں صدی عیسوی میں آباد ہوا تھا۔ ایک جگہ خود لکھتے ہیں:۔

"میرے[۱] آباء و اجداد کا وطن قندھار تھا۔ جد امجد حضرت آقا محمد حسین جان نے بارہ سال کی عمر میں اپنے والد حضرت خواجہ عبدالرحمٰن صاحب کی محبت میں انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی اور جہاد کیا۔ پھر والئی افغانستان امیر عبدالرحمٰن کے مظالم سے تنگ آکر ہجرت کی

۱؎ سفر نامہ ایران، مصنفہ پیر اسحاق جان سرہندی مطبوعہ سندھ یونیورسٹی پریس ۱۹۶۰ء

اور سندھ کے ایک قصبہ ٹکھر متصل حیدر آباد میں آباد

ہوئے۔"

حضرت پیر اسحاق جان سرہندی کی پیدائش ۵ ذیقعدہ ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۳ء کو اپنے آبائی مسکن حیدر آباد میں ہوئی۔ آپ کے والد حضرت پیر محمد اسمٰعیل جان روشن سرہندی اپنے وقت کے ممتاز عالم اور صاحب دل صوفی تھے۔ آپ کی تعلیم و تربیت اپنے والد کے زیر سایہ ہوئی۔ علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کے بعد آپ نے روحانی تربیت بھی اپنے والد ہی سے حاصل کی۔

سیر و سیاحت کا شوق آپ کو بچپن ہی سے ہے۔ شیخ سعدیؒ کی طرح اپنی زندگی کا خاصا حصہ آپ نے سیر و سیاحت ہی میں گذارا ہے۔ ایران افغانستان، عراق، عرب اور ہندوستان کا شاید ہی کوئی شہر چھوٹا ہو۔ چار بار تو حج بیت اللہ سے شرف یاب ہو چکے ہیں۔ اور ہر وقت آستانۂ نبوی پر حاضری کا شوق دل میں موجود رہتا ہے۔ ایک جگہ اپنی سیاحت کے شوق کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :-

"ابتدائے عمر میں جب والد مرحوم حیات تھے اور گھر کی کوئی فکر دامن گیر نہ تھی تو ہر سال ہندوستان کی سیر و تفریح کے لئے چلا جاتا تھا۔ چنانچہ اگر گرمی ہوتی تھی تو "ماؤنٹ آبو" پہنچ جاتا اور اگر ملک دیکھنے کا شوق ہوا تو بمبئی سے دکن جا پہنچتا

سفرنامۂ ایران مصنفہ پیر اسحاق جان سرہندی مطبوعہ سندھ یونیورسٹی پریس ۱۹۶۰ء ص۲

تھا۔ مہینوں وہاں رہتا۔"

پیر صاحب کا سیر و سیاحت سے جو وقت بچتا ہے وہ لکھنے پڑھنے میں صرف ہوتا ہے۔ تصنیفی رجحان آپ کا علمی اور مذہبی ہے۔ آپ کی دو تصانیف "سندھی عربی لغت" اور "بنات الرسول" شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے پہلی کتاب تو زائرین مکہ کی سہولت کے پیش نظر لکھی گئی ہے۔ یعنی بہت زیادہ ضروری اور کثیر الاستعمال عربی الفاظ کے سندھی میں معنی دیئے گئے ہیں۔ یہ پچاس صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسری کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں کے حالات زندگی درج کئے گئے ہیں۔ یہ پچیس صفحات پر مشتمل ہے۔

اردو میں آپ کی ایک بڑی دلچسپ کتاب ۶۵ صفحات پر مشتمل "سفرنامۂ ایران" ہے، جو ۱۹۶۰ء / ۱۳۸۰ھ میں سندھ یونیورسٹی پریس حیدر آباد سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں آپ نے اپنے سفر ایران کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے اور وہاں کی ایک ایک چیز کا بڑے دلچسپ پیرائے میں، جائزہ لیا ہے۔ پڑھنے کے وقت پڑھنے والا ایسا محسوس کرتا ہے جیسے وہ خود ان کا ہم سفر ہو۔ یہ سفر انھوں نے ۱۹۵۹ء میں کیا تھا۔ اس کتاب میں روانگی کے وقت سے واپسی تک کے تمام واقعات اور حالات کو قلمبند کر دیا ہے پیر صاحب کا انداز تحریر بڑا دلکش اور شگفتہ ہوتا ہے۔ اردو میں چند کتابوں ہی سے ان کی صلاحیت اور مہارت ظاہر ہوتی ہے۔

پیر صاحب کا تعلق گرچہ ایک صوفی خانوادے سے ہے اور وہ ایک روشن ضمیر

صوفی کے فرزند ہیں لیکن خود انھوں نے اپنے لئے اس خشک اور سنگلاخ راستے کو منتخب نہیں کیا۔ دیندار اور خدا ترس مسلمان ضرور ہیں لیکن پیری مریدی نہیں کرتے اور اپنا وقت علمی مشغلوں میں گذار رہے ہیں۔

ان کا "سفرنامہ ایران" اگرچہ صرف پچاس صفحات پر مشتمل ہے لیکن سفرنامے کے لئے جو چیزیں ضروری ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں۔ ایران کے ایک ایک شہر، قصبہ اور گلی کوچوں کا تذکرہ، وہاں کے باشندوں کے رسم ورواج، عادات وخصائل، طور طریق، رہن سہن، مذہبی عقائد ورسومات پر خاطر خواہ روشنی۔ پھر زبان وبیان میں ایسی دلکشی کہ پڑھنے والے کا جی نہ گھبرائے۔ جگہ جگہ مزاح کی چاشنی نے اسے اور زیادہ پر لطف بنا دیا ہے۔ نمونہ نثر کے طور پر اسی سے کچھ اقتباس درج ذیل ہے۔ تہران کی ایک شاہ راہ لالہ زار کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں:-

"یہ بہت ہی عالی شان شاہراہ ہے۔ اس کے دونوں طرف دوکانیں ہیں آخر میں خوبصورت فوارے اور حوض ہیں جن میں رنگین قمقمے بے حد دلکش منظر پیش کرتے ہیں۔ شمرون گو کہ شہر سے پیوستہ ہے خیابان شاہ کا ایک دلفریب بازار وہاں تک پہنچا دیتا ہے مگر فاصلہ ۱۸ میل ہے۔ فوارے کے کنارے پر پھولوں کی مہک، چاندنی رات کی دل آویزی۔ چاند تاروں کے مقابلے میں ہزاروں مصنوعی چاند ستارے ان کا

مقابلہ معنوی وظاہری حسن کر رہا تھا کہ یکایک سبز سرو کے سائے میں ایک سیاہ چادر اوڑھے ہوئے سرو کی طرح کھڑی ہوئی ایک دل فریب صورت نظر آئی۔ سلام کیا۔ بیٹھنے کا اشارہ کیا، بیٹھ گئی۔ "آغا خوش آمدید" اب ان ہزاروں قمقموں کی تیز روشنی میں جب چادر ہٹا کر گویا ہوئی تو مجھے حافظ شیرازی کا شعر یاد آگیا۔

روئے نگار در نظرم جلوہ می نمود
ورنہ دو بوسہ بر رخ مہتاب می زدم

۱۰

مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی

(پیدائش ۱۹۲۴ء)

حضرت مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی کے والد ماجد حافظ محمود صاحب اپنے وقت کے علمائے کبار میں سے تھے اور ساتھ ہی شیخ طریقت بھی۔ آپ کا خاندان ضلع لاڑکانہ کے ایک گاؤں "رئیس جو گوٹھ" میں عرصے سے آباد ہے۔ حضرت مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی اپنے اسی آبائی گاؤں میں ۴ر جون ۱۹۲۴ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا انتقال اس وقت ہوگیا تھا جب آپ صرف دو برس کے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد کے تلامذہ سے گھر پر حاصل کرنے کے بعد مولانا خوش محمد صاحب کے مدرسے واقع تحصیل میرو خاں میں داخل ہو گئے۔ کچھ روز یہاں پڑھنے کے بعد دارالعلوم گور سلیمان تحصیل قنبر، لاڑکانہ چلے گئے۔ اس مدرسے میں مولانا نے اپنے وقت کے مشہور عالم علامہ عبدالکریم صاحب سے علم حدیث اور درس نظامیہ کی کتابوں کے علاوہ علم طب بھی پڑھا۔ یہاں سے فیض یاب ہونے کے

بعد دارالعلوم دیوبند چلے گئے، اور یہاں مولانا حسین احمد مدنی سے علوم ظاہری اور باطنی کی تکمیل کی۔ ان سے مرید ہوکر روحانیت کے مدارج بھی طے کیے۔

۱۹۳۸ء میں دہلی تشریف لے گئے اور وہاں تین سال قیام کر کے مولوی فاضل، ادیب فاضل کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اس زمانے میں مولانا عبیداللہ سندھی بیت الحکمت دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی انقلابی تحریک اور تعلیمات کی ترویج و اشاعت میں منہمک تھے مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی نے ان کی نگرانی میں قرآن مجید اور حجۃ اللہ البالغہ کا مطالعہ کیا اور پھر مولانا عبیداللہ سندھی کی علمیت اور شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات سے اتنا متاثر ہوئے کہ اپنی زندگی کا مقصد ہی حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات کو پھیلانا قرار دیا۔ مولانا عبیداللہ سندھی سے اس وقت جو تعلقات پیدا ہوئے، وہ ہر منزل میں قائم رہے اور دونوں ایک دوسرے کے رفیق کار رہے۔

۱۹۴۱ء میں دہلی سے وطن واپس آکر مدرسہ دارالسادات میں پہلے شیخ الحدیث کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ تین سال تک یہاں درس و تدریس میں مشغول رہنے کے بعد "پیر جھنڈو" میں مولانا عبیداللہ سندھی کے پاس چلے گئے اور ان کے ساتھ رہ کر فلسفہ شاہ ولی اللہؒ پر مزید عبور حاصل کیا۔ ۱۹۴۲ء میں جمعیت الطلباء کی بنیاد رکھی اور سندھ کے مختلف مقامات پر دارالحکمت کی طرف سے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے علوم اور فلسفے پر درس دیتے رہے۔

قیام پاکستان کے بعد کراچی تشریف لے گئے اور سندھ مسلم کالج میں اسلامیات کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں حج بیت اللہ سے فراغت کے بعد، شام، عراق، لبنان، اردن وغیرہ اسلامی ممالک کا سفر کیا اور وہاں کے کتب خانوں سے مستفید ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد میں ریسرچ پروفیسر کی حیثیت سے متعین ہونے کے بعد بہت سی مذہبی، علمی اور ادبی خدمات انجام دیں۔

مولانا کی تصنیف و تالیف کی ابتدا اسی وقت سے ہو گئی تھی جب آپ دارالعلوم کوٹ سلیماں میں زیر تعلیم تھے۔ اسی زمانے میں ایک عربی کتاب مفید الطلبار لکھی تھی جو کتب خانہ دیوبند سے کئی مرتبہ چھپ چکی ہے، اور آج کل عربی مدارس کے نصاب میں شامل ہے آپ نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی عربی فارسی تصنیفات، سطعات، لمعات، تفہیم الٰہیہ پر حواشی، تعلیقات اور مقدمے لکھے ہیں جن سے آپ کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی کی تصنیفات زیادہ تر عربی اور فارسی زبان میں ہیں لیکن سندھی اور اردو میں بھی آپ نے کافی مضامین اور مقالے لکھے ہیں۔ سندھی زبان میں آپ کا مقالہ "قرآن مجید کے سندھی تراجم" رسالہ "نئین زندگی" کراچی میں شائع ہوا تھا اس کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر شمول نے اس کا انگریزی ترجمہ شائع کر کے بہت اچھے

لفظوں میں اس کے مصنف کی لیاقت اور قابلیت کا اعتراف کیا ہے۔

اردو میں مضمون نگاری کا آغاز مولانا نے قیام دہلی کے دوران ہی کیا تھا اور پھر بے شمار مضامین اور مقالے اردو میں لکھے جو ملک کے مختلف اخبارات و رسائل میں چھپتے رہے۔ آپ کے یہ مضامین زیادہ تر حضرت شاہ ولی اللہ کے فلسفے اور بعض دیگر علمی اور تاریخی مسائل سے متعلق ہوتے ہیں۔ ۱۹۶۴ء سے شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد سے اردو میں شائع ہونے والے علمی جریدے "الرحیم" کی ادارت آپ کے سپرد ہے جس میں آپ کے بڑے اہم علمی مقالے شائع ہوتے رہے ہیں۔

حضرت مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی اچھے مترجم بھی ہیں۔ انھوں نے کئی کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں اور اس سے بہت اچھی طرح عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تالیف "قصص انبیاء کے رموز اور ان کی حکمتیں" کا جو ترجمہ مولانا قاسمی نے کیا ہے اس کی کچھ سطور بطور نمونہ درج ذیل ہیں:-

"ایوب علیہ السلام نے نعمت، ثروت، آرام، عبادت اور نظافت میں نشوونما پائی۔ پھر وہ اپنی قوم کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے۔ یہ ان کو نیکی کا حکم دیتے تھے اور برائیوں

---

[1] قصص انبیاء کے رموز اور ان کی حکمتیں" مؤلفہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ مترجمہ مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی۔ مطبوعہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد سندھ۔ بار اول ۱۹۶۹ء صفحہ ۹۱

سے روکتے تھے اور ان کو ملت حنیفی کی طرف بلاتے تھے
قوم کے فقراء اور مساکین کی حاجت روائی کرتے تھے۔ پھر
موافق ہو گئے اسباب سماوی مصیبت پہنچانے پر ان کے
مال و اہل و عیال اور جسم سب ہیں۔ اور اس وقت بھی ان کے
پروردگار کی ان پر عنایتیں تھیں کہ ان پر خیر کا فیضان ہوتا تھا
اور ان کو قلبی اطمینان تھا .... جب ان کی مصائب
جاتی رہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی نعمتیں برسائیں اور
جو رحمت پوشیدہ تھی وہ ظاہر ہوئی۔"

حضرت مولانا قاسمی کے انداز تحریر اور اسلوب نگارش کے نمونے
کے طور پر ان کے مقالے "شاہ ولی اللہ کی تالیفات پر ایک نظر" سے
کچھ اقتباسات اس جگہ درج کئے جاتے ہیں۔ یہ بسیط مقالہ کئی قسطوں
میں ستمبر ۶۵ء سے جون ۱۹۶۶ء تک رسالہ الرحیم میں شائع ہوتا رہا[2]
اس مقالے میں مولانا نے شاہ صاحب کی گیارہ تالیفات پر خاطر خواہ
روشنی ڈالی ہے:

"شاہ صاحب کی جملہ تالیفات میں سے یہ معرکتہ الآراء

---

[1] قصص انبیاء کے رموز اور ان کی حکمتیں"، مؤلفہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ مترجمہ، مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی، مطبوعہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد سندھ، بار اول ۶۹ء ص ۹۱

[2] رسالہ الرحیم مطبوعہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد سندھ، بابت جون ۱۹۶۶ء ص ۳۱

اور علمی شہرت کی کتاب ہے۔ اور یہ بھی سفر حرمین سے
واپسی کے بعد کی تالیف ہے اور علم حدیث کے "اسرار دین"
کے فن میں داخل ہے۔ مؤلف امام علم حدیث کے درجات
پر بحث کرتے ہوئے اس کتاب کے مقدمے میں رقم طراز
ہیں (ترجمہ) ہمارے نزدیک حدیثوں کے متعلق تمام
فنون میں سب سے زیادہ باریک اور گہری بنیاد والا، اور
دور دور تک روشنی پہنچانے والا فن اور اسلام کی
شریعت کے ساتھ تعلق رکھنے والے تمام علموں میں
سب سے اونچے درجے کا علم وہ ہے جس کا نام ہم
"علم اسرار دین" رکھتے ہیں۔ اس علم میں اس بات پر بحث ہوتی
ہے کہ حدیثوں میں جو حکم دیئے گئے ہیں وہ کیوں دیئے
گئے ہیں، ان میں کیا کیا حکمتیں ہیں؟ وہ کیا ضرورتیں ہیں
جن کی وجہ سے حکموں میں درجے پیدا کئے ہیں یعنی کسی کو
کم ضروری اور کسی کو بہت ہی ضروری بتایا
گیا ہے۔"

حضرت مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب تحقیق و انتقاد
کے لحاظ سے بہت ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی کی
طرح، حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات اور افکار سے بہت زیادہ
متاثر ہیں۔ تحریر میں عالمانہ وقار، تحقیقی موشگافیاں اور منطقیانہ استدلال

پایا جاتا ہے۔

زبان بہت صاف، سلیس، عام فہم اور رواں لکھتے ہیں۔ دہلی میں قیام کے باعث اردو زبان خاصی نکھر گئی ہے۔ ان کی اردو تحریر میں، اہل زبان کی سی خود اعتمادی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ اپنے مضامین میں اقتباسات اور حوالے بڑی چابک دستی سے پیش کرتے ہیں۔ بے ضرورت عربی فارسی کے ثقیل الفاظ استعمال نہیں کرتے۔

۱۱

"حضرت پیر مصطفیٰ صبغتہ اللہ شاہ ایرانی"

(پیدائش۔ سنہ ۱۳۱۸ھ)

۱۹۰۰ء

حضرت پیر مصطفیٰ صبغتہ اللہ شاہ کے والد ماجد حاجی علی آقا سرہنگ ایران میں شاہی فوج کے اعلیٰ افسر تھے۔ لیکن بعد میں خاندان قاچاریہ کے بادشاہ ناصرالدین شاہ شہید کے دربار میں وزیر خزانہ مقرر ہوئے اور آخر میں آذربائیجان کے تین صوبوں کی گورنری کے منصب پر فائز ہوئے۔ ناصرالدین شاہ قاچار کے شہید ہو جانے کے بعد آپ نے شاہی خدمت سے علیحدگی اختیار کی اور خدمت خلق اور عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ [1]

---

[1] حیات صبغتہ اللہ شاہ مترجمہ حکیم ذوقی مطبوعہ کراچی سنہ ۱۹۷۱ء، ص۱۰

حضرت صبغت اللہ شاہ کی پیدائش ایران میں بماہ ربیع الاول
جمعہ کے روز ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء کو بوقت سحر ہوئی۔ مقتدر علماء نے
غور وتامل اور قرآن پاک کے تفاؤل سے مصطفےٰ نام منتخب کیا۔ آپ کے
انا نوری خاندان کے برگزیدہ افراد میں سے تھے، جن کی فارسی تصانیف
ج بھی علمائے عظام کے لئے سرچشمہ علم وہدایت ہیں۔

سلطنت قاچاریہ کے زوال کے بعد جب رضا شاہ پہلوی سریر آرائے
لطنت ہوئے تو انھوں نے ۱۳۳۸ھ / ۱۹۱۹ء میں مصطفےٰ صبغت اللہ شاہ کو پہلے
وج کے دفتر محاسبات کا نائب اول اور پھر فوج حساب کا افسر اعلیٰ مقرر
رمایا۔ یکایک آپ کی طبیعت عشق الٰہی کی طرف مائل ہوئی۔ سیر وسلوک
ور قرب الی اللہ کی تشنگی جب بہت تیز ہوگئی تو ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳-۳۴ء میں آپ
ران حضرت آقا شمس العرفا رحمۃ اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت
سے مشرف ہوئے۔ کچھ دنوں تک ظاہری اور باطنی دونوں گرانباریوں کو
ستقلال سے اٹھاتے رہے۔ دن کو فوجی خدمت کرتے اور رات کو پیر طریقت
خدمت میں حاضر رہ کر عبادت وریاضت میں مشغول رہتے۔ اسی طرح
سال گزرا تھا کہ آپ کے پیر حضرت شمس العرفاؒ نے ایک دن فرمایا کہ:

"بچہ مصطفےٰ! تمھارے لئے ترک وطن کر کے ہندوستان
کا سفر کرنا ناگزیر ہے۔ تمہاری قسمت کا خزانہ اور حصے کی دولت
وہاں رکھی گئی ہے۔ تم ہندوستان جاؤ اور وہ خزانہ اور
دولت حاصل کرو۔"

ان کلمات نے ہندوستان پہنچنے کا ایسا شوق پیدا کیا کہ سب کچھ
چھوڑ کر اور علائق دنیوی سے منہ موڑ کر کئی ماہ تک صحرانوردی کرنے کے بعد
۱۹۲۰ء میں موہڑہ شریف پہنچے اور حضرت سجادہ نشیں کی خدمت میں
شرف یاب ہوئے۔ پیر صاحب موہڑہ شریف نے بڑی شفقت سے
پذیرائی کی اور چار سال تک ساتھ رکھ کر روحانی منزلیں طے کراتے رہے۔
جس وقت حضرت صبغت اللہ شاہ موہڑہ شریف وارد ہوئے تھے۔ اس
وقت سوائے فارسی کے اور کسی زبان سے واقف نہیں تھے لیکن چار سال
کے قیام میں وہ اردو اور پنجابی سے اچھی طرح واقف ہوگئے۔ چار سال کے
بعد ایک رات حضرت موہڑہ شریف قدس اللہ سرہٗ نے ان کو بلا کر فرمایا:

"دو سلسلوں[1] (نقشبندیہ اور سہروردیہ) میں آپ کی تعلیم
پوری ہوئی اور آپ نے ان میں کمال حاصل کر لیا اور ابھی
دو سلسلوں کا سلوک ناتمام ہے۔ میں نے چاہا کہ آپ کو
چاروں سلسلوں میں کمال حاصل کرنے اور کمال تک پہنچانے
کے قابل ہو جانے کے بعد رخصت کروں لیکن آپ کی
والدہ اور چھوٹی بہن کا رنج وغم، جو آپ کی جدائی میں انھیں
لاحق ہے اتنا بڑھ گیا ہے کہ میں اسے برداشت نہیں
کر سکتا۔ اب تم ایران جاؤ اور اپنی ماں اور بہن کو خوش

---

[1] حیات صبغت اللہ شاہ ص ۵۶

کرو. اگر خدا کے حکم سے واپس آؤ گے تو باقی دو سلسلوں
(چشتیہ و قادریہ) میں بھی کمال حاصل کر لینا۔ میں تمھیں
طریقہ نقشبندیہ اور سہروردیہ میں بیعت کرنے کی اجازت
دیتا ہوں۔"

اپنے مرشد کے اس حکم کے بعد وہ فوراً ایران روانہ ہو گئے اور وہاں ایک سال ٹھہر کر اپنی والدہ کی خدمت اور خاندان کی دلجوئی کرتے رہے، پھر جب ہندوستان واپس ہونے لگے تو ان کی چھوٹی بہن جو ان سے بہت محبت کرتی تھیں، اصرار کر کے ساتھ ہو گئیں، اور یہ دونوں بھائی بہن بذریعہ بحری سفر کراچی تشریف لائے. کراچی سے پشاور ہوتے ہوئے موہڑہ شریف پہنچے، وہاں ساڑھے تین سال مزید قیام کر کے تعلیم باطنی سے فیض یاب ہونے کے بعد اپنے مرشد کے حکم سے سندھ روانہ ہوئے. روانگی کے وقت آپ کے مرشد نے فرمایا کہ :-

"میرے عزیز! پہلے تم کو سلسلہ نقشبندیہ اور سہروردیہ میں
اجازت دی تھی اب سلسلۂ چشتیہ اور قادریہ میں بھی تم مقامات
طے کر کے حد کمال کو پہنچے ہو۔ ان دونوں سلسلوں میں بھی
ہم تم کو اجازت دیتے ہیں، ان ہی چار سلسلوں میں طالبوں
کی استعداد کے مطابق بیعت لو۔ میں صوبہ سندھ، کی

لہ حیات صبغۃ اللہ شاہ ص۶۹

ولایت تمھارے سپرد کرتا ہوں۔ جاؤ وہاں اپنا تصرف قائم کرو
مشیت ایزدی کے مطابق وہاں کی مخلوق تمھاری محتاج و منتظر
ہے۔ صوبہ سندھ کا ایک متوسط شہر تمھارا مرکز ہوگا۔ اپنی
مسند رشد و ہدایت پر قائم ہو جاؤ۔ اور سنو! مجھے معلوم
ہوا ہے کہ شروع زمانے میں ہی تم وہاں نکاح کرو گے. کچھ
روز کے لئے سندھ سے باہر جانا بھی مقدر ہو چکا ہے
...... جب واپس سندھ آؤ گے تو اچھی زندگی بسر کرو گے
اور بے شمار مخلوق تم سے فیض یاب ہوگی. سندھ کے عوام
سادہ لوح و کم آمیز ہیں .... میں تم سے دور نہیں
ہوں. جب مجھے یاد کرو گے اپنے قریب پاؤ گے

موہڑہ شریف سے رخصت ہو کر حضرت پیر صبغۃ اللہ شاہ جہلم ہوتے ہوئے ۱۹۳۹ء میں جمعرات کے دن سکھر پہنچے. ایک سال بعد سکھر میں سردار محمد علی خاں نے اپنی صاحبزادی کو آپ کے عقد زوجیت میں دینے کا خود ارادہ کیا جسے آپ نے اپنے مرشد کی پیشین گوئی کے مطابق پا کر قبول فرمایا. شادی کے بعد آپ اپنی بیگم اور ہمشیرہ کے ساتھ حیدرآباد چلے آئے اور رشد و ہدایت اور خدمت خلق میں مصروف ہو گئے.

حضرت پیر صبغۃ اللہ شاہ نے موہڑہ شریف کے قیام کے دوران ہی اردو سیکھنی شروع کر دی تھی. پھر جب سکھر اور حیدرآباد میں مستقل قیام پذیر ہو گئے تو یہاں کے ماحول کے تحت اردو پر پوری قدرت حاصل کر لی.

اور اب وہ بہت سلیس اور شگفتہ اردو بولتے اور لکھنے پر قادر ہیں فارسی کے علاوہ اردو میں بھی اشعار موزوں فرماتے ہیں۔ بقول حکیم ذوقی مصطفائی صاحب :-

"ہمارے[1] حضرت صاحب ابتدا سے اپنی مادری زبان میں تو شعر فرماتے ہی تھے لیکن پاکستانی قومیت اختیار کرنے کے بعد آپ نے اردو میں بھی کہنا شروع کیا۔"

حضرت پیر صبغتہ اللہ صاحب نے مذہب کے ساتھ اردو زبان کی بھی کافی خدمت کی اور کر رہے ہیں۔ اپنے مریدوں کے درمیان ان کے رشد و ہدایت کا وسیلہ اردو ہی زبان ہے۔ عبادت و ریاضت اور رشد و ہدایت میں غیر معمولی مشغولیت کے باعث آپ کو تالیف و تصنیف کا موقع نہیں ملتا بلکہ صورت یہ ہے کہ آپ اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کے حلقے میں اپنی تعلیمات اور بعض نکات تصوف کو اردو زبان میں سمجھاتے جاتے ہیں اور ان کے مریدین ان کو ٹیپ ریکارڈ کے ذریعے محفوظ کر لیتے ہیں اور پھر انھیں لکھ لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس طرح کا ایک مجموعہ "مینائے مصطفائی" کے نام سے ۱۹۶۰ء میں ادارہ المصطفٰے گنج بخش شاہ پیر حیدر آباد سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے مرتب حکیم ذوقی مصطفائی صاحب اس کے مقدمے میں لکھتے ہیں :-

---

[1] حیات صبغتہ اللہ از حکیم ذوقی مصطفائی ص ۱۵۲

"چونکہ[1] ہمارے اعلیٰ حضرت مد فیوضہم حاضرین حلقہ کی ضروریات اور ان خطرات باطنی کا لحاظ کرکے بلا تامل انکشافات علمی و روحانی فرماتے ہیں اس لئے ان مواعظ میں ایک عجیب شان برجستگی اور کیفیت "تازہ بتازہ نو بہ نو" پیدا ہو جاتی ہے جو سامعین کیلئے حد درجہ سرور انگیز اور کیف آفریں ہوتی ہے اس لئے اہل حلقہ حضرات ہی نے اس کا نام مینائے مصطفائی رکھا۔ مینائے مصطفائی کے مختلف ابواب ساغر کے نام سے پکارے گئے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب ۲۹ ساغر پر مشتمل ہے اور پھر ہر ایک ساغر میں کئی ایک عنوان کے ماتحت تصوف اور سلوک کی باتیں بتائی گئی ہیں۔ ساتھ ہی ان خطرات سے بھی آگاہ کیا گیا ہے جو راہ طریقت میں سالک کو پیش آ سکتے ہیں :"

اب ہم ایک دو اقتباسات اس کتاب مینائے مصطفائی سے پیش کریں گے جن سے حضرت پیر صبغتہ اللہ شاہ کی اردو زبان پر قدرت کا اندازہ ہوگا :-

"رضائے[2] الٰہی، جو شخص حقوق العباد اور حقوق نفس انجام

---

[1] حیات صبغتہ اللہ از حکیم ذوقی مصطفائی ص ۱۵۲

[2] مینائے مصطفائی مطبوعہ ۱۹۶۰ء ص ۲-۳

دیتا ہے، کسی کی حق تلفی نہیں کرتا۔ اپنے لئے ایک صحیح نصب العین مقرر کرتا ہے۔ من جانب اللہ جو اوامر و نواہی ہیں ان کی حفاظت کرتا ہے جو چیز طلب اور ادائے حقوق کے لئے رکاوٹ ہے اس کو دور کرتا ہے اور متقی ہو جاتا ہے تو نتیجتًا ایسا شخص اپنے نفس پر غالب آجاتا ہے، نفس کو دبا لیتا ہے۔ حق نفس ادا کرتا ہے مگر اس کو حصہ دار نہیں بناتا۔ خدا کی مرضی پر چلتا ہے۔ رضائے الٰہی پر راضی رہتا ہے۔ ایسا شخص محسوس کرتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ میرے ساتھ محبت اور دوستی کا اظہار کرتا ہے۔ ہر چیز میرے لئے سامانِ آسائش و راحت فراہم کرتی ہے اس لئے تم کو چاہیئے کہ مادی لذت اندوزی کی بجائے رضائے الٰہی کی جستجو کرو تاکہ عرفان مسرت و راحت حاصل ہو مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ مادیات سے دست بردار ہو کر اس کو نظر انداز کیا جائے؟

صوفیائے کرام کے طریقۂ دعوت پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"صوفیائے کرام[1] پہلے اپنے نفس کو امر معروف اور نہی عن المنکر

---

[1] مینائے مصطفائی ص ۱۵۵

کے ذریعہ مرتبۂ کمال پر پہنچا لیتے ہیں تو خصوصیت کے ساتھ دوسروں کے امر معروف اور نہی عن المنکر پر مامور کئے جاتے ہیں اور صرف ان ہی کمالات کی طرف دعوت دیتے ہیں جن کے وہ خود مالک ہوتے ہیں۔ وہ ایسی بات منہ سے نہیں نکالتے جس پر وہ خود عامل نہ ہوں، جیسا کہ قرآن کریم کی تعلیم ہے۔ لِمَ تقولون ما لا تفعلون (یعنی تم وہ بات کیوں کہتے ہو جسے خود نہیں کرتے)

پیر صاحب کی ایک اردو غزل بھی جو علامہ اقبال کے رنگ میں کہی گئی ہے بطور نمونہ درج ذیل ہے ؎

تماشہ چرخ کا کہاں ہوتا اگر میں بے زباں ہوتا
مری محفل نہ ہوتی تو کہاں تیرا بیاں ہوتا

اگر انساں نہ ہوتا بزمِ عالم کالعدم ہوتی
نہ جاں میں جان ہوتی اور نہ عالم کا نشاں ہوتا

فقط میں ہوں جو تیرے حسن کے ہر رخ کا محرم ہوں
مری نظریں نہ ہوتیں تو ترا جلوہ کہاں ہوتا

متاعِ درد بھی اے مصطفٰے معراج تھی دل کی
یہ غم انسان سہہ لیتا جو جنت کا سماں ہوتا

۱۲

"قاضی علی اکبر درازی"

(پیدائش ۱۸۹۵ء)

حضرت قاضی علی اکبر درازی سندھ کے ایک ممتاز اور ذی علم خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مغل بادشاہ غازی محمد شاہ نے آپ کے جد اعلیٰ شیخ خیر الدین ولد شیخ محمد کو قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز کیا تھا قاضی شیخ خیر الدین اس منصب کے بعد بھکر سے ملتان منتقل ہو گئے تھے پھر جب سندھ پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو انگریز گورنر سر چارلس نیپئر کے حکم سے وہ روہڑی چلے آئے اور ان کا خاندان یہیں متوطن ہے۔

قاضی اکبر علی درازی ۲۸ر جولائی ۱۸۹۵ء کو یہیں روہڑی میں پیدا ہوئے آپ کے والد قاضی علی محمد صاحب کا شمار روہڑی کے عمائدین میں ہوتا ہے ابتدائی تعلیم روہڑی پرائمری اسکول سے ختم کرنے کے بعد وہ گورنمنٹ ہائی اسکول سکھر میں داخل ہوئے اور ۱۹۱۶ء میں یہیں سے میٹرک پاس کیا پھر ریونیو ڈپارٹمنٹ میں ملازم ہو گئے اور اب ریٹائر ہونے کے بعد

خدمت خلق میں لگے رہتے ہیں۔

قاضی صاحب کو شروع ہی سے علم و ادب اور تصوف سے لگاؤ تھا۔ جوان ہونے کے بعد عرفان الٰہی کی روشنی آپ نے حضرت سچل سرمست کی تعلیمات سے حاصل کی اور ان کی عقیدت میں سرشار ہو کر درگاہ دراز شریف سے وابستہ ہو گئے۔ اسی سلسلے میں مرید ہو کر غالباً انھوں نے اپنے نام کے آخر میں درازی کا اضافہ کر لیا ہے۔ اپنے مرشد کی ہدایت کے مطابق آپ کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد حضرت سچل سرمست کی تعلیمات کو عام اور ان کے کلام کو عوام میں روشناس کرنا ہے۔ چنانچہ سندھی اور اردو میں آپ کی متعدد تصانیف حضرت سچل سرمستؒ کی سوانح اور تعلیمات سے متعلق ہیں۔ انھوں نے ان کے فارسی اور سندھی کلام کو روشناس خلق کرنے کے لئے بڑی کوششیں کی ہیں۔ وہ خود بھی شاعر ہیں اور غلام اکبر تخلص فرماتے ہیں۔ ان کے سندھی اور سرائیکی زبان کے اشعار کا مجموعہ دیوان غلام اکبر کے نام سے موجود ہے۔

قاضی صاحب ایک خدا ترس اور صوفی منش بزرگ ہیں۔ کتب بینی عبادت و ریاضت، تالیف و تصنیف اور خدمت خلق آپ کے مشاغل میں داخل ہیں۔ سندھی، اردو اور انگریزی زبان پر اچھی قدرت رکھتے ہیں۔ سندھی زبان میں تو آپ کا شمار صاحب طرز انشا پردازوں اور ادیبوں میں ہے۔ اردو بھی بہت سلیس اور رواں لکھتے ہیں۔ سندھی زبان میں اپنی مندرجہ ذیل اکیس کتابوں کی فہرست خود آپ نے حوالے کی ہے:-

(۱) دولھ درازی (۲) داتا درازی (۳) درد جو داستان (۴) عشق حبیب (۵) قرۃ العین رسول (۶) بیعت رضوان (۷) فاتح سندھ (۸) سخن سرتاج دفعہ اول (۹) سخن سرتاج دفعہ دوم (۱۰) سوانح حیات سردار بہادر محمد بخش (۱۱) دیوان غلام اکبر (۱۲) شہنشاہ عشق (۱۳) سرتاج الشعراء (۱۴) سفر نامۂ ایران و عراق (۱۵) مثنوی عشق نامہ (۱۶) درد نامہ (۱۷) گداز نامہ (۱۸) تار نامہ (۱۹) رہبر نامہ (۲۰) راز نامہ (۲۱) دیوان خدائی۔

اردو میں ان کے مندرجہ ذیل مطبوعہ مقالے موجود ہیں :۔

(۱) شاعر ہفت زباں (۲) مختصر سوانح حیات (۳) شاعر اعظم و مفکر (۴) سرتاج الشعراء۔

حضرت قاضی علی اکبر درازی کی نثر کا نمونہ ان کے ایک مقالے "سچل سرمستؒ سندھ کا اردو شاعر" سے درج ذیل ہے :۔

سچل سرمست کا کلام سراپا الہام، محبت و سوز، درد و گداز کیف و حال، جذب و جلال، موج و مستی، کے فلسفے کا ایک بھرپور گنجینہ ہے جو بیخودی و سرمستی کے عالم میں کہا گیا ہے .... اور شعر میں جو نازک خیالی دکھائی گئی ہے وہ قابل قدر ہے۔ ان ہی حالات کے تحت آپ کو شہنشاہ عشق اور منصور ثانی کہا جاتا ہے۔ سرمست نے جب منصوری نعرہ بلند کیا تو علماء نے ان کو تعزیر دینے کا ارادہ

کیا۔ حضرت سرمستؒ نے کہا کہ جس وقت میری زبان سے "انا الحق" کا نعرہ سنیں، اس وقت مجھے قتل کر دیں۔ اس اثنا میں انھیں حال آگیا اور ان کی زبان سے انا الحق" نکلنے لگا۔ علماء نے ان پر تلوار کے کتنے وار کئے لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جب حال کی کیفیت باقی نہ رہی تو علماء نے ان کو تمام حقیقت سے آگاہ کیا۔ سرمستؒ نے کہا یہ نعرہ میں نہیں لگاتا بلکہ ذات باری لگاتی ہے۔ چنانچہ ایک اور جگہ اپنے فارسی کلام میں فرمایا :۔

ع من نمی گویم یار می گوید بگو

جیسا کہ قاضی صاحب کی فہرست اور نمونۂ نثر سے ظاہر ہوتا ہے آپ کا مذاق خالص مذہبی اور صوفیانہ ہے۔ آپ کے اسلوب تحریر میں بڑی شگفتگی، روانی، سلاست اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ آپ نے مذہب اور تصوف کے ساتھ اردو زبان کی بھی بڑی خدمت کی ہے۔ آپ کو اردو زبان سے بڑی محبت ہے۔

۱۴

مولانا عبیداللہ سندھی

۱۸۷۲ء ـــــــ ۱۹۴۴ء

برصغیر پاک وہند کے مشہور عالم دین، مفسر، صوفی اور اہل الرائے مولانا عبیداللہ سندھی کے آبا و اجداد مذہبی طور پر ہندو اور سکھ تھے۔ آپ کے والد کا نام رام سنگھ تھا جو سکھوں کے دور اقتدار میں اپنے گاؤں "جیانوالی" کے مختار کار، تھے اور دادا جنت رائے "کاردار" تھے جیسا کہ وہ خود نوشت حالات زندگی میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"میں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں (جیانوالی) میں پیدا ہوا۔ ہمارے خاندان کا اصلی پیشہ زرگری تھا، لیکن عرصے سے ایک حصہ سرکاری ملازمت میں شامل ہو گیا اور بعض افراد ساہوکارہ بھی کرتے تھے۔

۱؎ کابل میں سات سال، مطبوعہ سندھ ساگر اکاڈمی، لاہور ۱۹۵۵ء صہ ۹۴

میں عموماً سلمان فارسیؓ کے اتباع میں اپنا نام عبیداللہ بن اسلام لکھا کرتا ہوں مگر بعض عرب دوستوں کے اصرار سے جب اپنا نام والد کی طرف منسوب کر کے لکھنا پڑا تو عبیداللہ بن ابی عائشہ۔ میری بڑی ہمشیرہ کا نام جیونی تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اگر کسی نے اس سے زیادہ تصریح کے لئے کہا تو عبیداللہ بن راما بن رائے لکھوں گا۔ میرے باپ دادا کا پورا نام رام سنگھ ولد جسپت رائے ولد گلاب رائے ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے دادا سکھ حکومت میں اپنے گاؤں کے کاردار تھے۔

مولانا سندھی اسی سکھ گھرانے میں ۱۰/ مارچ ۱۸۷۲ء کو مغربی پاکستان کے ایک گاؤں جیانوالی ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تھے۔ خود لکھتے ہیں:

"میں شب ۱؎ جمعہ قبل صبح ۱۲/ محرم ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۰/ مارچ ۱۸۷۲ء کو پیدا ہوا۔ میرا باپ چار ماہ پہلے فوت ہو چکا تھا دو سال بعد دادا بھی مر گیا تو میری والدہ مجھے ننھیال میں لے آئی۔ یہ ایک خالص سکھ خاندان تھا۔ میرے نانا کی ترغیب پر ہی میرا والد سکھ بن گیا تھا

اللہ جب کسی کو تاریکی سے نور کی طرف لانا چاہتا ہے اور سیدھی

۱؎ کابل میں سات سال، صہ ۹۴

وہ دکھانا چاہتا ہے تو اس کے سامان مہیا کر دیتا ہے۔ ۱۸۸۴ء میں اسکول
کے کسی ساتھی سے مولانا سندھی کو تحفۃ الہند مل گئی۔ پھر شاہ اسماعیل شہید
کی تقویۃ الایمان اور مولوی محمد کی کتاب الآخرۃ پڑھی۔ ان کتابوں کے مطالعے
سے ان کی دنیا بدل گئی۔ وہ اسلام کے شیدائی بن گئے اور گھر چھوڑ کر ایک
رفیق عبد القادر کے ساتھ سندھ کی جانب روانہ ہو گئے اور پھر چونڈی (ضلع
سکھر) میں سید العارفین حافظ محمد صدیق کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف
بہ اسلام ہوئے اور پھر ان ہی سے قادریہ راشدی سلسلے میں مرید بھی ہوئے
ان باتوں کی تفصیل مولانا نے اس طرح لکھی ہے :-

"۱۸۸۴ء [1] میں مجھے اسکول کے ایک آریہ سماج لڑکے کے ہاتھ
سے تحفۃ الہند ملی۔ میں اس کے مسلسل مطالعے میں مصروف
رہا اور بالتدریج اسلام کی صداقت پر یقین بڑھتا گیا۔ ہمارے
قریب کے پرائمری اسکول (کوٹلہ مغلان) سے چند ہندو
دوست بھی مل گئے، جو میری طرح تحفۃ الہند کے گرویدہ
تھے۔ انھیں کے توسط سے مجھے مولانا اسماعیل شہید رح
کی تقویۃ الایمان ملی۔ اس کے مطالعے پر اسلامی توحید
اور پرانک شرک اچھی طرح سمجھ میں آگیا۔ اس کے بعد مولوی محمد
صاحب لکھو کی کتاب احوال الآخرۃ (پنجابی) ایک مولوی صاحب

---

[1] کابل میں سات سال ص ۹۵-۹۶

سے ملی، اب میں نے نماز سیکھ لی۔ اور اپنا نام
تحفۃ الہند کے مصنف کے نام پر عبید اللہ خود
تجویز کیا۔
۱۵ راگست ۱۸۸۷ء کو توکلاً علی اللہ نکل کھڑا ہوا میرے
ساتھ کوٹلہ مغلان کا ایک رفیق عبد القادر تھا۔ ہم
دونوں عربی مدرسے کے ایک طالب علم کے ساتھ
کوٹلہ مہر شاہ ضلع مظفر گڑھ میں پہنچے۔ ۹ ر ذی الحجہ
۱۳۰۴ھ کو میری سنت تطہیر ادا ہوئی۔ اس کے چند
روز بعد جب میرے اعزار تعاقب کرنے لگے تو میں
سندھ کی طرف روانہ ہو گیا .... سندھ میں
حافظ محمد صدیق صاحب (بھر چونڈی والے) کی خدمت
میں پہنچ گیا۔ جو اپنے وقت کے جنید اور سید العارفین
تھے۔ چند ماہ ان کی صحبت میں رہا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا
کہ اسلامی معاشرت میرے لئے اس طرح طبیعت ثانیہ
بن گئی جس طرح ایک پیدائشی مسلمان کی ہوتی ہے۔
حضرت نے ایک روز میرے سامنے اپنے لوگوں
کو مخاطب فرمایا، کہ عبید اللہ نے اللہ کے لئے ہم کو اپنا
ماں باپ بنایا ہے۔ اس کلمہ مبارک کی تاثیر خاص طور
پر میرے دل میں محفوظ ہے میں انھیں اپنا دینی باپ

سمجھتا ہوں اور محض اس لئے سندھ کو مستقل وطن بنایا
یا بن گیا۔ میں نے قادری راشدی طریقے میں حضرت
سے بیعت کر لی تھی۔"

مولانا سندھی عرصے تک گھوم گھوم کر اس وقت کے مشہور علما
سے اپنی علمی پیاس بجھاتے رہے۔ ۱۳۰۶ھ میں دیوبند پہنچ گئے اور وہیں
حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ کے درس میں شامل ہوئے۔ جامع ترمذی
مولانا شیخ الہند سے پڑھی پھر گنگوہ شریف جا کر مولانا رشید احمد گنگوہی
کے علم ظاہری و باطنی سے فیض یاب ہوئے۔ ۱۳ر جنوری ۱۸۹۱ء کو بھرچونڈی
اپنے مرشد سے ملنے حاضر ہوئے لیکن وہاں ان کے مرشد دس دن پہلے
وفات پا چکے تھے اس لئے اس سال شوال میں جب اپنے شیخ کے
خلیفہ مولانا ابوالحسن تاج محمود کے پاس امروٹ (ضلع سکھر) چلے گئے۔ وہاں
حضرت مولانا ابوالحسن تاج محمود نے ان کی شادی مولوی محمد عظیم خاں
کی صاحبزادی سے کر دی اور ان کی والدہ کو وہیں بلوا دیا۔

مولانا سندھی پر اپنے مرشد کے علاوہ حضرت شاہ رشید الدین
"العلم الثالث (پیر جھنڈو) کا بھی بہت زبردست اثر پڑا ہے۔ وہ
اپنے علم و فضل اور روحانیت کی ترقی کے لئے پیر جھنڈو اور ان کے
قیمتی کتب خانے کے بہت زیادہ مرہون منت ہیں۔

وہ خود لکھتے ہیں
"گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدر آباد میں راشدی طریقے کے
پیر صاحب کے پاس علوم دینیہ کا کتب خانہ تھا
میں دوران مطالعہ وہاں جاتا رہا اور کتابیں مستعار بھی
لاتا رہا۔ میرے تکمیل مطالعہ میں اس کتب خانے کے فیض
کا بڑا دخل تھا۔ اس کے علاوہ مولانا رشید الدین صاحب
العلم الثالث کی صحبت سے مستفید ہوا۔ میں نے ان کی
کرامتیں دیکھیں۔ ذکر اسماء الحسنیٰ میں نے ان ہی سے سیکھا
وہ دعوت توحید و جہاد کے ایک مجدد تھے۔"[1]

مولانا سندھی اپنے کاموں کے لئے پروگرام ہمیشہ حضرت شیخ الہند
کے مشورے سے مرتب کرتے تھے۔ ۱۸۹۷ء میں دیوبند جا کر انھوں نے
حضرت شیخ الہند سے ہدایت لے کر لائحہ عمل بنایا اور امر کوٹ میں
ایک مطبع قائم کر کے عربی اور سندھی کی بعض اہم اور نایاب
کتابیں چھاپیں۔ ہدایت الاخوان کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ نکالا۔
پھر ۱۹۰۱ء میں گوٹھ پیر جھنڈو حضرت شاہ رشد اللہ صاحب العلم الرابع)
کے نام پر ایک مدرسہ دار الرشاد کے نام سے قائم کیا اور سات
سال تک اس کے مہتمم رہے۔ ۱۹۰۹ء میں حضرت شیخ الہند کی طلبی پر
دیوبند پہنچے اور وہاں چار سال تک جمعیتہ الانصار میں کام کرتے رہے۔

---

[1] کابل میں سات سال"، از مولانا عبید اللہ سندھی۔ مطبوعہ
سندھ ساگر اکیڈمی لاہور، ۱۹۵۵ء، ص ۱۰۱

۱۹۲۶ء میں مولانا مکہ معظمہ پہنچ گئے، وہاں بارہ تیرہ سال قیام کرکے مولانا کو قرآن مجید، احادیث نبوی اور امام ولی اللہ دہلوی کی تصانیف کو اچھی طرح ذہن نشیں کرنے کا بہت اچھا موقع ملا۔ وہاں مدرسہ قرآن حکیم جاری کرکے آپ نے درس وتدریس کا بھی سلسلہ شروع کر دیا قیام مکہ کے دوران ہی آپ نے تفسیر المقام المحمود مرتب فرمائی۔ مکہ معظمہ میں اپنے علمی مشاغل کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"مجھے اہل مکہ میں سے تین ہندوستانی اور ایک عرب خاندان نے خاص طور پر علمی امداد دی۔ میں تقریباً بارہ تیرہ سال قرآن مجید اور حجۃ اللہ البالغہ کا بہ نظر عمیق مطالعہ کرتا رہا۔ تفسیر قرآن عظیم میں جس قدر مقامات میرے لئے مشکل تھے، اس زمانے میں انھیں امام ولی اللہ دہلوی کے اصول پر بالاطمینان حل کر سکا ....

میں نے امام ولی اللہ دہلوی کی مشہور کتابوں کا خاص طور پر مطالعہ جاری رکھا مثلاً، بدور بازغہ، خیر کثیر، تفہیمات الٰہیہ، سطعات، الطاف القدس، لمعات وغیرہ۔ ان کتابوں کیلئے بہ طور مفتاح میں نے مولانا رفیع الدین دہلوی کی تکمیل الاذہان اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کی عبقات اور مولانا محمد قاسمؒ کی

لہ۔ کابل میں سات سال، از مولانا عبیداللہ سندھی، سندھ ساگر اکیڈمی، لاہور

قاسم العلوم اور تقریر دلپذیر اور آب حیات کو استعمال کیا۔ مجھے لوگوں کے پڑھانے کا بھی موقع ملتا رہا اور ساتھ ہی مدرسہ قرآن حکیم بھی جاری رہا۔ اس سے میرے نظریات بہت وسیع ہو گئے۔ للہ الحمد"

مارچ ۱۹۳۹ء میں وہ ہندوستان واپس تشریف لائے، اور دل وجان سے ولی اللہی فلسفے کی تلقین وترویج میں مصروف رہے یہاں تک کہ ۲؍ رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ روز دوشنبہ مطابق ۲۱؍ اگست ۱۹۴۴ء کو بہ مقام دین پور (ریاست بہاول پور) داعئ اجل کو لبیک کہا۔

مولانا عبیداللہ سندھی ایک مفکر، عالم دین، مفسر اور خطیب کے ساتھ ایک اچھے ادیب بھی تھے۔ سندھی، فارسی، عربی اور اردو زبان پر ان کو پوری قدرت حاصل تھی۔ ان کی ساری زندگی جدوجہد میں گذری۔ وہ قوم کے نوجوانوں میں زندگی اور آزادی کی روح پھونک دینا چاہتے تھے۔ وہ غریبوں اور مزدوروں کے ہمدرد تھے۔ اسلام پر سختی سے پابند رہتے ہوئے وہ سوشلزم کی طرف مائل تھے۔ انھوں نے خطبات اور لیکچرز بہت دیئے، اور ملک کے مختلف حصوں میں گھوم گھوم کر دیئے ہیں جو کتابی شکل میں "خطبات ومقالات عبیداللہ سندھی" کے نام سے چھپ چکے ہیں، لیکن مولانا کا اصل میلان تفسیر قرآن کی طرف تھا۔ یا پھر وہ ولی اللہی حکمت اور تعلیم کو دنیا میں پھیلانے کی طرف راغب تھے۔ ان کی پہلی تفسیر تو وہ ہے جو انھوں نے پہلی جنگ عظیم سے

پہلے دہلی میں لکھی تھی۔ یہ تفسیر سندھ یونیورسٹی حیدرآباد اور دوسری جگہوں میں موجود ہے۔ اس کے بعد انھوں نے "المقام المحمود" کے نام سے تفسیر مکہ معظمہ میں لکھی جبکہ ان کا تجربہ، مشاہدہ اور علمی معیار بہت بڑھ چکا تھا۔ اس میں جدید فلسفہ اور سائنس کے اصول، سیاسیات اور تمدن وارتقائے ملل کی تعلیمات کی جھلک ملتی ہے۔ بقول ڈاکٹر عبدالواحد ہالیپوتہ:-

"اس[1] تفسیر میں یہ خصوصیت ہے کہ طبعیات اور جدید سائنس اور علوم کو بھی قرآنی مسائل کے سمجھنے کا ذریعہ بتایا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ قرآنی نقطۂ نظر سے ان کی اصلیت کا اندازہ لگانے کے راستے بھی دکھائے گئے ہیں۔ موجودہ زمانے میں جو مختلف حالات اور رجحانات پیدا ہو رہے ہیں ان سب میں قرآن پاک ہی سے ہدایت حاصل کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے ...... یہ تفسیر بعض دیگر تفسیروں سے مختلف ہے جن میں فقط شان نزول اور اسرائیلی قصے کہانیوں پر اکتفا کرنے کی وجہ سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید

[1] "المقام المحمود" از مولانا عبیداللہ سندھی کا پیش لفظ ص ب مطبوعہ سندھ یونیورسٹی پریس حیدرآباد ۱۹۵۹ء۔

قرآن فقط مخصوص مواقع اور گذشتہ زمانے کے لئے ہی نازل ہوا تھا، لیکن اس تفسیر سے قرآن شریف کی تعلیمات کی عمومیت اور بین الاقوامیت ظاہر ہوتی ہے۔ اس تفسیر میں بعض جگہ بہت بڑے بڑے مضامین اعلیٰ افکار اور دقیق مسائل بھی زیر بحث ہیں اس وجہ سے بعض مواقع قدرے مشکل معلوم ہوتے ہیں...... ہر مفکر اور مفسر کا کوئی نہ کوئی علمی اور ذہنی موقف ہوتا ہے۔ اس تفسیر میں مولانا عبیداللہ صاحب کا علمی اور فلسفیانہ موقف، شاہ ولی اللہؒ کی حکمت اور فلسفہ وتعلیم ہے۔ اسی وجہ سے شاہ ولی اللہؒ کی حکمت کی بہ کثرت اصطلاحات اور الفاظ مستعمل ہیں۔"

اس تفسیر کے علاوہ اردو میں مولانا کی کئی اہم تصانیف ہیں جن میں مندرجہ ذیل کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں:-

(۱) شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ

(۲) شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک

(۳) قرآن مجید کا مطالعہ کیسے کیا جائے۔

(۴) دیباچہ شرح حجۃ اللہ البالغہ

(۵) کابل میں سات سال معہ خود نوشت حالات زندگی

نمونہ نشر کے طور پر مولانا کی تصانیف سے کچھ اقتباسات

درج ذیل ہیں :-

"میں ایک عالم گیر سیلاب کو اپنی آنکھوں سے اٹھتا
دیکھ آیا ہوں ...... یہ سیلاب موسمی جھکڑ نہیں کہ آیا
اور نکل گیا۔ یہ عہد حاضر کے تاریخی تقاضوں کا قدرتی
نتیجہ ہے۔ انقلاب کا یہ سیلاب پیچھے ہٹنے والا نہیں
...... دنیا ایک نئے طوفان نوح سے دوچار ہوا
چاہتی ہے۔ بادل گھر چکے ہیں۔ گھٹائیں برسنے ہی کو
ہیں۔ طوفانوں کو اٹھتے اب زیادہ دیر نہیں لگے گی لیکن
میں دیکھتا ہوں کہ تمھیں نہ تو ان طوفانوں کی کچھ خبر
ہے اور نہ تم یہ جانتے ہو کہ اگر یہ طوفان بہہ نکلے تو تمھارا
کیا حشر ہوگا ...... یہ انقلاب جسے میں اپنی آنکھوں
سے برسرکار دیکھ آیا ہوں انسانیت کے ان پس ماندہ
طبقوں کو للکار رہا ہے کہ اٹھو! غاصبوں سے اپنا حق
چھینو اور جو ظلم پر جی رہے ہیں انھیں نیست و نابود
کر دو۔"

"شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" کے بارے میں اپنے

لہ خطبات و مقالات مولانا عبید اللہ سندھی مطبوعہ سندھ ساگر اکیڈمی لاہور ۱۹۷۰ء ص ۱۳-۱۷

ایک خطبے میں وہ اس طرح لکھتے ہیں :-

"ہمارے دوست عام طور پر چاہتے ہیں کہ جب سے
ہند میں واپس آئے ہم نے کسی سیاسی جماعت
سے پورے اشتراک کا کبھی ارادہ نہیں کیا بلکہ
ایک ایسے فکر کی دعوت دیتے رہے جو ملک کی
عام ذہنیت سے بہت دور ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے
کہ جو پارٹی امام ولی اللہ کی فلاسفی پر بنے گی وہی ہماری
وطنی، ملی ضرورتیں پوری کرے گی۔ ہمارا یہ فکر اور زمانے
کی فضا کہ اہل علم بھی نہیں جانتے ہیں کہ امام ولی اللہ واقعی
فلاسفر تھے یا انھوں نے کوئی ایسا سیاسی تخیل پیدا
کیا ہے جو آج جمہور کے ترقی کن طبقے کے مزاج سے
سازگار ہو سکتا ہے"

حضرت مولانا کی تحریر میں فلسفیانہ اور متکلمانہ انداز پایا جاتا ہے
وہ ہر بات کو وضاحت سے بیان کرتے ہیں اور اس کے سمجھانے کے لئے
ٹھوس دلائل دیتے ہیں تاکہ قاری کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو وہ ہر
مسئلے پر ایک خاص نظریۂ فکر سے روشنی ڈالتے ہیں ان کی زبان بہت
رواں اور دلکش ہے۔

لہ خطبات و مقالات ص ۲۰۹-۲۱۰

۳۴

حضرت شاہ بشیر الدین احمد قادری مخفیؔ

(۱۹۲۱ء — ۱۹۶۲ء)

حضرت شاہ بشیر الدین قادری مخفیؔ، حضرت شاہ غلام رسول قادریؒ کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ کی پیدائش کراچی میں ۱۹۲۱ء میں ہوئی عربی، فارسی اور مذہبی تعلیم آپ نے اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ پھر انگریزی تعلیم کے لئے سندھ مدرستہ الاسلام کراچی میں داخل ہوئے لیکن طبیعت شروع ہی سے تصوف اور فقر کی طرف مائل تھی۔ والد شاہ غلام رسولؒ اور نانا سائیں عبدالغنیؒ جیسے بزرگ کامل اور صوفی باصفا کی محبت اور تربیت نے ان کو فقر سے زیادہ قریب کردیا۔ والد سے مرید ہونے کے بعد دنیا سے بہت دل برداشتہ ہوگئے۔ باوجود علم وفضل انھوں نے نوکری کی طرف مطلق توجہ نہ کی اور عبادت وریاضت اور رشد وہدایت میں ہی منہمک رہے۔

رومی اور اقبال کے کلام کے عاشق زار تھے۔ اقبال کا یہ شعر

ان کا بہت پسندیدہ شعر تھا جو اکثر ورد زبان رہتا تھا ؎

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں — مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

اپنے دادا پیر حضرت گل حسن شاہ قلندر سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور ان کا نام بڑی عزت واحترام سے لیتے تھے۔ تصوف کا بڑا گہرا مطالعہ تھا۔ ویدانت کو تصوف میں شامل کرنے کے بالکل مخالف تھے ویدانت کے نظریات سے ان کو کلی انکار تھا۔ اسلامی تصوف کا ماخذ وہ صرف قرآن کو تسلیم کرتے تھے۔ لباس سادہ اور عام لوگوں کے جیسا پہنتے تھے ع "درویش صفت باش کلاہ تتری دار" پر کاربند تھے۔ اردو نظم ونثر لکھنے پر نہ صرف قادر تھے بلکہ بہت فصیح، رواں اور شستہ زبان استعمال کرتے تھے۔ انھوں نے کئی کتابیں لکھیں جن میں سے "اقبال کی خودی اور حافظ کی بے خودی"، "مقالات مخفی"، اور "عرفان اقبال" مطبوعہ ہیں۔ بقیہ افادات نوادر، چند جرعات رومی اور اقبال اور تصوف اور اسلام غیر مطبوعہ مسودے کی شکل میں ان کے بھائی کے پاس خانقاہ قادریہ میں محفوظ ہیں۔

آخر عمر میں اپنے وصال سے سات سال پہلے ان پر جذبی کیفیت طاری ہوگئی تھی اور وہ مکمل طور پر گوشہ گیر ہوگئے تھے۔ اس جذبی کیفیت میں انھوں نے اپنی بعض تصانیف اور مضامین کو ضائع کردیا شادی انھوں نے نہیں کی تھی۔ ہمیشہ مجرد رہے۔ ۱۹۶۲ء میں آپ کا وصال ہوا اور لیاری قبرستان میں اپنے نانا عارف باللہ حضرت

سائیں عبدالغنی کے مزار سے متصل سپردِ خاک کئے گئے۔ آپ کی نثر کا نمونہ درج ذیل ہے :-

"اقبالؒ و حافظؔ کی فکر و نظر میں کوئی تضاد نہیں معلوم ہوتا البتہ بہ ظاہر بیان، مقام اور ماحول جداگانہ ہے۔ اقبالؒ کی قومی اور ملّی زندگی نے جو احساسات پیدا کئے لازماً وہ ماحول سے وابستہ تھے۔ ایک قومی مصلح اور رہنما کی حیثیت سے اقبال کا پیغام انھیں تاثرات کا حامل ہے، لیکن اقبال علم عرفان اخلاق، روحانیت کے رموز و نکات بھی عریاں کر چکا ہے، خواجہ صاحب بھی اپنے یکتا انداز میں یہی دولت بے بہا لٹاتے ہیں۔ اگر صحیح احساس کے اظہار و تفکر کو علم و عمل کا نظام تصور کر لیا جائے تو آج بھی ارباب بصیرت اور اہل نظر حافظؔ کی بے خودی میں اقبال کی خودی کے جوہر پا سکتے ہیں۔ حضرت علّامہ کی بلند و بالا نگاہ اور بلند پرواز تخیّل اپنے اندر مشرق و مغرب کے اہل کمال کی قدر افزائی پاتا ہے اور جو غالبؔ

لہ اقبال کی خودی اور حافظ کی بے خودی "، از بشیرالدین مخفیؔ مطبوعہ ضیا پریس ص۱۷

و داغؔ، حالیؔ و بیدلؔ صائبؔ و رومیؔ، سنائیؔ و عطارؔ، خاقانیؔ، رام، نانک، گوئٹے، نٹشے، آرنلڈ وغیرہ سے یکساں انس رکھتا ہے کیا وہ ایران کے روحانی عارف اور بے مثال شاعر، خواجہ حافظ شیرازی سے کچھ بھی انس نہیں رکھتا۔"

۱۵

ابوالمشتاق الحاج مرزا محمد افضل بیگ

سنہ پیدائش (۱۹۱۸ء)

مرزا محمد افضل بیگ کے والد ماجد شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ اپنے علم و فضل کی وجہ سے سندھ میں اپنا ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کی ادبی اور علمی خدمات کو سندھ کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

مرزا محمد افضل بیگ کی پیدائش اسی علمی و ادبی ماحول میں بہ مقام قلیچ آباد (ٹنڈو ٹھورو) ۲۴ شعبان المعظم ۱۳۳۵ھ مطابق ۲۵ مئی ۱۹۱۸ء کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم قادر بخش سومرو سے حاصل کی۔ قرآن شریف مرزا عبدالسبحان بیگ سے اور دینیات اپنے والد مرزا قلیچ بیگ سے پڑھی۔ دو بار حج خانہ کعبہ سے مشرف ہوئے۔ اپنے خاندانی مسلک کے برخلاف آپ کا تعلق اہل سنت والجماعت سے ہے۔ آپ کے والد ماجد اور بقیہ تمام اہل خاندان شیعہ مسلک کے پیرو تھے اور ہیں۔

مرزا افضل بیگ کے دادا فریدون بیگ گرجی ایران سے ۱۸۰۵ء میں میران تالپور کے عہد حکومت میں حیدرآباد سندھ تشریف لائے تھے۔ تالپور خاندان کے زوال کے بعد مرزا فریدون بیگ "ٹنڈو سائیں داد" چلے گئے۔ آتش زدگی کے ایک حادثے کے بعد ان کا خاندان "ٹنڈو سائیں داد" سے میر محمود منتقل ہو گیا اور پھر وہاں سے "ٹنڈو ٹھورو" میں مستقلاً سکونت پذیر ہو گئے۔ جہاں آج تک ان کا خاندان آباد ہے۔ مرزا فریدون بیگ کا انتقال ۱۸۷۱ء میں ہوا تھا۔

سن شعور کو پہنچنے کے بعد آپ کی طبیعت تصوف اور روحانیت کی طرف مائل ہوئی چنانچہ آپ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جملہ علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل ان سے فرما کر ان ہی کے دست حق پرست پر بیعت بھی حاصل کی۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے کچھ عرصے اپنے ساتھ رکھ کر ان کی تربیت فرمائی اور پھر اجازت اور خلافت سے نوازا۔

مرزا افضل بیگ سندھی، فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی بھی اچھی جانتے ہیں۔ گورنمنٹ ہائی اسکول حیدرآباد سے آپ نے میٹرک کی سند بھی حاصل کی تھی، لیکن مرید ہونے کے بعد آپ کی زندگی کا مقصد تبلیغ دین، رشد و ہدایت اور اشاعت تعلیم ہے اور آپ برابر اس میں منہمک رہتے ہیں۔ اس وقت آپ کی سرپرستی میں تین مدارس چل رہے ہیں۔ ایک تو مکتب مسجد جامع محمدی ریلوے

پھاٹک حیدر آباد میں واقع ہے۔ دوسرا مدرسہ قاسمیہ گھانگرو کا گوٹھ حیدر آباد اور تیسرا گوٹھ حاجی مانک بھٹی ہائی اسکول ہے۔ یہ سب مدارس بہت خوش اسلوبی اور کامیابی سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

آپ ایک اچھے خطیب بھی ہیں اور مسجد محمدی اہل سنت والجماعت میں برابر آپ اپنے خطبات سے عوام کو مستفیض فرماتے رہتے ہیں۔ آپ کے خطبات بہت پراثر، پرمغز، اور دلکش ہوتے ہیں۔ آپ کی خطابت کی خاصی شہرت ہے چنانچہ آپ کے خطبات کا ایک مجموعہ جو ۱۸۶ صفحات پر مشتمل ہے، افضل الخطبات کے نام سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ آپ کے خطبات میں مغرب زدہ لوگوں کی اصلاح اور معاشرے کو گندگیوں سے پاک کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ آپ کے خطبات کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں ہر ایک مسئلے کے لئے قرآن اور حدیث سے استدلال لایا گیا ہے۔ قرآن و حدیث پر آپ کو زبردست عبور ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے افضل الخطابت پر تبصرہ کرتے ہوئے بہت صحیح لکھا ہے:-

لہ یہ مجموعہ اپنی حیثیت میں ایک دل فریب مجموعہ ہے

لہ افضل الخطبات از مرزا افضل بیگ، مطبوعہ ایجوکیشنل پریس کراچی ۱۹۶۳ء صح۔

ہر ایک مومن اس گلدستہ ایمان کو پڑھ کر ضرور محظوظ ہوگا۔ ان خطبات میں توحید خداوندی سے لے کر محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور محبت صحابہ اور اہلبیت رضوان اللہ علیہم اجمعین اور مدح اولیاء اور دین کی اصولی اور فروعی چیزوں کو بحث میں لایا گیا ہے اور ہر طرح کے ذخائر اس میں موجود ہیں۔ ہر رنگ میں رنگا ہوا آدمی ان خطبات کو پڑھ کر ظاہری اور باطنی سرور حاصل کر سکتا ہے۔"

ایک جگہ اس میں مولانا سندھی نے مرزا افضل بیگ کی خاندانی وجاہت اور ان کے والد کی علمی خدمات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور افضل الخطبات کو ان کے خاندانی روایات کے مطابق بتایا ہے۔ لکھتے ہیں:

"جناب مرزا افضل بیگ صاحب کے والد ماجد مرحوم نے جو علمی اور ادبی خدمات کی ہیں، وہ اظہر من الشمس ہیں۔ گورنمنٹ کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہتے ہوئے سرزمین سندھ کے پس افتادہ مسلمانوں کی جو رہبری کی ہے اس سے ہر ایک باشعور انسان واقف ہے جناب مرزا محمد افضل بیگ صاحب بھی خاندانی روایات پر چلتے ہوئے، قوم کی خدمت کا جذبہ دل میں رکھتے ہوئے مغربیت سے مرعوب قوم کی اصلاح کے لئے یہ خطبات پیش کر رہے ہیں۔"

لہ افضل الخطبات۔ صب۔

مرزا افضل بیگ اردو نثر اور نظم، دونوں لکھنے پر قادر ہیں۔ جہاں ان کی اردو تحریریں سلیس اور رواں ہوتی ہیں وہاں ان کی شاعری میں بھی خاصا زور ہوتا ہے اپنے خطبات میں وہ اکثر موقعوں پر اپنے اشعار بھی پیش کرتے ہیں، جو زیادہ تر عربی عبارتوں کے ترجمے ہوتے ہیں۔ نمونتہً دو چار اشعار درج ذیل ہیں:

تعریف خلاق جہاں اور مالک کون و مکاں[1] | اک شمّہ ہو کس سے بیاں بیشک وہ عالی شان ہے
اور نعت شاہ اصفیا بدر الدجیٰ شمس الضحیٰ | کیا ہو سکے ہم سے ادا جس طرح سے شایان ہے
نیکی کسی سے جب کرو منظور رحمت حق کی ہو | منت نہ تم اس پہ دھرو ورنہ بہت خسران ہے
عاصی ہیں سب العلا تو بخش دے ساری خطا | بہر نبی مصطفےٰ جو شافع عصیان ہے

مرزا افضل بیگ کی اردو نثر صاف، رواں اور شگفتہ ہونے کے ساتھ ہر طرح کے موضوعات کو پیش کرنے کی اہل ہے اور یہ ایک بڑی خوبی ہے۔ نمونہ نثر کے طور پر ان کے افضل الخطبات سے کچھ اقتباس درج ذیل ہے:-

"واضح ہو[2] کہ نماز جمعہ سے پہلے خطبہ پڑھنے کا رواج نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آج تک بدستور چلا آ رہا ہے۔ سبحان اللہ خطبہ جمعہ کی کیا شان و عظمت ہے اور اس کو غور سے سننے کے لئے یہاں تک تاکید آئی ہے کہ جس وقت خطبہ پڑھا جائے اس وقت بات کرنا بھی لغو

۱؎ افضل الخطبات از مرزا افضل بیگ مطبوعہ ایجوکیشنل پریس کراچی ۱۹۶۴ء صفحہ ۱۰۲-۱۰۳
۲؎ " " " " " " صفحہ ۳-۴

ہے۔ یہاں تک کہ نماز و تلاوت قرآن مجید ناجائز ہے۔ جبکہ آیت کریمہ ان اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی پڑھی جائے یا حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی اسم گرامی سے تو درود شریف بھی دل میں پڑھے۔

اگر کسی نے سنت یا نفل نماز شروع کی اور سجدہ کرنے سے پہلے خطیب نے خطبہ شروع کیا تو نماز توڑ کر خطبہ سننے بیٹھ جائے۔ یہ تاکید اس لئے ہے کہ احکام خدائے تعالیٰ جل شانہ کو صدق دل سے سنے اور احادیث خیر الوریٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور نصائح رشد و ہدایت کو غور سے سمجھ کر اس پر عمل کرے۔"

مرزا افضل بیگ ایک درویش صفت، صوفی منش اور خدا ترس انسان ہیں۔ آپ کا خاندان سندھ میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

تمت

کتابیات

شمار	نام کتب	مصنف	مطبوعہ یا قلمی	زبان	کیفیت مطبع یا ناشر
۱	تحفۃ الکرام	میر علی شیر قانع ٹھٹھوی	مطبوعہ	فارسی	
۲	مقالات الشعراء	"	"	"	
۳	تکملہ مقالات الشعراء	مخدوم ابراہیم خلیل ٹھٹھوی	"	"	سندھی ادبی بورڈ
۴	برہانپور کے سندھی اولیاء	سید مطیع اللہ راشد برہانپوری	"	اردو	
۵	تذکرہ صوفیائے سندھ	مولانا اعجاز الحق قدوسی	"	"	
۶	بزم صوفیاء	سید صباح الدین	"	"	
۷	تاریخ سلسلہ فردوسیہ	محمد معین الدین دردائی	"	"	
۸	صوفیائے بہار اور اردو	"	"	"	ایجوکیشنل کانفرنس کراچی
۹	لسانی مطالعے	"	"	"	مجلس دانشوران لاہور
۱۰	بہار اور اردو شاعری	"	"	"	
۱۱	تحقیقی مقالے	"	"	"	
۱۲	اسرار الاولیاء	(مترجم) "	"	"	نفیس اکیڈمی
۱۳	سیر الاقطاب	"	"	"	نفیس اکیڈمی
۱۴	سیرت احمد شہید	مولانا غلام رسول مہر	"	"	
۱۵	تاریخ مشائخ چشت	پروفیسر خلیق نظامی	مطبوعہ	اردو	
۱۶	ذخیرۃ الخوانین	شیخ فرید بکھری	"	فارسی	
۱۷	دلیل الذاکرین	حاجی پہنور	قلمی	"	مملوکہ سندھی ادبی بورڈ
۱۸	حدیقۃ الاولیاء	سید عبدالقادر	"	"	"
۱۹	داستان تاریخ اردو	حامد حسن قادری	مطبوعہ	اردو	اردو اکیڈمی
۲۰	سندھ میں اردو شاعری	ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ	"	"	
۲۱	سندھ کے جدید اردو شعراء	نجم الدین جعفری	"	"	
۲۲	ہندوستانی لسانیات کا خاکہ	مترجمہ سید احتشام حسین	"	"	
۲۳	پنجاب میں اردو	پروفیسر محمود شیرانی	"	"	
۲۴	دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	"	"	
۲۵	یورپ میں دکنی مخطوطات	"	"	"	
۲۶	نقوش سلیمانی	علامہ سید سلیمان ندوی	"	"	مکتبہ مشرق آرام باغ کراچی ۱۹۵۸ء
۲۷	اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ	ڈاکٹر عبدالحق	"	"	
۲۸	ہندوستانی لسانیات	ڈاکٹر محی الدین زور	"	"	
۲۹	اردو شہ پارے	"	"	"	
۳۰	اردوئے قدیم	حکیم شمس اللہ قادری	"	"	
۳۱	مقدمہ تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	"	"	
۳۲	جلوۂ خضر	صفیر بلگرامی	"	"	

نمبر	نام کتاب	مصنف		زبان	
۳۳	عرب و ہند کے تعلقات	علامہ سید سلیمان ندوی	مطبوعہ	اردو	
۳۴	اردو زبان کا ارتقا	ڈاکٹر شوکت سبزواری	″	″	
۳۵	مناقب الاصفیاء	مخدوم شاہ شعیب فردوسی	قلمی	فارسی	
۳۶	مونس القلوب	مخدوم حضرت احمد لنگر دریا	″	″	
۳۷	معدن المعانی	ملفوظات مخدوم شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری	″	″	
۳۸	خزینۃ الاصفیاء	مفتی غلام سرور لاہوری	مطبوعہ	اردو	
۳۹	تذکرہ علمائے ہند	مولوی رحمان علی صاحب	″	″	
۴۰	اردو و سندھی کے لسانی روابط	ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی	″	″	مرکزی اردو بورڈ لاہور سنہ ۱۹۷۰ء
۴۱	سندھی بولی جی مختصر تاریخ	بھیرومل	″	سندھی	
۴۲	تاریخ فیروز شاہی	سراج الدین عفیف	″	فارسی	
۴۳	دیوانِ عطا	شاہ عطا	″	اردو و سندھی	سندھی ادبی بورڈ
۴۴	شاہ عبداللطیف بھٹائی	ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سارلے	″	انگریزی	
۴۵	عکس لطیف	تاج محمد آغا	″	اردو	
۴۶	شرح لطیفی	محمد بخش واصف	″	″	
۴۷	شاہ عبداللطیف کی زندگی مذہب اور شاعری	دیوان لیلارام سنگھ	″	انگریزی	
۴۸	سندھ کے متعلق کچھ ذکر	دیارام گدومل	″	″	
۴۹	تحفۂ علمی	محمد علم الدین علمی	″	اردو	

نمبر	نام کتاب	مصنف		زبان	
۵۰	ارشادات شاہ غلام رسول	سید عبد الرسول	مطبوعہ	اردو	
۵۱	عین الاصابتہ فی تحقیق تکرار الجماعت	پیر سید رشد اللہ شاہ	قلمی	″	ذاتی کتب خانہ پیر جھنڈو
۵۲	الفارقۃ بین اہل اللہ و بین المارقۃ	″	″	″	″
۵۳	ابلاغ الحقیق بالتحقیق العمیق	پیر سید فضل شاہ	″	″	″
۵۴	المقالۃ المحبوبۃ فی الدعا بعد الصلوٰۃ المکتوبۃ	″	″	″	″
۵۵	خطبۂ صدارت	پیر سید محب اللہ شاہ	″	″	″
۵۶	الدلیل التام علی ان سنۃ المصلی الوضع کما تام	پیر سید بدیع الدین شاہ	″	″	″
۵۷	تنقید السدید بر رسالہ اجتہاد و تقلید	″	″	″	″
۵۸	نشاط العبد	″	″	″	″
۵۹	بدیع التفادی	″	″	″	″
۶۰	سندھ کے جدید اردو مصنفین	عبدالرشید خان تبسم	″	″	شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی
۶۱	مرزا غازی بیگ ترخان	پیر حسام الدین راشدی	مطبوعہ	اردو	انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۷۰ء
۶۲	مجموعہ فتاویٰ قاسمیہ	مولانا محمد قاسم صاحب	قلمی	″	مدرسہ ہاشمیہ گڑھی یٰسین
۶۳	مجموعہ فتاویٰ ناظمی	مولانا محمد ابراہیم صاحب	″	″	″
۶۴	سفرنامہ ایران	پیر اسحاق جان سرہندی	مطبوعہ	″	سندھ یونیورسٹی پریس سنہ ۱۹۶۰ء
۶۵	تعمل خیار کہ حوز اور ان کی حکمتیں	مصنف شاہ ولی اللہ ترجمہ غلام مصطفےٰ قاسمی	″	″	ولی اللہ اکیڈمی
۶۶	حیات صبغتہ اللہ شاہ	مترجمہ حکیم ذوقی	″	″	کراچی سنہ ۷۱ء

۶۷	مینائے مصطفائی	پیر مصطفےٰ صبغۃ اللہ شاہ	مطبوعہ	اردو	حیدرآباد ۱۹۶۰ء
۶۸	کابل میں سات سال	مولانا عبید اللہ سندھی	〃	〃	سندھ ساگر اکیڈمی ۱۹۵۵ء
۶۹	الفام المحمود	〃	〃	〃	سندھ یونیورسٹی پریس ۱۹۵۹ء
۷۰	خطبات ومقالات	〃	〃	〃	سندھ ساگر اکیڈمی لاہور
۷۱	اقبال کی خودی اور حافظ کی بے خودی	بشیر الدین مخفی	〃	〃	ضیا پریس
۷۲	افضل الخطبات	مرزا افضل بیگ	〃	〃	ایجوکیشنل پریس کراچی ۱۹۶۴ء

رسائل

۷۳۔ اردوئے معلی دہلی، لسانیات نمبر

۷۴۔ اسلامیہ کالج میگزین سکھر بابت ۶۴-۱۹۶۳ء

۷۵۔ رسالہ سچل سرمست خیرپور ۱۹۷۰ء

۷۶۔ الاعتصام، اکتوبر ۱۹۷۰ء

۷۷۔ اخبار جہاں کراچی ۱۲ر فروری ۱۹۶۸ء

۷۸۔ رسالہ الرحیم، حیدرآباد، ولی اللہ اکیڈمی (پورا فائل)

مطبوعات

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس[1]

۱۔ گلشنِ بے خار۔ مصنفہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ ۱۲ روپے

۲۔ رومن رسم الخط اور پاکستان۔ مصنفہ مولانا سید عبد القدوس ہاشمی ندوی۔ ۵ پیسے

۳۔ قدیم شہنشاہیاں۔ مصنفہ مولانا طفیل احمد منگلوری (علیگ) ۳ روپے

۴۔ نقدِ ادب۔ مترجمہ ل۔ احمد اکبر آبادی ۲ روپے

۵۔ سرسید کا علمی کارنامہ۔ مصنفہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی ۱ روپے

۶۔ اردو زبان اور اسالیب۔ مصنفہ سید محمد محمود رضوی مخمور اکبرآبادی ۹ روپے

۷۔ مشرقی اور مغربی تہذیب۔ مصنفہ ڈاکٹر احسان محمد خاں ۳ روپے

۸۔ راہی اور راہ نما۔ مصنفہ سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۶ روپے

۹۔ ثقافت و انتشار۔ مترجمہ۔ انعام عظیم برنی ایم اے (علیگ) ۶ روپے

۱۰۔ طالب علم کی ڈائری۔ مصنفہ سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۳ روپے

۱۱۔ مسلم خواتین کی تعلیم۔ مصنفہ محمد امین زبیری ۲ روپے

۱۲۔ نواب خان بہادر خاں شہید۔ مصنفہ سید مصطفےٰ علی بریلوی بی کام ایل ایل بی ۳ روپے

---

[1] نمبر ۱ تا ۷ نظامت تعلیمات (ڈائرکٹریٹ آف ایجوکیشن) کراچی سے منظور شدہ کتابیں ہیں۔

١٣. عہد بنگش کی علمی سیاسی اور ثقافتی تاریخ ۔ مصنفہ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی
مترجمہ حکیم شریف الزماں شریفؔ اکبر آبادی ١٢ روپے

١٤. اصولِ تدریس ۔ مترجمہ اخلاص حسین زبیری ایم اے ٥ روپے

١٥. ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں ۔ مصنفہ سید سلیمان ندوی ٢ روپے ٥٠ پیسے

١٦. مشاہیر کے تعلیمی نظریے ۔ مصنفہ محمد حسین خاں زبیری ایم اے ٤ روپے

١٧. پُراسرار کائنات ۔ مترجمہ سید محمد تقی ایڈیٹر "جنگ" ٦ روپے

١٨. مفکرینِ تعلیم ۔ مصنفہ پروفیسر ضیاء الدین احمد ٧ روپے

١٩. اصول و اساسِ تعلیم ۔ مترجمہ انعام عظیم برنی ایم اے
اخلاص حسین زبیری ایم اے وغیرہ ٧ روپے

٢٠. تعلیمی نفسیات کا بنیادی خاکہ ۔ مصنفہ پروفیسر وحید الحق صدیقی
سابق پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ٤ روپے

٢١. عظیم علمائے نفسیات ۔ مترجمہ پروفیسر عبدالمجید قریشی ١٢ روپے

٢٢. مادری زبان کی تعلیم ۔ مصنفہ پروفیسر یونس حسن فروغ علوی ٣ روپے

حوالجات منظوری

2. +1. NO. D.I.G.S./A(12164)/67 DATED 26.5.1967.

+2. NO. D.E/F-PUB/(126)/(7820-8170)/69

DATED 20.5.1969.

+3. NO. D.E/F-PUB/(11-A)(1308)-1630)/72

DATED 8.1.1972

٢٣. جان ڈیوی کا فلسفۂ تعلیم ۔ مصنفہ سید عین الدین علوی ٢ روپے ٥٠ پیسے

٢٤. تعلیمی مسائل ۔ مصنفہ سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ٨ روپے

٢٥. مقاصدِ تعلیم ۔ مترجمہ سید محمد تقی ایڈیٹر "جنگ" ٦ روپے

٢٦. ارتقائے انسانی (موجودہ سائنس کی روشنی میں)
مصنفہ سید طفیل احمد منگلوری (علیگ) ٢ روپے

٢٧. چند عظیم علمائے جراثیم ۔ مترجمہ پروفیسر عبدالمجید قریشی ١٠ روپے

٢٨. مسلمانوں کا نظامِ تعلیم ۔ مصنفہ پروفیسر سید احمد رفیق ٣ روپے

٢٩. خط و خطاطی ۔ مصنفہ شیخ ممتاز حسین جونپوری ١ روپے ٥٠ پیسے

٣٠. جمہوریت اور تعلیم جلد اول مترجمہ سید محمد تقی ایڈیٹر "جنگ" ١٠ روپے

٣١. جمہوریت اور تعلیم جلد دوم ۔ مترجمہ سید محمد تقی ایڈیٹر "جنگ" ٥ روپے

٣٢. انگریزوں کی لسانی پالیسی ۔ مصنفہ سید مصطفےٰ علی بریلوی بی کام ایل ایل بی ٨ روپے

٣٣. بچہ کا ذہنی و نفسیاتی ارتقاء ۔ مرتبہ اخلاص حسین زبیری ایم اے و
پروفیسر وحید الحق صدیقی ٧ روپے

٣٤. تعلیم و تربیت ۔ مصنفہ ضیاء الدین احمد برنی ٥ روپے

٣٥. سائنس کے کرشمے ۔ مصنفہ مسرور احمد توقیر ایم اے ٥ روپے

٣٦. علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں مرتبہ سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) و
پروفیسر محمد ایوب قادری ایم اے ١٢ روپے

٣٧. اَن کہی کہانیاں ۔ مصنفہ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی ٢ روپے

٣٨. مسلمانانِ کراچی و سندھ کی تعلیم ۔ تالیف سید مصطفےٰ علی بریلوی بی کام ایل ایل بی
مقدمہ مرزا علی اظہر برلاس بی اے بی ایل ٥ روپے

۳۹۔ تعلیم و تعلم۔ مرتبہ سید الطاف علی بریلوی
مقدمہ۔ سید عبد القدوس ہاشمی ندوی ۷ روپے

۴۰۔ تعلیم بالغان اور اس کی اہمیت۔ تصنیف مولوی مظہر الرحمن بچھرایونی
مقدمہ پروفیسر محمود حسین پی ایچ ڈی ۳ روپے

۴۱۔ تعلیم کے ابتدائی اصول (حصہ اول و دوم) تصنیف :۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ
مترجمہ۔ مولوی سبطین احمد بدایونی ۱۰ روپے

۴۲۔ پاک و ہند میں تعلیمی ترقی۔ مترجمہ۔ سید احسن مارہروی ایم اے ۵ روپے

۴۳۔ اقبال کے تعلیمی نظریات۔ تصنیف۔ محمد احمد صدیقی بی اے (آنرس) ایم اے بی ٹی (علیگ)
تعارف و مقدمہ :۔ سید الطاف علی بریلوی و اخلاص حسین زبیری ایم اے ۸ روپے

۴۴۔ ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن (بزبان انگریزی) (جلد اول ۷۱۲ء تا ۱۷۵۰ء)
تصنیف :۔ پروفیسر محمد حامد الدین خاں ایم اے ۱۲ روپے

۴۵۔ رفقائے عظیم (گریٹ کمپنینس) تصنیف :۔ میکس ایسٹ مین
مترجمہ :۔ پروفیسر محمد حامد الدین خاں ایم اے (علیگ) ۱۰ روپے

۴۶۔ حیات مابعد۔ تصنیف۔ سید ضامن حسین نقوی گویا جہاں آبادی
مقدمہ :۔ ڈاکٹر ایم ایم احمد چیرمین شعبۂ فلاسفی کراچی یونیورسٹی ۳ روپے ۵۰ پیسے

۴۷۔ تجدد امثال۔ تصنیف :۔ سید ضامن حسین گویا جہاں آبادی
مقدمہ :۔ ڈاکٹر ایم ایم احمد ایم اے پی ایچ ڈی ۲ روپے

۴۸۔ مقدر انسانی (ہیومن ڈسٹنی) تصنیف لیکامٹ دو نوائے
مترجمہ پروفیسر عبد المجید قریشی (علیگ) ۸ روپے

۴۹۔ یادیں اور خاکے۔ تصنیف سیدہ انیس فاطمہ بریلوی
مقدمہ :۔ پروفیسر ڈاکٹر شوکت سبزواری ایم اے پی ایچ ڈی ۳ روپے

۵۰۔ تاثرات و مشاہدات۔ تصنیف :۔ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی
پیش لفظ :۔ انعام عظیم برنی ایم اے ۳ روپے

۵۱۔ پاکستان کا معاشی پس منظر۔ تصنیف :۔ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی
پیش لفظ :۔ ڈاکٹر سید ظہیر الدین ایم اے ڈی لٹ ۳ روپے ۵۰ پیسے

۵۲۔ تجزیۂ کلام غالب۔ مصنف :۔ سید رفیع الدین بلخی ایڈوکیٹ
مقدمہ :۔ سید علی حسین زیبا ردولوی ایم اے ۶ روپے

۵۳۔ ادب منزل بمنزل۔ مصنفہ :۔ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی۔
مقدمہ :۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ایم اے پی ایچ ڈی ۶ روپے

۵۴۔ مکاشفات کشفی۔ مصنف۔ میجر خان بہادر مرزا ابو جعفر کشفی
پیش لفظ :۔ خان بہادر رضا علی وحشت
تعارف و تبصرہ :۔ سید الطاف علی بریلوی و پروفیسر جمیل مظہری ایم اے ۳ روپے

۵۵۔ حاصل مطالعہ۔ تصنیف :۔ سید الطاف علی بریلوی۔ بی اے (علیگ)
مقدمہ :۔ پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ ۸ روپے

۵۶۔ انشائیے۔ تصنیف :۔ فضل احمد صدیقی ایم اے
مقدمہ :۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی
تعارف سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۵ روپے

۵۷۔ غالب نمبر (العلم) مرتبہ :۔ سید الطاف علی بریلوی ۱۰ روپے

۵۸۔ علمائے سلف و نابینا علماء۔ تصنیف: نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی

تعلیقات و حواشی: مفتی انتظام اللہ شہابی و ثناء الحق صدیقی ایم اے

تعارف: علامہ سید سلیمان ندوی ۹ روپے

۵۹۔ حیاتِ حافظ رحمت خاں۔ تالیف: سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ)

مقدمہ: مولوی نظام الدین حسین نظامی بدایونی ۱۰ روپے

۶۰۔ لائف آف حافظ رحمت خاں (انگریزی ترجمہ)

تالیف: سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ)

مترجمہ: پروفیسر محمدؐ حامی الدین خاں ایم اے ۲۰ روپے

۶۱۔ علم و عمل، (وقائع عبدالقادر خانی) جلد اول و دوم

مؤلف: مولوی عبدالقادر برلاس۔

ترجمہ: مولوی معین الدین افضل گڑھی

ترتیب و حواشی: پروفیسر محمدؐ ایوب قادری

تعارف: نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی ۱۶ روپے

۶۲۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات۔ تعارف: سید الطاف علی بریلوی

مؤلف: مولانا اعجاز الحق قدوسی

تعارف: ڈاکٹر اینی میری شمیل پروفیسر بون یونیورسٹی (مغربی جرمنی)

پیش لفظ: جمیل جالبی ایم اے۔ ناشر: سید الطاف علی بریلوی ۱۰ روپے

۶۳۔ عہد اسلامی میں علمی ترقی۔ تعارف: سید الطاف علی بریلوی۔

مصنف ڈاکٹر این این لا۔ مترجمہ: اخلاص حسین زبیری و سلطان فاطمہ نجمی ایم اے ۸ روپے

۶۴۔ حکیم عمر خیام۔ تالیف: ابو المکارم سلیم اللہ فہمی

مقدمہ: سید الطاف علی بریلوی ۲ روپے ۵۰ پیسے

۶۵۔ چند محسن چند دوست۔ مقدمہ: ڈاکٹر ممتاز حسن ایم اے ایل ایل ڈی

تصنیف: سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۵ روپے

۶۶۔ صوفیائے بہار اور اُردو۔ مصنفہ پروفیسر محمدؐ معین الدین دردائی ایم اے ۸ روپے

۶۷۔ تعلیماتِ حضرت شاہ مینا رحؒ (تلخیص و ترجمہ فوائدِ سعدیہ)

مقدمہ: مفتی محمدؐ انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی ۳ روپے

۶۸۔ وادیٔ نیل۔ تصنیف: محمدؐ قطب الدین ایم ایس سی عثمانیہ۔

مقدمہ: پروفیسر شمیم اختر (کراچی یونیورسٹی) ۱۵ روپے

۶۹۔ تاریخی شہ پارے۔ از مرزا علی اظہر برلاس بی اے۔ بی ایل ۱۲ روپے

۷۰۔ مسلمانانِ بنگال کی تعلیم۔ از سید مصطفےٰ علی بریلوی بی کام۔ ایل ایل بی ۱۲ روپے

۷۱۔ فرحت الناظرین۔ مصنف: محمدؐ اسلم خلف محمدؐ حافظ پسروری

مترجمہ: پروفیسر محمدؐ ایوب قادری ایم اے ۸ روپے

۷۲۔ مقالاتِ بریلوی۔ از سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۱۰ روپے

۷۳۔ مشاہیر کے تعلیمی نظریے۔ (انگریزی ترجمہ)

تالیف: مولوی محمدؐ حسین خاں زبیری ایم اے

مترجمہ عظیم الدین خاں ایم اے (علیگ) اخلاص حسین زبیری ایم اے

پیش لفظ: سید الطاف علی بریلوی ۸ روپے

۶۴۔ حکیم عمر خیام۔ تالیف :۔ ابو المکارم سلیم اللہ ہمی

مقدمہ :۔ سید الطاف علی بریلوی ۲ روپے ۵۰ پیسے

۶۵۔ چند محسن چند دوست۔ مقدمہ :۔ ڈاکٹر ممتاز حسن ایم اے ایل ایل ڈی

تصنیف :۔ سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۵ روپے

۶۶۔ صوفیائے بہار اور اردو۔ مصنفہ پروفیسر محمد معین الدین دردائی ایم اے ۸ روپے

۶۷۔ تعلیمات حضرت شاہ مینا (تلخیص و ترجمہ فوائد سعدیہ)

مقدمہ :۔ مفتی محمد انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی ۳ روپے

۶۸۔ وادیٔ نیل۔ تصنیف :۔ محمد قطب الدین ایم ایس سی عثمانیہ۔

مقدمہ :۔ پروفیسر شمیم اختر (کراچی یونیورسٹی) ۱۵ روپے

۶۹۔ تاریخی شہ پارے۔ از مرزا علی اظہر برلاس بی اے۔ بی ایل ۱۲ روپے

۷۰۔ مسلمانانِ بنگال کی تعلیم۔ از سید مصطفےٰ علی بریلوی بی کام۔ ایل ایل بی ۱۲ روپے

۷۱۔ فرحت الناظرین۔ مصنفہ :۔ محمد اسلم خلف محمد حافظ پسروری

مترجمہ :۔ پروفیسر محمد ایوب قادری ایم اے ۸ روپے

۷۲۔ مقالاتِ بریلوی۔ از سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۱۰ روپے

۷۳۔ مشاہیر کے تعلیمی نظریے۔ (انگریزی ترجمہ)

تالیف :۔ مولوی محمد حسین خاں زبیری ایم اے

مترجمہ عظیم الدین خاں ایم اے (علیگ) اخلاص حسین زبیری ایم اے

پیش لفظ :۔ سید الطاف علی بریلوی ۸ روپے

۷۴۔ ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں۔ (انگریزی ترجمہ)

تالیف :۔ علامہ سید سلیمان ندوی

مترجمہ :۔ ڈاکٹر زبید احمد ایم اے پی ایچ ڈی ۷ روپے

و مرزا عاشق حسین ایم اے

مطابع

ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس کراچی